UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222893
UNIVERSAL
LIBRARY

The Drinched Book

text fiy book

Osmania University Library

Call No ۸۹۱٫۴۳۹ پ
زمانہ

Accession No 12546.

Author

Title زمانہ پریم چند نمبر

This book should be returned on or before the date last marked below.

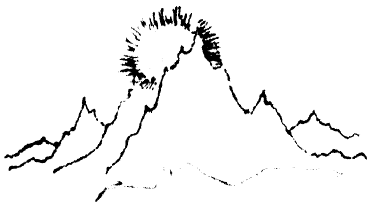

زمانہ

پریم چند نمبر

موسوم بہ

یادگار پریم چند

مُرتبہٗ

دیا نراین نگم بی۔ اے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

حافظؒ

"پریم چند کی قابلیت اور اَدبی خدمات بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اُن کے چلے جانے سے ہم کو نقصان عظیم ہوا ہے۔"

رابندر ناتھ ٹیگور

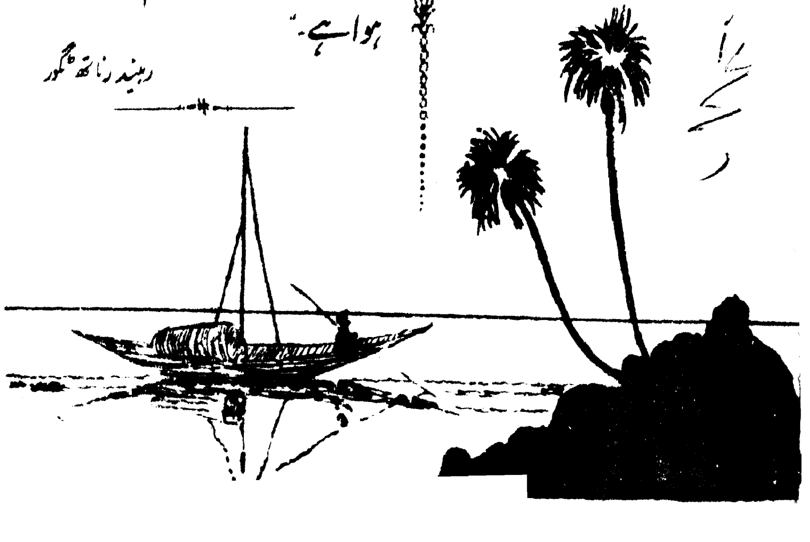

تین نایاب کتابیں

(۱) خیالات عزیز

یعنی مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے۔ ایم آر اے ایس۔ مرحوم کے علمی۔ ادبی۔ تاریخی اور ملکی۔ مضامین کا مجموعہ جس کی باضابطہ رجسٹری کرائی گئی ہے

قیمت دو روپیہ ۲/

(۲) نیرنگ سحر

یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ۔ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ دوسرا ایڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے۔

قیمت آٹھ آنے ۸/

(۳) روٹھی رانی

مصنفہ منشی پریم چند

ہندوستان کی کسی رانی نے حسن و جمال کے لئے کسی نے بہادری اور کسی نے اپنی عصمت کے لئے شہرت حاصل کی۔ روٹھی رانی کی شہرت ان سب سے عجیب و غریب ہے۔

قیمت چھ آنے ۶/

ملنے کا پتہ

دفتر "زمانہ" کانپور

شباب کی سی صحت پھر عود کر آئے گی

جب ڈاکٹر صاحب آپ کو سناٹوجن استعمال کا مشورہ دیتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ سناٹوجن استعمال سے آپکی تجدید ہو جائے گی اور بیماری کی داستان پارینہ بن جائے گی۔

سناٹوجن بہت جلد ہر قسم کی کمزوریوں پر غالب آجاتی ہے اور اس کے بجائے جسم کے اندر ایک فرحت بخش اثر پیدا کر دیتی ہے۔

ہزاروں آدمی سناٹوجن استعمال کر رہے ہیں آپ بھی ان کے نقش قدم پر چلیے اور ان تمام تکلیفوں اور شکایتوں کو دور کیجئے جو خون کے خلیات خالی ہو جانے اور اعصاب اور پٹھوں تھک جانے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

سناٹوجن آپ کے پٹھوں اور آپ کی رگوں کو نئی زندگی۔ مواد سے معمور کر دیتی ہے اور اس کے چند روزہ استعمال سے ہی آپ محسوس کرینگے کہ آپ کے جسم میں شباب کی سی طاقت اور جوانی کی امنگیں دوڑ رہی ہیں

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام دوا فروشوں اور بازاروں سے مل سکتی ہے
تیاری میں کسی وقت بھی ہاتھ نہیں لگایا جاتا

زمانہ

کا

یہ خاص نمبر

پریم چندجی کے تیس سال کے مسلسل قلمی احسانات کے شکرانے

اور

اُس لازوال محبت و برادرانہ رفاقت کی یادگار میں شائع کیا جاتا ہے

جو

اُنھیں "زمانہ" اور اُس کے ایڈیٹر کے ساتھ تھی،

آج وہ اِس عالمِ آب وگل میں نہیں ہیں، لیکن اُن کی بے لوث زندگی اور پُرخلوص و بے ریا محبّت کی یاد آخردم تک احباب کے سکونِ خاطر و تسکینِ قلب کا باعث رہے گی۔ اگرچہ موت نے اُن کو ہم سے ناوقت چھین لیا مگر اُن کا نام اَمر اور اُن کا کام اَمِٹ ہے، اُن کے خیالات و جذبات ملکی ادب کا مستقل جزو ہو گئے ہیں، اور جب تک ہندوستانی زبان کے نام لیوا باقی ہیں اُن کا نام بھی نیکی سے یاد کیا جائے گا۔ سچ ہے:-

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

۲۴ "زمانہ" اور پریم چند — ایڈیٹر ... ۱۱۷

حصۂ دوم :- پریم چند کی افسانہ نگاری

۲۵ پریم چند کی افسانہ نگاری — خود نوشت حالات منشی پریم چند ... ۱۲۱
۲۶ پریم چند بہ حیثیت افسانہ نگار — مولانا عبدالماجد دریا بادی، بی۔اے۔ ایڈیٹر صدق ... ۱۲۳
۲۷ پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر — مسٹر ایچ۔ ایل۔ گاندھی، بی۔اے ... ۱۳۴
۲۸ پریم چند اور دیہات — مسٹر اوپندر ناتھ اشک بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ... ۱۳۷
۲۹ مل مزدور فلم کیسے بنی؟ — شریمتی للت کمار ... ۱۴۸
۳۰ پریم چند کی زندگی اور تصانیف پر ایک نظر — سید علی جواد زیدپوری ... ۱۵۰
۳۱ پریم چند کے ناول — مسٹر طالب الہ آبادی ایم۔اے ... ۱۷۸
۳۲ پریم چند کا اُپدیش — سید مقبول حسین بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ احمد پوری ۱۹۱
۳۳ میدانِ عمل (تنقید) — مسٹر مالک رام، ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ... ۲۲۴
۳۴ گئو دان (تنقید) ... ۲۳۱

حصۂ سوم :- اُردو شاعروں کا خراجِ تحسین

۳۵ افسانہ گوئے بزمِ ادب — حضرت راز چاندپوری ... ۲۳۷
۳۶ یادِ کمال — حضرت محشر لکھنوی ... ۲۳۸
۳۷ اُردو ہندی کے سنگم پر — حضرت سیماب اکبرآبادی ... ۲۳۹
۳۸ پریم چند کی یادیں — حضرت سروش ... ۲۴۰
۳۹ پریم چند اور اُن کا رتبہ — حضرت فرحت کانپوری۔ بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ... ۲۴۱
۴۰ آہ منشی پریم چند! — منشی جگناتھ پرشاد آزاد بی۔اے ... ۲۴۲
۴۱ بساطِ ماتم — عبدالسلام اختر ہوشیارپوری ... ۲۴۳
۴۲ نوحۂ وفات پریم چند — منشی جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ۲۴۴
۴۳ آہ منشی پریم چند! — مہاشہ جیمنی سرشار، خیرپوری ... ۲۴۶
۴۴ خراجِ عقیدت — رائزادہ نگیشور دیال صوفی، ایم۔اے۔ ایل۔ ایل بی ... ۲۴۷
۴۵ بادشاہ اور ادیب — حضرت احسان بن دانش کاندھلوی ... ۲۴۸
۴۶ قطعۂ تاریخ وفات پریم چند — منشی اقبال ورما سحر ہتگامی ... ۲۴۹
۴۷ تواریخ انتقال ناگہانی — پروفیسر حامد حسن قادری۔ ایم۔اے ... ۱۲ و ۲۵۰
۴۸ ضمیمہ۔ منشی پریم چند کی تصانیف ... ۲۵۲

پریم چند کا پنسل اسکیچ

۱۲۵۴۶

یادگار پریم چند

حصّۂ اوّل

پریم چند کے خود نوشت حالات

وسط ۱۹۲۶ء میں ایک دوست نے جو صوبۂ متحدہ کے اسکولوں کے لئے اُردو ادب کی درسی کتابیں تیار کر رہے تھے، راقم الحروف سے منشی پریم چند صاحب کے مختصر حالات زندگی دریافت کئے تھے۔ میں نے اس کے لئے خود پریم چند ہی کو تکلیف دی۔ چنانچہ میرے اصرار اور تقاضے پر اُنھوں نے ایک خط میں اپنے خاص خاص واقعات لکھ بھیجے تھے۔ میں نے اس کی نقل دوست موصوف کی خدمت میں بھیجدی اور اصل خط اپنے پاس رکھ لیا جو ابھی تک دفتر "زمانہ" میں محفوظ ہے۔ اِس خط کا عکس اس وقت ہدیۂ ناظرین ہے۔ خط کی پوری عبارت جس سے حالت پر روشنی پڑتی ہے ذیل میں پیش کیجاتی ہے۔

ایڈیٹر "زمانہ"

بنارس

۱۷- جولائی ۱۹۲۶ء

بھائی جان - تسلیم - کارڈ کے لئے مشکور ہوں، میرے حالات نوٹ کر لیں۔ پیدائش سمبت ۱۹۳۷ بکرمی ہے۔ باپ کا نام منشی عجائب لال سکونت موضع مڈھوا لمہی متصل پانڈے پور بنارس۔ ابتداءً آٹھ سال تک فارسی پڑھا، پھر انگریزی شروع کیا، بنارس کالجیٹ اسکول سے انٹرینس پاس کیا والد کا انتقال پندرہ سال کی عمر میں ہوگیا، والدہ بھی ساتویں سال گذر چکی تھیں، پھر تعلیم کے صیغہ میں ملازمت کی۔ ۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی، رسالہ "زمانہ" میں لکھتا رہا، کئی سال تک متفرق مضامین لکھے ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھکر انڈین پریس سے شایع کرایا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار اور ۱۹۱۸ء میں بازارِ حسن لکھا۔ ہندی میں سیوا سدن۔ پریم آشرم۔ رنگ بھوم۔ کایا کلپ چاروں ناول،

دو دو سال کے وقفہ کے بعد نکلے۔ ان کے اُردو ترجمے عنقریب شائع ہونگے۔ کہانیوں کے مجموعے پریم پچیسی، پریم بتیسی اُردو میں نکلے، ہندی میں بھی کئی مجموعے شائع ہوئے۔ سنہ ۲۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوگیا۔ جب سے خانہ نشین ہوں۔ باقی اُمور آپ کو خود ہی معلوم ہیں۔

کربلا آپ نکال رہے ہیں، بہتر، مَیں اُس کے آگے کے حصے جلد ہی بھیجدونگا۔ اُردو کی تاریخ کے ترجمہ کے متعلق کیا عرض کروں، اس میں آپ کا فیصلہ میرے فیصلے سے بہتر ہوگا۔ اگر "زمانہ" کی تقطیع کے صفحات ہیں تو دو روپیہ فی صفحہ اجرت کسی طرح زیادہ نہیں، اس سے کم میں ترجمہ کرنا میرے نقصان کا باعث ہوگا، اگر منظور فرماویں تو میرے پاس مسودہ بھجوادیں۔ ناول جاڑوں میں شروع کرونگا، برسات میں ترجمہ ختم کرڈالوں۔

اور سب خیریت ہے بارش معمولی ہے
گرمی بھی کچھ کم ہوگئی ہے۔

بچے اچھی طرح ہیں، آپ بار بار مجھے بُلاتے ہیں، ایک دفعہ بنارس کی ہوا کھائیے، میں بہت جلد آؤنگا، موقعہ ملا تو ہفتہ عشرہ میں آپ مجھے کانپور میں دیکھیں گے۔

بچوں کو دعا، خدارا کچھ نوبتن وغیرہ کا حال بھی لکھ دیا کیجیے۔ آپ کے باعث مجھے ان لوگوں کا حال چال جاننے کی بھی فکر رہا کرتی ہے۔ مثلاً بابو رام کشن کا ذکر آپ مطلق نہیں کرتے۔ سیٹھ جی کے حالات سے مجھے بھی کچھ انٹرسٹ ہے۔ یہ حضرات مجھے بھول گئے ہیں، لیکن مجھے تو اُن کی یاد آیا کرتی ہے۔

دھنپت رائے

---

۵۳ ایڈیٹر زمانہ کے چچازاد بھائی جن کا دسمبر سنہ ۳۰ء میں عین شباب میں انتقال ہوگیا۔ ۵۶ یہ ڈرامہ زمانہ میں شائع ہوچکا ہے
۵۴ مسٹر رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر بنارس جو ایڈیٹر "زمانہ" کے حقیقی بھائی ہیں۔ ۵۷ مسٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی تاریخ ادب اردو
۵۵ بابو رام بھروسے سیٹھ ڈپٹی کلکٹر پنشنر جو ایڈیٹر "زمانہ" کے پُرانے ہم سبق اور محب خاص ہیں۔

جب تک پریم چند جی کانپور میں رہے ان سب صاحبوں سے قریب قریب روزانہ ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اور وہ ایڈیٹر زمانہ کے خاص خاص احباب و اعزا کو اپنا ہی عزیز سمجھنے لگے تھے۔ درحقیقت پریم چند اور سیٹھ جی نے ایڈیٹر زمانہ کے ساتھ ہمیشہ حقیقی بھائیوں جیسی محبت کی ہے۔ ا۔ ز۔

منشی پریم چند کی کہانی اُنکی زبانی

پانچ سال ہوئے فروری ۱۹۳۲ء میں منشی پریم چند نے رسالہ "ہنس" بنارس کا ایک "آتم کتھا" نمبر شائع کیا تھا جس میں مشاہیر ادب اور بعض دیگر معززین ملک کے خود نوشت حالات زندگی درج کئے گئے تھے۔ اس نمبر میں پریم چند جی نے "جیون سار" کے عنوان سے اپنے سوانح حیات بھی لکھے تھے اسی مضمون کا ترجمہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹر

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں گڈھے تو ہیں لیکن ٹیلوں پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو انھیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم سمبت ۱۹۳۷ء میں ہوا، والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے، والدہ مریض تھیں۔ ایک بڑی بہن بھی تھی۔ اُس وقت والد شاید بیس روپیہ پاتے تھے، چالیس روپیہ تک پہونچتے پہونچتے ان کا انتقال ہوگیا۔ یوں تو وہ بڑے دُور اندیش محتاط اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے، لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے اور خود تو گرے ہی تھے اُسی دھکے میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر میں اُنھوں نے میری شادی کردی جس کے چند سال بعد ہی اُنھیں سفر آخرت کے چند درپیش ہوگیا اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ گھر میں میری بیوی سوتیلی ماں اور اُن کے دو لڑکے تھے۔ مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی، گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا، مجھے ایم۔ اے پاس کرکے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اُس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کرکے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا، مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دُھن تھی۔ مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

پاؤں میں جوتے نہ تھے، بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے، گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف

کردی تھی، امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا، جاڑے کا موسم تھا، چار بجے شام کو پہونچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا، وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا، تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہونچ سکتا۔ سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چلدیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہونچتا۔ رات کو کھانا کھاکر کپّی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

میٹریکولیشن تو کسی طرح پاس ہوگیا لیکن سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا اور کوئینس کالج میں داخلہ کی کوئی اُمید نہ رہی۔ فیس صرف اوّل درجہ میں پاس ہونے والوں کی معاف ہوسکتی تھی خوش قسمتی سے اُسی سال ہندو کالج کھُل گیا تھا۔ مَیں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے، اُن کے مکان پر گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے، اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گذارش سُنکر، ابھی مَیں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا۔ بولے کہ "گھر میں کالج کی بات نہیں سُنتا" ناچار کالج گیا، ملاقات تو ہوئی مگر نا اُمیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں، اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا۔ لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اسی ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھالاؤں لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یوں ہی گھر واپس آجاتا، شہر میں کوئی بات پوچھنے والا ابھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی، ایک صاحب ٹھاکر اندر نارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رُکن تھے۔ اُن سے جاکر رویا، اُنھیں مجھ پر رحم آگیا اور اُنھوں نے سفارشی چٹھی لکھدی، اُس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال خوش خوش گھر آیا، دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہونچتے ہی مجھے بخار آگیا اور دو ہفتہ سے پہلے نہ ٹلا۔ نیم کا کاڑھا پیتے پیتے ناک میں دم آگیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پروہت جی آگئے۔ میری حالت دیکھکر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اور اُسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا، اُس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوا نے گویا گھنٹہ بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ مَیں نے پنڈت جی سے بار بار اُس جڑی کا نام پوچھا مگر اُنھوں نے نہ بتایا، کہا نام بتا دینے سے اُس کا اثر جاتا رہے گا۔

غرض ایک مہینہ کے بعد دوبارہ مسٹر رچرڈسن سے ملا اور اُنھیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دکھلایا۔ اُنھوں نے میری طرف گھُور کر دیکھتے ہوئے پوچھا:۔

"آتنے دنوں تک کہاں تھے؟"
"بیمار ہو گیا تھا"
"کیا بیماری تھی؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا، اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں، بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لئے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی جو مجبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی اُبھار سکے۔ اُس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا، ٹھاکر اندر نارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لئے ملا تھا تو انھوں نے اپنے اختلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا، اُن کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔

میں نے کہا "پلپٹیشن آف ہارٹ سر" (Palpitation of Heart Sir)

صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا "اب تم بالکل اچھے ہو؟"

"جی ہاں"

"اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ"

میں نے سمجھا چلو بیڑا پار ہوا، فارم لیا، خانہ پُری کی اور پیش کر دیا، صاحب اُس وقت کسی کلاس کو پڑھا رہے تھے، تین بجے مجھے فارم واپس ملا، اُس پر لکھا تھا "اسکی لیاقت کی جانچ کی جائے۔"

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا، انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی اُمید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی، جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا، اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی، تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا، پروفیسر صاحب بنگالی تھے، انگریزی پڑھا رہے تھے، واشنگٹن ارونگ کا "Rip Van Winkle" کا سبق تھا، میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر اُنھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کئے اور میرے جوابات سُنکر میری عرضی پر "اطمینان بخش" کا لفظ لکھدیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا، اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے، میں نے اپنا فارم دکھایا، نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبا آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی، یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور نا قابل طلبا بھرے پڑے تھے، پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا، بھوک میں ہر بات سبھی لذیذ معلوم ہوتا ہے، مگر اب پیٹ بھر گیا تھا، طلبا، چُن چُن کر لئے جاتے تھے۔ اِن

پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہوگیا۔ فارم پر حساب کے خانہ میں "ناقابل اطمینان" لکھ دیا گیا۔

میں اتنا نا اُمید ہوا کہ فارم لیکر پھر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا، سیدھا گھر چلا آیا۔ حساب میرے لئے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔ انٹرمیڈیٹ میں کے امتحان حساب میں دو مرتبہ فیل ہوا اور نا اُمید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا معمول اختیاری ہوگیا تو میں نے دوسرے سبجکٹ لیکر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ اُس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلباء کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ خیر میں نا اُمید ہو کر گھر تو لوٹ آیا لیکن پڑھنے کی تمنّا باقی رہی، گھر بیٹھکر کیا کرتا، کسی طرح حساب پختہ کر کے پھر کالج میں داخل ہو جاؤں، یہی دُھن تھی، مگر اس کے لئے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا، پانچ روپیئے تنخواہ ٹھہری، میں نے دو روپیہ میں گُذر کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمّم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچّی کوٹھری تھی اُسی میں رہنے کی اجازت مل گئی، ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا، بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا، ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجکر لائبریری چلا جاتا، حساب تو بہانہ تھا، ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ درؔ کا "فسانۂ آزاد" اُنھیں دنوں پڑھا، چندر کانتا سنتتی بھی پڑھا۔ بنکم بابو کے اُردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔ جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا اُن کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی اُن سے پیسے اُدھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو روپیئے ہاتھ آتے، کبھی تین، جس دن تنخواہ کے دو تین روپیئے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی، للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کئے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اُسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپیے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا لیکن کبھی کبھی اُدھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اِس طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ اِسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپیے کے کپڑے

---

[1] بابو دیوکی نند کھتری کی مشہور ناول کا نام جو ۲۸ جلدوں میں ہے اور جسکا نام ہندی کی مشہور کتابوں میں ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے ہندی پڑھنے اور لکھنے کا شوق پبلک میں پھیلا۔

لئے تھے روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا، اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا، جب مہینے دو مہینے ہوگئے اور میں روپیے نہ چکا سکا تو پھر میں نے اُدھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا، چکّر دے کر نکل جاتا۔ تین سال کے بعد اُس کے روپیے ادا کرسکا۔ اُسی زمانہ میں شہر کا ایک بلیا مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا، اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا۔ "جان لو بھیّا" اُس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اُسے "جان لو بھیّا" ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اُس سے آٹھ آنے پیسے اُدھار لئے تھے۔ یہ پیسے اُس نے مجھ سے میرے گھر گانوں میں جاکر پانچ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز نا اُمید ہوتا جاتا تھا، جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کرلوں، لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا، گھر کوڑی پاس نہ تھی، دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھُنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے، میرے مہاجن نے اُدھار دینے سے انکار کردیا تھا، اور میں لحاظ کے مارے اُس سے مانگنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا، چراغ جل چکے تھے۔ اس وقت میں ایک بُک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو پروفیسر چکرورتی[1] کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدی تھی، ابتک اُسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہوگیا تو اُسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا، کتاب کی قیمت دو روپیے تھی لیکن ایک روپیہ پر سودا ہوا، میں روپیہ لیکر دُکان سے اُترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا

"تم یہاں کہاں پڑھتے ہو؟"

میں نے کہا "پڑھتا تو کہیں نہیں۔ پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں"

"میٹریکولیشن پاس ہو؟"

"جی ہاں"

"نوکری تو نہیں چاہتے؟"

"نوکری کہیں ملتی ہی نہیں"

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر ضرورت تھی، اٹھارہ[2] روپیے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اُس وقت یہ اٹھارہ روپیے میری ہوس تمنا کی معراج تھی۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کرکے چلا تو پاؤں زمین پر

[1] یہ کتاب اتنی مشہور ہے کہ آج تک اعلیٰ درجہ کے نصاب میں داخل ہے اور لڑکے اسکو صرف "چکرورتی" کہکر پکارتے ہیں۔

نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ مَیں گرد وپیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا، مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے۔

(۲)

پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں مَیں نے کہانیاں لکھنا شروع کی۔ ڈاکٹر ربیندر ناتھ کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں، ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا، اور پہلا ناول تو میں نے ۱۹۰۱ء ہی میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں، لیکن کہانیاں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن" وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" میں چھپی اُس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ سوز وطن کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں "گرم دل" کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اِن پانچوں کہانیوں میں حُبّ وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اُس وقت میں سر رشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا، کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ "فوراً آ کر مجھ سے ملو"۔ جاڑے کا موسم تھا۔ مَیں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ اُن کے سامنے "سوز وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا، اُس وقت میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتا تھا، مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُن لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اُسی کی جوابدہی کے لئے مجھے بلایا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا، "کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا، اور آخر میں بگڑ کر بولے "تمھاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے، اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو، مغلوں کا راج ہوتا تو تمھارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمھاری کہانیاں یکطرفہ ہیں، تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے" وغیرہ

آخرکار فیصلہ یہ ہوا کہ میں "سوز وطن" کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کردوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لئے بغیر کچھ نہ لکھوں، میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا، کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہوسکی تھیں، میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کردیں۔

میں سمجھا بلا ٹل گئی، لیکن افسران محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی، چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے میں مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے، ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لیکر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمہ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے اُنھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقہ پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرینگے۔ دراصل اُن کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے مگر سیاسی اُمور سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورہ کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اُس وقت بھی ہتیرے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا "آپ کو اُمید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا؟"

ڈپٹی صاحب نے کہا "اُن سے میری گہری دوستی ہے۔"

"آپ دوست بن کر اُس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں، میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔"

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لئے تیار نہ تھے، صاحب کی باتوں سے مرعوب ہوکر بولے "میں تو حضور کے حکم ...... مگر صاحب نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔ "نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا۔ اگر کتاب سے سڈیشن ثابت ہوتا ہو تو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ تنبیہ کرکے چھوڑ دیجئے۔ منہ میں رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔"

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا "کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے؟"

وہ ہنسکر بولے "نہیں یہ ناممکن تھا کوئی لاکھ روپیہ بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں

میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا، اور میں خوش ہوں کہ وہ رُک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا ہو جانا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا، مگر صاحب بڑے شریف آدمی ہیں۔" میں نے بھی منظور کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں۔

(۳)

میں ہمیر پور ہی میں تھا کہ مجھے پیچش کی شکایت پیدا ہو گئی۔ گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبز ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اروی کھانا پڑی۔ ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا، چورن کھایا، پیٹ پر گرم بوتل پھیری، جامن کا عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہو گئی۔ لیکن درد جاتا رہا۔

اسی طرح ایک مہینہ ختم ہو گیا۔ اِس کے بعد میں ایک قصبہ میں پہونچا تو وہاں کے تھانہ دار صاحب نے مجھ سے تھانہ ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ سوچا کیا ہرج ہے، آج یہیں ٹھہر جاؤ کھانا تو لذیذ ملے گا۔ تھانہ میں ہی اڈا جما دیا۔ داروغہ جی نے زمین قند پکوایا، پکوڑیاں، دہی بڑے، پلاؤ سب کچھ بنوایا، میں نے بھی خاص طور پر کھایا، لیکن کھانا کر جب تھانے میں داروغہ جی کے ہوس کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ساری رات اور اگلے دن بھر کراہتا رہا۔ سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہوئی تو چین ملا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمام زمین قند کی خرابی ہے۔ تب سے اروی اور زمین قند دونوں کی صورت دیکھکر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا لیکن پیچش کی دائمی شکایت ہو گئی۔ پیٹ چوبیس گھنٹے تنا رہتا۔ اپھرن کی شکایت برابر قایم رہی۔ کچھ دنوں تک روزانہ بلا ناغہ چار پانچ میل ٹہلنے جاتا۔ کسرت کرتا، پرہیزی کھانا کھاتا اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا۔ لیکن پیچش میں کوئی کمی نہ ہوئی ورید ن بھی سو کھا جاتا تھا، کئی مرتبہ کانپور آ کر علاج کرایا۔ ایک بار مہینے بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

تب میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیلی ہو، مگر ہنگا گیا بستی کے ضلع میں اور وہ حلقہ ملا جو نیپال کی ترائی کے قریب ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں میرا تعارف پنڈت منّن دویدی گجپوری سے ہوا جو ڈُمریا گنج میں تحصیلدار تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر علمی مباحث پر بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن بستی آ کر پیچش کی شکایت اور بڑھ گئی۔ تب میں نے

چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا۔ تین چار مہینے کے بعد تھوڑا فائدہ معلوم ہوا لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی۔ رخصت کے بعد جب پھر بستی پہونچا تو وہی حالت ہو گئی۔ تب میں نے دَورے کی نوکری چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کر لی۔ یہاں سے تبدیل ہو کر گورکھپور پہونچا مگر پیچش کی شکایت حسب سابق قائم رہی۔ یہاں میرا تعارف مہابیر پرشاد جی پوتدار سے ہوا جو ہندی لٹریچر کے فاضل مادر وطن کے سچے خادم اور بڑے جفاکش و محنتی شخص ہیں۔ میں نے بستی میں ہی ہندی کے رسالہ "سرسوتی" میں کئی کہانیاں چھپوائیں۔ پوتدار جی کی صلاح سے میں نے "سیوا سدن" نامی ناول لکھا۔ گورکھپور ہی میں میں نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی پاس کیا۔ سیوا سدن کی جو قدر و منزلت ہوئی اُس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول پریم آشرم لکھا۔ اس اثنا میں کہانیاں بھی برابر لکھتا رہا۔

پوتدار جی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن تین چار مہینے کے غسل اور پرہیز کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا اور مجھے پیدل جانے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینہ پر چڑھنا پڑا اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پانوں اُٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہونچا۔ اُسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا، سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں، پانی کا علاج بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت اُردو بازار میں شری یت دسرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سودیش سے ملاقات ہو گئی، کبھی کبھی ان سے بھی لٹریچر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اُنھوں نے میری زرد صورت دیکھکر کہا "بابو جی آپ تو بالکل ہی پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج کیجئے۔

مجھے اپنی بیماری کا ذکر بہت بُرا لگتا تھا۔ میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب دو ہی چار مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں، میں نے چڑھ کر کہا، مر ہی تو جاؤں گا بھائی یا اور کچھ؟ میں موت کے خیر مقدم کو تیار ہوں۔ بیچارے دویدی جی نے ندامت سے سر نیچے کر لیا، بعد کو مجھے بھی اپنی اس تلخ گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا، انھیں دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا، غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا، دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی، ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی

میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دیدیا۔

اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ پوتدار جی کا دیہات میں ایک مکان تھا ہم اور وہ دونوں وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری بچیش کم ہوگئی یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہوگئی، مگر اس کے بعد میں بنارس چلا آیا اور اپنے دیہات میں بیٹھکر پرچار اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی میں نو سال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پاگیا۔ اس تجربہ نے مجھے پورے طور پر "قسمت پرست" بنادیا اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔

قطعات تاریخ وفات منشی پریم چند

(از پروفیسر حامد حسن قادری)

(۱)

بپیامِ مرگِ دھنپت رائے آمد　　چو برقِ خرمنِ ہندی و اردو
ز گوہر ہائے گفتارِ "پریم" آہ　　تہی شد دامنِ ہندی و اردو
بگو سالش ز روئے یاس و افسوس　　خزانِ گلشنِ ہندی و اردو
۱۳۵۵ھ

(۲)

مثلِ نثرِ پریم چند ادیب　　ہند کم دیدہ ہندی و اردو
چوں ندارند در غمِ مرگش　　چشمِ نم دیدہ ہندی و اردو
گفت تاریخِ رحلتش حامد　　آہ غم دیدہ ہندی و اردو
۱۳۵۵ھ

(۳)

رفت پریم چند ہم درپیس رآشد آہ آہ　　اے اجل از سنان تو زخم بدل خوریم چند؟
ملک و زباں زمرگ او بسکہ بخوں نشستہ اند　　سالِ وفات او بگو "آہِ غمِ پریم چند"
۱۳۵۵ھ

پریم چند اور مسز پریم چند

یہ دردانگیز مضمون محترمہ مسز پریم چند صاحبہ (شریمتی شیورانی دیوی) نے ہماری درخواست پر اس یادگار نمبر کے لئے لکھا ہے۔ ہم اسے شائع کرکے خلوص قلب سے دست بدعا ہیں کہ ایشور آپ کو اس حادثۂ عظیم کے برداشت کی قوت اور سکون خاطر عطا فرمائے اور بچوں کی عمر دراز کرے۔ ایڈیٹر "زمانہ"

۲۵-جون - ½۲ بجے رات کو

"بیٹیا دھنو[1]! ذرا پنکھا کھول دو، بڑی گرمی ہے" یہ اُن[2] کے الفاظ تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا چھوٹا لڑکا بنو[3] دوڑتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور بولا "اماں! بابوجی کو قے ہوئی ہے" خوف اور غم کے مارے میں چونک پڑی، اور جھپٹ کر جب اُن کے پاس پہنچی تو خون کی قے دیکھکر تھرا گئی جیسے کسی نے برقی تار کو چھوا کر زخمی کر دیا ہو۔ تھوڑی دیر میں بعد وہ صاف الفاظ میں بولے "رانی! اب میں چلا" آئے ہوئے غم کی آندھی سے سنبھل کر صبر و استقلال سے میں نے اپنے فطرتی تحکمانہ لہجہ میں کہا "چُپ رہو، آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ وہ خون کی قے کی طرف اشارہ کرکے بولے "جس کے منہ سے اتنا خون نکلے کیا اُس سے بھی جینے کی اُمید رکھتی ہو" میں نے کہا "اُمید کیوں نہ کروں؟ بن نے کسی کا کیا بگاڑا ہے!" اُنھوں نے منہ پھیر لیا۔ میں نے دھنو کو دوڑا کر ڈاکٹر کو بلوایا، ڈاکٹر نے آکر تسکین بخش لہجے میں کہا کہ "صرف بلغم کی خرابی ہے، میں نے ایسے کئی مریضوں کو اچھا کیا ہے"! ن الفاظ سے مجھے تسکین ہوئی، اور یقین ہوگیا کہ وہ جلد ہی اچھے ہو جائیں گے۔

مگر اُس دن سے آپ کو اچھی طرح نیند نہیں آئی، رات کو آپ روشنی میں لکھتے پڑھتے تھے س غیر معمولی علالت کے زمانہ میں بھی آپ برابر لکھتے رہے، اِسی حالت میں انھوں نے "منگل سوتر" بیسیوں صفحے لکھ ڈالے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں طبیعت اور خراب نہ ہو جائے، اِس لئے میں نے ہ بار ان کو لکھنے پڑھنے سے روکا۔ پہلے تو وہ مان گئے، مگر پھر میں انھیں نہ روک سکی۔ کبھی کبھی اُنکو ت بھر نیند نہ آتی تھی، اور میں یہ سوچکر کہ اس طرح پڑھنے لکھنے میں ان کا جی بہل جائے گا اُن کو

---

[1] منشی پریم چند جی کا بڑا لڑکا سری پت رائے۔ [2] پریم چند جی۔ [3] منشی پریم چند کا دوسرا لڑکا امرت رائے۔

کتاب دے دیتی تھی۔ میں رات دن اُن کی چارپائی کے چاروں طرف چکر کاٹتی رہتی تھی، اُن کا سر سہلایا کرتی تھی اور اُن کے سامنے ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

ایک رات کو

اُن کے پیٹ میں درد تھا، اور میں اُن کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ جب درد کچھ کم ہوا تو بولے "رانی! مجھے تمھاری اور بنّو کی بڑی فکر ہے، دھنّو تو ہاتھ پیر والا ہے، بیٹی کی شادی ہو گئی ہے وہ آرام سے ہے، مگر تمھاری اور بنّو کی کیا حالت ہو گی؟" اُس وقت میرے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو گیا زندگی میں پہلی مرتبہ میں اُن کے سامنے رو پڑی، ورنہ میں ہمیشہ ہر رنج و غم کو سہہ لیتی تھی مگر اس دن برداشت نہ ہو سکی، تاہم فوراً میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور اُنھوں نے میرے دل کو دیکھ لیا مگر اشکوں کو نہ دیکھ سکے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سب تکلیفیں برداشت کر سکتے تھے مگر میرے آنسو اُن کے واسطے ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ کہنے لگے "رانی! میں بھی تمھیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا، یہاں سب کلفتیں جھیلنے کے لئے تیار ہوں مگر میرا اختیار ہی کیا ہے؟" اس کے بعد، اسکے بعد وہ کہنے لگے "رانی! تم اگلے جنم کی ماں ہو، اِس جنم میں میری دیوی ہو" میں نے اُن کا مُنھ بند کر دیا، پھر بھی وہ کہنے لگے:۔

"تمھیں میری روح و قلب کی طاقت ہو، گھبرا مت کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہو گی"۔ اِس طرح اُس رات اُٹھتے وہی مجھے دلاسا دیتے رہے۔ میں چُپ چاپ بیٹھی ہوئی اُن کے پاکیزہ الفاظ سُن رہی تھی۔ میری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، اور اُن کا دستِ نازک میری پیشانی پر تھا۔

بارہ سال پہلے

پریس کُھل گیا تھا، اور آپ خود وہاں کام کرتے تھے۔ جاڑے کے دن تھے۔ مجھے اُن کے پُرانے کپڑے ٹھیک نہ معلوم ہوئے، گرم کپڑے بنانے کے لئے دو مرتبہ چالیس چالیس روپئے دیئے مگر اُنھوں نے دونوں مرتبہ روپیے مزدوروں کو دیدیئے۔ جب میں نے پوچھا کہ کپڑے کہاں ہیں؟ تو ہنسکر بولے، کیسے کپڑے؟ وہ روپئے تو میں نے مزدوروں کو دیدیئے۔ "شاید اِن لوگوں نے کپڑا خرید لیا ہو" اِس پر میں ناراض ہوئی، تو وہ متین لہجہ میں بولے "رانی، جو دن بھر تمھارے پریس میں کام کرے، وہ بھوکوں مرے، اور میں اُونی سوٹ پہنوں؟ یہ نہیں ہوسکتا"۔ اُن کی اس دلیل پر میں جھنجھلا کر بولی "میں نے تمھارے پریس کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے"۔ مگر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے "اگر تم نے میرا ٹھیکہ لیا ہے تو میرا رہا ہی کیا، سب کچھ تمھارا ہی ہے، پھر ہم دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں، ہمارے

تمھارے فرائض جُدا نہیں، جو میرا ہے وہ تمھارا ہے۔ مَیں نے تو اپنے آپ کو تمھارے ہی ہاتھوں سونپ دیا ہے۔" میں لاجواب ہو کر بولی کہ "میں تو ایسا خیال بھی نہیں کرنا چاہتی" اس پر اُنھوں نے محبّت سے بھرپور الفاظ میں کہا "تم پگلی ہو"۔

جب مَیں نے دیکھا کہ وہ جاڑے کے کپڑے نہیں بنوائیں گے، تو مَیں نے اُن کے بھائی صاحب کو روپیہ دیکر کہا کہ آپ ہی اُن کے لئے کپڑے بنوا دیں۔" اُنھوں نے کپڑا خریدا اور جب سوٹ بنکر آیا تو آپ اُسے پہنکر میرے پاس آئے اور کہا کہ "میں سلام کرتا ہوں، تمھارا حکم بجا لایا۔" میں نے بھی ہنسکر دعا دی اور بولی "۔ ایشور تمھیں چین نصیب کرے، اِسی طرح ہر سال نئے نئے کپڑے پہنتے رہو۔" اس کے بعد مَیں نے کہا "سلام تو بڑوں کے لئے واجب ہے، میں نہ تو عمر میں بڑی ہوں اور نہ رشتہ ہی میں، پھر آپ مجھے سلام کیوں کرتے ہیں"؟ اُنھوں نے جواب دیا "عمر۔ رشتہ یا عہدہ کوئی چیز نہیں ہیں۔ میں تو دل دیکھتا ہوں، اور تم نے ماں کا دل پایا ہے، جس طرح ماں بچّوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتی ہے اُسی طرح تم بھی مجھے دیکھکر خوش ہوتی ہو، اور اس لئے میں ہمیشہ تم کو سلام کیا کرونگا۔" اس دن سے ہمیشہ جب وہ نیا کپڑا پہنتے تب آ کر مجھے سلام کیا کرتے تھے۔ پچھلے مئی کے مہینہ میں اُنھوں نے غسل کر کے نئی بنیاین پہن کر مجھے سلام کیا تھا۔ مگر ہائے افسوس یہ اُن کا آخری سلام ثابت ہوا۔

سات سال پہلے

لکھنؤ میں وہ "مادھوری" کے ایڈیٹر تھے۔ کانگریس کا طوفانی زمانہ تھا، میرے دل میں بھی ملکی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ میں بھی اپنا زیادہ تر وقت کانگریس ہی کے کام میں صرف کرنے لگی۔ ایک ن اُنھوں نے کہا "آج میں گھر ہی پر رہونگا کیا اچھا ہو اگر آج تم بھی نہ جاتیں۔ اکیلے میری طبیعت لیسے لگے گی"۔ میں رُک گئی، مگر اتنے میں کئی بہنیں آ کر مجھے گھسیٹ لے گئیں، آخر میں کیا کرتی، س دن شہر میں میرے نام سے نوٹس تقسیم ہوئی تھی اِس لئے مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ آٹھ بجے رات جب لَوٹی تو لڑکوں کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ بھی کانگریس آفس کی طرف گئے ہیں۔ آخر آپ رات کے بجے آئے۔ میرے پوچھنے پر مسکرا کر بولے "تمھیں وطن کی محبّت مجبور کر سکتی ہے تو کیا مجھے نہیں کر سکتی؟" ں نے اِسی لہجہ میں جواب دیا "ضرور، کیوں نہیں، تبھی تو پوتھے کے پوتھے لکھا کرتے ہو، رات کی ت ایک ایک بات کے سوچنے میں لگا دیتے ہو، پھر بھی روپیوں کے درشن نہیں ہوتے، میں کیسے ں کہ اب تک سرکاری پنشن پانے لگتے۔" اُنھوں نے مجھے بیچ ہی میں روک دیا اور متین لہجہ میں ے "اس کی کیا شکایت کرتی ہو، میں تو مزدور ہوں، لکھنا میرا فرض ہے، یہی میری مزدوری ہے اِس میں

مجھے صبر ہے، دُکھ کی بات صرف یہ ہے کہ اگر میں جیل خانہ چلا گیا تو تمھاری اور بچوں کی حالت کیا ہوگی؟ کون ہماری خبر لے گا"..... اس طرح اُس دن بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

مگر آج

آہ، آج میں لُٹ گئی ہوں، میرا تمام خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ آج مجھے اپنی حالت پر افسوس آتا ہے، افسوس میں کتنی بدنصیب ہوں، میرے تمام خیالات اور اعتقادات مٹے جا رہے ہیں۔ ایشور کے انصاف پر بھی میرا اعتقاد کم ہو رہا ہے۔ یہ میری زندگی کی اماوس ہے، مجھے بار بار یہی خیال آتا ہے کہ وہ کتنے عظیم الشان تھے، کیسے فرشتہ خصلت تھے اور میں اُن پر کس طرح حکومت کرتی رہی کہ اس قدر قریب ہونے پر بھی میں اُن کے اوصاف کی قدر نہ کر سکی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ میں اُن کی عظمت کو بھی پوری طرح محسوس نہ کر سکی، مگر انھوں نے مجھے پناہ دیا، مجھے چاہا، پیار کیا اور بڑی خاطر داری کے ساتھ اپنے دل میں اونچے سے اونچے آسن پر بٹھایا، اُس دن مجھے کتنا غرور تھا، میں اُن کی ملکہ تھی۔ وہ دنیا کی نظروں میں افسانہ نگاری کے شہنشاہ تھے۔ مگر میرے شوہر ہوتے ہوئے بھی عزیز دوست تھے۔ مجھے اُن کی بدولت دنیا کی تمام راحتیں تمام نعمتیں موجود تھیں، آج میں اکیلی ہوں، آج میری زندگی کی تمام طاقت برباد ہوگئی ہے، میرا دل ویران ہوگیا ہے۔ نہ قلم چلتا ہے اور نہ گھر گرستی کا کام کر سکتی ہوں، افسوس اُن کے بعد میں بالکل مفلس ہوگئی!

آج اس گھر میں اُن کا نایاب تبسم نہیں، اُن کی ایڈیٹری کی جگہ خالی پڑی ہوئی ہے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے، آج میرا ناخدا نہیں ہے، میں اپنا سب کچھ نیوچھاور کر اُن کو بچانا چاہتی تھی، مگر افسوس کچھ نہ کر سکی۔ آدمی کی سعی اتنی حقیر ہے، اس کا مجھے آج اندازہ ہو رہا ہے۔

اُن کی یادگار "ہنس"[1] آج بھی زندہ ہے، مگر "ہنس" کا وہ گوہر بے بہا کہاں ہے؟ کیا میں اسی لئے زندہ ہوں کہ میرے دیوتا جس چھوٹے سے نونہال کو چھوڑ گئے ہیں اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر بڑا کر جاؤں۔

میرے دیوتا نے سچ کہا تھا کہ "تم پگلی ہو" آج دنیا کی نظروں میں بھی پگلی ہوں، بار بار یہی صدا میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ "میں پگلی ہوں"۔ آہ میں لٹ گئی، ہاں میں لُٹ گئی۔

ماتم زدہ
اُن کی رانی اور داسی

[1] منشی پریم چند کا جاری کردہ رسالہ "ہنس"

منشی پریم چند کی یاد

از منشی پیارے لال شاکر میرٹھی سابق ایڈیٹر "ادیب"

منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات کانپور ریلوے اسٹیشن پر جون ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ میں بنوں (صوبہ سرحد) سے منشی دیانراین نگم کا طلبیدہ کانپور آرہا تھا، اور وہ میرے استقبال کو اسٹیشن پر آئے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی میں تو سامان اتروانے کی غرض سے بریک کی طرف چل دیا، اور میری بیوی بچے ایک طرف پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر میرا انتظار کرنے لگے۔ منشی صاحب ادھر اُدھر نظر مارتے ہوئے وہیں آنکلے اور میری بیوی سے "بچوں کے والد کا نام" دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ میرے ہی بچے ہیں تو بڑے تپاک سے ملے، اور ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آیا تو میری بیوی نے ان کا تعارف کرایا کہ آپ "منشی نواب رائے" ہیں۔ کچھ دیر تو پلیٹ فارم ہی پر باتیں ہوتی رہیں۔ بعد ازاں باہر نکل کر گاڑی پر سوار ہوئے۔ اسٹیشن سے نیا چوک[1] کافی دور ہے، لیکن منشی پریم چند کی وجہ سے دوری مطلق محسوس نہ ہوئی۔ وہ راستے بھر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے گویا بہت پرانے ملنے والے ہیں۔

اُس زمانہ منشی پریم چند "نواب رائے" کے نام سے لکھتے تھے، اور صرف زمانہ کے لئے لکھتے تھے مضمون نویسی کا انھیں کچھ زیادہ شوق نہ تھا، لیکن چونکہ منشی دیانراین نگم سے اُن کے خاص تعلقات تھے، اس لئے جو کچھ لکھتے تھے وہ زمانہ کے لئے ہوتا تھا۔ پہلے پہل میں نے اُن کے مضامین زمانہ ہی میں دیکھے تھے اور میں اُن کے زور قلم اور بالغ نظری کا قائل تھا۔

میرے کانپور آنے سے برس ڈیڑھ برس قبل اُن کا پہلا ناول "ہم خرما و ہم ثواب" لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اس کو ۱۹۰۷ء میں بنوں ہی میں پڑھا تھا

---

[1] ۔ جہاں دفتر زمانہ واقع ہے ۔ ان دنوں ایسٹ انڈین ریلوے کا اسٹیشن نیا چوک سے دو میل سے زائد فاصلہ پر واقع تھا اب سنٹرل اسٹیشن قایم ہو جانے سے اس فاصلہ میں بہت کمی ہو گئی ہے۔

اور بعض خصوصیات کی وجہ سے اُس کو پسند بھی کیا تھا۔ کانپور آنے کے بعد ایک دن جب میں نے اُس کے متعلق تذکرہ کیا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے مجھے سخت تعجب ہوا۔ معاً خیال ہوا کہ کہیں میرے سمجھنے میں غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ مگر انہوں نے خود ہی میری اُلجھن کو دور کر دیا۔ اور اس ناول کی تصنیف کی غرض وغایت بیان کردی۔ انھیں خود بھی یہ ناول پسند نہ تھا۔ اس کے بعد اُنہوں نے اس کو ہندی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام "پریما" رکھا۔ ہندی زبان میں یہ اُن کی پہلی کتاب تھی اس کے بعد میرے قیام کانپور کے زمانہ میں اُن کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں، یعنی "کشنا" ۱۹۰۸ء میں بنارس سے اور "سوزِ وطن" ۱۹۰۹ء میں کانپور سے۔ میرے الہ آباد چلے آنے کے بعد ان کا ایک اور ناول "جلوۂ ایثار" کے نام سے ۱۹۱۲ء میں الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس وقت تک جو کچھ انہوں نے لکھا "نواب رائے" کے نام سے لکھا مگر "نواب رائے" کو ادبی دُنیا میں کوئی خاص پوزیشن حاصل نہ تھی۔

"سوزِ وطن" ایک مختصر کتاب تھی جس میں پانچ چھ مختصر افسانے تھے اور قیمت بھی چار پانچ[1] آنے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہی وہ کتاب ہے جس نے انھیں "پریم چند" بنا دیا۔ یہ افسانے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے ملکی و قومی جذبات کے ترجمان تھے، اور عام طور پر ان کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ منشی صاحب کا تعلق محکمۂ تعلیم سے تھا۔ "سوزِ وطن" پر نہ صرف اعتراض ہوا بلکہ ملازمت تک کے لالے پڑ گئے۔ خُدا خُدا کر کے وہ بلا ٹل گئی اور اسی کے ساتھ منشی جی کی بھی کایا پلٹ ہوگئی!

"نواب رائے" کے بجائے اب اُنہوں نے اپنے افسانوں کے لئے "پریم چند" نام اختیار کیا۔ "پریم چند" کے نام سے ابتداً تمام افسانے زمانہ ہی میں شائع ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد دو چار افسانے "ہمدرد" (دہلی) میں[2] بھی شائع ہوئے۔ میں اُس زمانہ میں "ادیب" الہ آباد کا ایڈیٹر تھا اُن کے افسانے "نواب رائے" کے نام سے ادیب میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے ایک بار لکھا کہ ادیب کے لئے جو افسانے آپ بھیجتے ہیں اُن میں اپنا نام "پریم چند" کیوں نہیں لکھتے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ "میں منشی دیا نرائن نگم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پریم چند" کے

---

[1] "سوزِ وطن" ۵ قصوں کا مجموعہ تھا قیمت ۵ رتھی۔ سوز وطن ۵ قصوں کا مجموعہ تھا قیمت ۵ رتھی۔ "ایڈیٹر"

[2] مولانا محمد علی نے ان قصوں کے لئے تیس روپیہ فی قصہ پیش کیا تھا۔

نام سے کسی اور پرچے میں نہ لکھوں گا۔ بلا وجہ اُن کا دل دُکھانا مجھے منظور نہیں"۔

۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے۔ منشی صاحب اُس زمانہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور ہمیر پور میں قیام تھا۔ کسی خاص ضرورت سے مجھے کانپور جانا پڑا۔ اتفاق سے بازار میں منشی پریم چند سے ملاقات ہوگئی۔ ایک گھنٹہ تک ساتھ رہا۔ اسی ایک گھنٹہ میں دنیا بھر کی باتیں ہوگئیں۔ میں نے "سوزِ وطن" کے بارے میں کیفیت دریافت کی تو کہا "کیا کہوں، بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا وہ تو خیریت گزری کہ کتابیں دیکر پیچھا چھوٹ گیا ورنہ جان پر آبنی تھی"۔ اس کے بعد "جان بچی اور لاکھوں پائے" کہہ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ پھر کہنے لگے کہ جانتے ہو، یہ بلا کیسے نازل ہوئی؟ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد فرمایا۔ "منشی دیانراین نگم کے مطبع سے پہلی کتاب "سوزِ وطن" شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ کتاب[15] پر پرنٹر و پبلشر کا نام نہیں چھپا۔ ظاہر ہے کہ ایسی غلطی عمداً نہیں ہوا کرتی، مگر سنتا کون ہے۔ جانچ پڑتال ہوئی تو اسی سلسلہ میں میرا نام بھی کھل گیا[16]۔ خود ہی سوچو، ایک سرکاری ملازم اور سوزِ وطن ایسی مسموم کتاب کا مصنّف! توبہ توبہ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کتابوں پر بلا ٹل گئی ورنہ کیا عجب تھا کہ مانڈلے کی ہوا کھانی پڑتی"۔ اتنا کہہ کر پھر ایسے زور کا قہقہہ لگایا کہ بازار والے بھی ہکا بکا ہوگئے۔

کانپور میں کم و بیش ڈیڑھ دو سال تک میرا اُن کا ساتھ رہا۔ قریب قریب ہر روز ملاقات ہوتی تھی، اور اپنے دُکھ درد کی بات ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں حد درجہ انکسار اور استغنا تھا۔ اگرچہ خود بھی کچھ خوشحال نہ تھے کہیں دوسروں کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فوراً مدد کو تیار ہو جاتے تھے۔ تصنّع سے اُن کو نفرت تھی اور صاف دلی و صاف گوئی شیوہ۔ حد درجہ زندہ دل، بذلہ سنج اور ظریف الطبع تھے۔ ہمیشہ قہقہہ مار کر ہنستے تھے اور اس زور سے ہنستے تھے کہ دیکھنے والے کو بھی ہنسی آجاتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ منشی دیانراین نگم کے ہاں مخصوص احباب جمع تھے۔ منشی نواب رائے نظر، منشی پریم چند اور راقم الحروف بھی موجود تھے۔ قریب ہی کسی چھت پر گراموفون میں برٹ شیپرڈ کا مشہور لافنگ سانگ (I SAT IN A CORNER) بجنے لگا۔ کچھ دیر تو منشی پریم چند خاموش رہے، پھر یہ کہہ کر کہ لیجئے میں بھی اس کے قہقہہ میں اس کا ساتھ

---

[15] ۔ ناتجربہ کاری اور پریس ایکٹ کے قواعد سے ناواقفیت سے یہ غلطی ہوگئی تھی۔ لیکن مجسٹریٹ نے اس کے پاداش میں ایڈیٹر زمانہ پر بھی پچاس روپیہ کا تاوان عائد کیا تھا۔

[16] نئی چھپی ہوئی کتابوں کے داخلہ فارم میں مصنف کا پورا نام اور پتہ (مع دستخط) درج کیا جاتا ہے۔

دیتا ہوں قہقہہ مارنے لگے!

منشی پریم چند کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ایک آدھ کتاب اُن کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اس کے ساتھ ہی حافظہ بھی بلا کا تھا۔ قصہ کہانی کی کتابیں پڑھنا اور ان کو یاد رکھنا تو کوئی قابلِ تعریف بات نہیں، لیکن منشی پریم چند علمی و سیاسی کتب و رسائل کے اہم مطالب کو اس طرح دُہرا دیا کرتے تھے گویا پڑھ کر سُنا رہے ہیں۔ سیاسی معاملات میں ان کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔ رسالہ زمانہ میں اہم سیاسی واقعات و حالات پر ایک ماہانہ تبصرہ "رفتارِ زمانہ" کے عنوان سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ تبصرہ زمانہ کے خصوصیات میں تھا اور لوگ نہایت توجہ و شوق سے اس کو پڑھتے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے بعض تبصروں کا بڑا جز و منشی پریم چند ہی لکھتے تھے۔ اُنھوں نے بعض کتابوں پر تنقیدیں بھی لکھیں اور وہ تنقیدیں زمانہ کی بہترین تنقیدوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

وسط ۱۹۰۸ء میں انڈین پریس الہ آباد کے پروپرائٹر (بابو چنتامنی گھوش مرحوم) نے انھیں بُلایا تھا۔ بات چیت کرکے کانپور پہنچے تو معلوم ہوا کہ انڈین پریس ایک اُردو رسالہ جاری کرنا چاہتا ہے جس کی ادارت کے لئے اس کی نظر منشی نواب رائے پر ہے۔ شرائط وغیرہ بھی طے ہو گئے تھے مگر اُنکے احباب نے رائے دی کہ ملازمت ترک کرکے الہ آباد جانا مناسب نہیں بلکہ ایک سال کی رخصت لے لو۔ اس مدت میں پرچہ چل گیا تو رہنا، ورنہ آکر پھر اپنی جگہ سنبھال لینا۔ یہ مشورہ منشی پریم چند کو پسند آیا۔ پرچہ کا نام اُنھوں نے "فردوس" تجویز کیا تھا، اور اس کے لئے بہت سے مضامین بھی ادھر اُدھر سے منگا لئے تھے۔ لیکن بعض وجوہ سے وہ تجویز التوا میں پڑ گئی۔

پانچ چھ برس تک میرا منشی پریم چند سے باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اُن کی طرح اُن کے خطوط بھی بہت صاف ہوتے تھے۔ کانپور میں ایک دفعہ وہ میرے یہاں سے ایک کتاب (COMING RACE) لے گئے تھے۔ کتاب پڑھی تو انھیں بہت پسند آئی۔ کہنے لگے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کو ترجمہ کر ڈالوں۔ میں نے جواب دیا کہ اس کا اُردو ترجمہ لاہور میں ہو چکا ہے اور "آنے والی قوم" کے عنوان سے "ترقی"[۵] میں باقساط شائع ہو چکا ہے اور بہت جلد کتابی صورت میں بھی آ جائے گا۔ یہ سُن کر فرمایا کہ پھر میں ہندی میں ترجمہ کئے دیتا ہوں۔ اُنھوں نے ترجمہ کیا اور "پاتال لوک کی سیر" نام رکھا۔ ایک بار میں نے لکھنؤ سے خط لکھا تو اس ترجمہ کے متعلق بھی دریافت کیا کہ اس کا کیا حشر ہوا؟ جواب دیا کہ فلاں پبلشر نے مسودہ کو اس طرح ہضم کیا کہ ڈکار تک نہ لی۔ پبلشروں اور کتب فروشوں کی ذات سے انھیں ہمیشہ نقصان پہنچتا رہا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی میں جب اُن سے ملاقات

---

[۵] نجات رنگیں۔ ینگ مین سوسائٹی لاہور کا مشہور رسالہ جو اب بند ہو گیا ہے۔

ہوئی تو اُنہوں نے انھیں لوگوں کا رونا رویا، اور نام لے لے کر بتایا کہ فلاں اتنی رقم دبائے بیٹھا ہے، اور فلاں اتنا روپیہ ہضم کرنے پر تُلا ہوا ہے وغیرہ۔

ان کا مشہور ناول "بازارِ حسن" شائع ہوا تو چند ماہ بعد میں نے اس کے متعلق انھیں اپنی رائے لکھی جس کے لئے وہ کئی بار تقاضا کر چکے تھے۔ میں نے اُسی خط میں یہ بھی لکھا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے (VANITY FAIR) کا چربہ اُتارا ہے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہ میں نے چربہ اُتارا نہ اس کی تقلید کی، لیکن یہ درست ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ہی مجھے اس کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تصور ایک حد تک ملتا جلتا ہے، لیکن دونوں کی راہیں جُداگانہ ہیں!"

×

جب منشی پریم چند بمبئی جانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ دُور کے ڈھول سُہانے ضرور ہوتے ہیں، لیکن اچھا یہی ہے کہ اس ارادے سے باز رہیئے ورنہ اپنی مٹی پلید کیجیے گا۔ میں نے دُنیائے فلم کے اندرونی حالات اُن پر ظاہر کئے اور بتایا کہ ڈائرکٹروں سے کسی بھلے مانس کی نہیں پٹ سکتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ سب کچھ طے ہو چکا ہے، اب تو جانا ہی پڑیگا۔ کچھ اور نہ سہی تو اسی بہانے بمبئی کی سیر ہو جائے گی۔"

×

میں کسی ذاتی ضرورت سے ایک دن بنارس گیا اور اُسی رات کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔ کسی ذریعہ سے منشی پریم چند کو علم ہو گیا کہ میں بنارس آیا تھا۔ مجھے یہ علم تو تھا کہ اُن کی طبیعت فلم کی رنگینیوں سے اُچاٹ ہو چکی ہے، لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ وہ بمبئی کو چھوڑ چکے ہیں۔ انہوں نے شکایت کی کہ "آپ کی ذات سے یہ توقع نہ تھی کہ بنارس آئیں اور ملاقات کئے بغیر چلے جائیں" دُنیائے فلم کے بارے میں تحریر کیا کہ "بہت تلخ تجربہ ہوا۔ ایسی صورتیں پیدا ہو گئی تھیں کہ کنارہ کشی کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا"

ایک دن پھرتا پھرتا میں منشی پریم چند کے مکان کی طرف جا نکلا۔ سوچا، اِدھر آیا ہوں تو اُن سے بھی مِل لینا چاہیئے۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو اُنھیں تخت پر عجیب شان سے دیکھا۔ پیٹ کے بل اوندھے پڑے ہیں، دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اُوپر اُٹھی ہوئی ہیں، سامنے ایک ہندی کتاب کھلی ہوئی ہے، قلم تیزی سے چل رہا ہے، اور قلم کی رفتار کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی برابر ہِل رہی ہیں۔ معاً خیال ہوا کہ اس وقت کسی کتاب پر تنقید لکھی جا رہی ہے۔ اندر پہنچتے ہی میں نے دریافت کیا۔ کہیئے کس کی تواضع ہو رہی ہے؟ ہنس کر جواب دیا۔ تواضع تو کسی کی نہیں ہو رہی

آج ذرا "رُوٹھی رانی" کو منا رہا ہوں۔ "رُوٹھی رانی" ہندی کی ایک مختصر کتاب تھی جو اُنھیں دِنوں شائع ہوئی تھی۔ اُسی کو اُنھوں نے اُردو میں لکھا تھا، اور بعد ازاں وہ قِصّہ زمانہ میں باقساط شائع ہوا۔ منشی پریم چند کو اس کے بعد بھی بارہا میں نے اسی شان سے لکھتے دیکھا۔ میز کُرسی پر بیٹھ کر لکھنے کا اُنھیں بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ یہ اُن کی خاص "ادا" تھی جس کو زندگی بھر اُنھوں نے نبایا۔

منشی پریم چند کے ساتھ انکے ایک عزیز (نام اس وقت ذہن سے اُتر گیا ہے؎) وہ ایک ہونہار جوان تھے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ منشی پریم چند کو اُن سے بڑی تقویت تھی۔ انھیں کی موجودگی نے اُنھیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بننے کی ترغیب دی۔ منشی پریم چند ڈپٹی انسپکٹر ہو کر کانپور سے چلے گئے۔ انھیں زیادہ تر دورہ میں رہنا پڑتا تھا۔ گھر کی طرف سے کسی قسم کی فکر نہ تھی۔ لیکن اُن کی یہ "بے فکری" زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ یہ نوجوان عزیز خفیف علالت کے بعد دُنیا سے سِدھار گئے اس جوانا مرگی کا منشی پریم چند کو بہت قلق ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں اُنھوں نے مہوبا سے لکھا تھا "اس صدمہ سے کمر ٹوٹ گئی، ہمّت پست ہو گئی۔ جس انسپکٹری کو بڑی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے بعد حاصل کیا تھا، وہی اب جی کا جنجال ہو رہی ہے۔ بیوی کو تنہا چھوڑ کر دورہ پر کیسے جاؤں..... " اِس کے بعد اُنھوں نے دوبارہ کوشش کی اور مدرسی پر اپنا تبادلہ کرا لیا۔

منشی پریم چند کی وفات سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل ایک مہربان الہ آباد تشریف لائے تھے۔ اُن کی معرفت منشی پریم چند نے پیغام بھیجا تھا کہ اگر خود نہیں آ سکتے تو خط لکھنے میں کیا قباحت ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر یہی پیغام ایک اور صاحب کی معرفت ملا۔ میں نے سوچا کہ خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے، اب خود ہی چل کر اُن سے ملاقات کروں گا۔ کچھ دن کے بعد ان کی علالت کی خبر سُنی، مگر کون جانتا تھا کہ اُن کی یہ علالت مرض الموت ثابت ہو گی۔ افسوس! میں بنارس تک نہ جا سکا، اور وہ عدم کو روانہ ہو گئے"!

دُنیائے دُنی کا کچھ عجب طور ہوا　　دورِ اجل آہ عیش کا دَور ہوا
تشّا کر اُٹھو کہ اُٹھ گئے سب احباب　　محفل کا رنگ اور سے اور ہوا

؎ بجے نرائن لال

منشی پریم چند ایک ہم سبق کی نگاہ میں

از بابو لال کرشن بی۔ اے ایل۔ ٹی پنشنر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول

جہان نقش بر آب ست و زندگی بر باد
غلام ہمت آنم کہ دل برو نہ نہاد

منشی پریم چند کی شہرت ایک ادیب اور ناولسٹ کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن شاید زیادہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہوں گے کہ آپ فن تعلیم کے ماہر اور تربیت یافتہ معلّم بھی تھے۔ پندرہ سولہ سال سررشتہ تعلیم میں گورنمنٹ کی ملازمت کرنے کے بعد ترک موالات کے سلسلہ میں آپ مستعفی ہو گئے تھے۔

طالب علمی اور ملازمت کے زمانہ میں مرحوم کا نام دھنپت رائے تھا۔ ٹریننگ کالج میں جب آپ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے آپ کو لوگ بابو دھنپت رائے یا ماسٹر دھنپت رائے کہتے تھے۔ ناول نویسی و مضمون نگاری کے لئے آپ نے اپنا لقب اول "نواب رائے" اور پھر "پریم چند" رکھا۔ آخری لقب دم آخر تک رہا اور اسی نام سے بابو دھنپت رائے اپنے زمانہ کے باکمال افسانہ نویس و مایۂ ناز ادیب و قابل فخر قوم پرست حامی ہندو مسلم اتحاد مشہور ہوئے۔ آپ کا ایک لقب اور بھی تھا جس کا ذکر آگے آئیگا۔

آپ ۱۹۰۲ء میں ٹریننگ کالج الہ آباد کی پریپیرٹری کلاس (PREPARTARY CLASS) میں داخل ہوئے۔ انٹرنس پاس امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جونیر کلاس میں۔ اس وقت صوبہ ہذا میں صرف یہی ایک ٹریننگ کالج تھا۔ جونیر و سینیر کلاس کے پیوپل ٹیچرز ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس کے پرنسپل ہر دلعزیز مسٹر کیمپسٹر مرحوم اپنے شاگردوں کے سچے بہی خواہ اور مددگار تھے۔ یہاں سے ۱۹۰۴ء میں مرحوم جونیر کلاس کا امتحان درجہ اول میں پاس کرکے جونیر سرٹیفکیٹڈ ٹیچر کی سند (J.C) لیکر نکلے۔ بعدہ سرکاری ملازمت کے دوران میں پرائیویٹ طور پر

اوّل ایف۔ اے اور پھر بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ فی الحقیقت ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

پرنسپل صاحب آپ سے بہت خوش تھے۔ اس لئے انھوں نے آپ کو ٹریننگ کالج کے ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا تھا۔ اُس زمانہ میں راقم الحروف بھی ٹریننگ کالج کے سینیر کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ ہم سب لوگ یعنی مدرسان ماڈل اسکول کالج ہوسٹل میں رہتے تھے اسکو روحانی کشش سمجھنا چاہیئے کہ میرا منشی صاحب سے خاص طور پر تعارف ہوا اور بہت جلد دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ آپ طبعاً بڑے غیور و ذہین واقع ہوئے تھے۔

منشی پریم چند ابتدا سے ہی کتب بینی کے بڑے شائق تھے۔ چنانچہ ایک روز میرے ساتھ مسٹر سچدانند سنہا بیرسٹر موجودہ وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی و آنریری سکریٹری کایستھ پاٹھ شالہ سے جن کی خدمت میں مجھے پیشتر سے نیاز حاصل تھا ملاقات کی تاکہ وقتاً فوقتاً اُن کے کتب خانہ سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔ ایک مرتبہ کہیں سے مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی کی تاریخ ہند لے آئے اور چند ہی روز میں اس کی تینوں یا چاروں ضخیم جلدوں کو ختم کر ڈالا۔ اور اس غور سے پڑھا جیسے اس پر کوئی تنقیدی مضمون لکھنا ہے۔ بہر حال اس کے متعلق زبانی گفتگو ضرور رہی۔ اس ابتدائی زمانہ میں آپ نے ایک ناول "کرشنا" لکھا اور چھپوایا۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں آپ کا تبادلہ ماڈل اسکول سے گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور کو ہو گیا۔ دانستہ یا نادانستہ آپ کا "کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی" پر پورا عمل تھا اسی کا نتیجہ وہ شہرت ہے جو مرحوم کو عرصہ سے حاصل ہو چکی تھی۔ اور جس کے باعث اُن کی یاد میں جگہ جگہ صف ماتم بچھی ہے اور ماتمی جلسے ہو رہے ہیں۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

غالباً ۱۹۰۶ء میں آپ کی تحریک پر یہ کمترین بھی خریداران زمانہ کے حلقہ میں داخل ہوا اور ابھی تک وہ سلسلہ قائم ہے۔

بابو دھنپت رائے پستہ قامت دُبلے پتلے آدمی تھے مگر مضبوط۔ پنجہ کھولنے پر انگلیوں کو موڑنا معمولی انسان کے لئے آسان نہ تھا۔ اُن کی وضع قطع سادہ تھی۔ اچکن پائجامہ یا کھلے گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ ممکن ہے کبھی پتلون بھی استعمال کرتے ہوں لیکن یاد نہیں پڑتا۔ اُس

زمانہ میں غیر ملکی فیشن کا بھوت لوگوں کے سر پر اتنا زیادہ سوار نہ تھا۔ سر پر ہندوستانی ٹوپی یا صافہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح مرحوم کی وضع قطع سادہ تھی آپ کی عادتیں اور اخلاق بھی سیدھا سچا اور تصنع سے بالاتر تھا۔ خلوص آپ کا ہمیشہ سے شعار تھا۔ آواز بلند تھی اور خواہ مخواہ کسی سے دبنے والے آدمی نہ تھے۔ ہوسٹل میں لڑنا جھگڑنا درکنار آپ کو کبھی کسی سے نا ملائم یا خلاف تہذیب گفتگو کرتے ہوتے بھی نہیں دیکھا گیا۔ ملازموں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کس قدر خوش اخلاق، صلح کل، ہمدرد اور خود دار انسان تھے۔

پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے۔ اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے۔ آپ کی اور مرحوم بابو گرجا کشور صاحب اسسٹنٹ کمشنر آبکاری کی وجہ سے ہمارا ایک چھوٹا سا لافنگ کلب (LAUGHING CLUB) بن گیا تھا جس کا روزانہ اجلاس میرے ہی کمرہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس میں شاید اور بھی دو ایک صاحب تھے لیکن اس وقت خیال نہیں آتا بہر حال ان میں سبھی ہنسنے والے تھے مگر دھنپت رائے غضب کرتے تھے۔ جب ہنستے تو خوب ہنستے اور قہقہہ پر قہقہہ لگاتے چلے جاتے اسی وجہ سے ہم لوگ خاص کر یہ احقر اور گرجا کشور اُن کو "بمبوق" کہا کرتے تھے۔ اور ممکن ہے یہ لقب میرا ہی اختراع ہو۔ اکثر اسی نام سے راقم کی اُن سے خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں مرحوم دیوریا ضلع گورکھپور تشریف لائے تھے۔ اُس وقت میں کنگ ایڈورڈ اسکول دیوریا کی خدمت کر رہا تھا۔ آپ غریب خانہ پر مقیم رہے اور دو تین دن خوب لطف صحبت رہا مگر اس وقت اُن کی قہقہہ بازی میں بہت فرق آچکا تھا البتہ خلوص و وضعداری ویسی ہی تھی۔ صحت بھی پہلی سی نہ تھی۔ یہ انحطاط مسلسل دماغی انہماک پاس وضع و دیگر افکار کا قدرتی نتیجہ تھا۔ مگر اس وقت بھی یہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ ہنسی اس قدر جلد روپوش ہو جائیگی اور یہ ماہتاب محبت ہمیشہ کے لئے پردۂ تاریکی میں چھپ جائے گا ؎

خوش ست عمر دریغا کہ جاودانی نیست
بس اعتماد بریں پنج روز فانی نیست

۱؎ کانپور میں قیام کے زمانہ میں احباب ہمیشہ آپ کو اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔

منشی پریم چند مرحوم ایک شاگرد کی نگاہ سے

از منشی منظور الحق کلیم

میرا جولائی ۱۹۱۶ئہ سے مئی ۱۹۱۸ئہ تک کا زمانہ استاذی منشی پریم چند مرحوم کے ساتھ شاگردی کی حیثیت سے بسر ہوا۔ آپ اُس زمانہ میں نارمل اسکول گورکھپور میں فرسٹ اسسٹنٹ تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ اسکول میں عموماً ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے۔ رہنے کے لئے آپ کو اسکول ہی میں سرکاری مکان ملا تھا۔ گھنٹہ بجا اور آپ شاعرانہ انداز میں نکلے۔ اکثر آپ کھلے سر بال پریشان اور ایک کوٹ پہنے ہوئے جس کے بٹن کھلے رہتے۔ عام طور پر دھوتی پہنے ایک عجیب انداز رفتار سے اسکول آتے تھے۔ لڑکے جتنا اُن کا ادب کرتے تھے کسی دوسرے کا نہیں کرتے تھے۔ میری جماعت کو تاریخ پڑھاتے تھے۔ اُن کا دستور یہ تھا کہ خود تاریخ کی کتاب لیکر پڑھتے چلے جاتے، چونکہ لڑکے مڈل اور ٹریننگ پاس ہوتے تھے۔ اس لئے زیادہ وقت نہیں پڑتی تھی۔ ایک گھنٹہ میں جو کچھ پڑھانا ہوتا ۱۵ منٹ میں پڑھا کر تاریخ کے متعلق وہ باتیں بیان کرتے جو اُس تاریخ میں نہ ہوتیں۔ نہیں معلوم اُن کی معلومات کتنی وسیع تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جو کچھ تاریخ میں پڑھکر سناتے اُس کے خلاف مختلف تاریخی حوالوں سے بیان کرتے۔ بعض واقعات کے متعلق یہ بھی دکھلاتے کہ محض ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ غرض اُن کا گھنٹہ عجیب وغریب معلومات کا گھنٹہ ہوتا۔ گھنٹہ ختم ہونے کے قبل یہ بھی فرما دیتے کہ دیکھو جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ سمجھنے کی چیز ہے امتحان میں وہی لکھنا جو تمھاری کتاب میں ہے ورنہ فیل ہو جاؤ گے۔

کلاس میں اُن کے آتے ہی ایسی زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر ایک اُن کی طرف مخاطب ہو جاتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو سبجکٹ پڑھانا ہے وہی پڑھایا جاوے۔ بلکہ جس موضوع کی طرف اُن کا رجحان یا لڑکوں کا تقاضا ہوا بیان فرمانے لگے۔ اگر کلاس میں پڑھاتے وقت کوئی ہنسی کی بات آگئی تو بے اختیار ہنسنے لگتے۔ کسی کا خوف و ہراس نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ انسپکٹر صاحب معائنہ کے لئے آئے بابو بچن لال صاحب ہیڈ ماسٹر

مرحوم جو بہت سیدھے آدمی تھے کچھ پریشان سے تھے۔ تمام لڑکے بھی اپنے اپنے ڈریس سے آراستہ تھے مگر ہمارے استاد مرحوم کا وہی عالم تھا جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ ننگے سر۔ بال پریشان۔ کوٹ کا بٹن کھلا ہوا۔ انسپکٹر صاحب کلاس میں آئے مگر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا کچھ انگریزی میں گفتگو ہوئی اس کے بعد انسپکٹر صاحب چلے گئے۔

اُس زمانہ میں استاد مرحوم کے ایک چھوٹا بچہ دھنو تھا۔ اُس کو ہم لوگ اکثر کھلاتے تھے جس وارڈ میں ہم لوگ تھے اُس کے بعد ہی استاد مرحوم کا مکان تھا۔ اِس لیے انھیں جب ضرورت ہوتی ہم لوگوں کو بلا لیتے۔ اُس زمانہ میں جس قدر افسانے لکھے گئے اور رسالوں میں بھیجے گئے تقریباً کُل کے کُل میرے صاف کئے ہوئے تھے۔ میں نے اُس زمانہ میں ایک ناول محمود اور سائرہ کے نام سے لکھا تھا۔ ایسا شفیق استاد پاکر اصلاح نہ لیتا تو غلطی تھی چنانچہ میں نے اسے انھیں دکھایا۔ دوسرے روز یہ کہہ کر اُسے واپس کر دیا کہ اتنی فرصت کس کو ہے کہ اتنی بڑی کتاب دیکھے۔ اگر شوق ہے تو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھو پھر میں نے کبھی ہمّت نہ کی سو دو چار افسانے تعمیل حکم میں لکھے جو زمانہ میں چھپ گئے۔

آپ کے افسانے کی عالمگیر شہرت کی وجہ سے اکثر لوگ دور دراز سے اُن سے ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دو صاحب ملنے کے لئے آئے ایک اعظم گڈھ کی کسی تحصیل کے تحصیلدار تھے دوسرے کوئی رئیس تھے۔ رئیس نے کچھ روپیہ بھی پیشکش کیا تھا تحصیلدار صاحب کا نام غالباً مَنّن دویدی تھا۔

جب نان کوآپریشن میں ملازمت سے الگ ہوے تو تمام لڑکے اسکول چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے مگر آپ نے سبھوں کو روکا اور بتایا کہ یہ راستہ بہت دشوار ہے میں تو اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پال لوں مگر تم لوگ اس قابل نہیں اِس لئے اگر تم لوگوں نے اسکول چھوڑا تو سخت دشواری میں پڑ جاؤ گے چنانچہ بہت سے لڑکے اسکول میں رہ گئے پھر بھی چند لڑکے فرطِ محبّت میں تعلیم سے دست کش ہو گئے۔

منشی پریم چند مرحوم ایک رفیق کار کی نگاہ میں

از مرزا محمد عسکری۔ بی۔ اے لکھنوی

منشی پریم چند صاحب مرحوم سے مجھ سے پہلی مرتبہ مولانا ظفر الملک صاحب ایڈیٹر "الناظر" کی ہمراہی میں ملاقات ہوئی۔ جب یہ دونوں صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء کا ہے جب میں بعد فراغ ملازمت کلکتہ سے آگیا تھا۔ اُسی زمانہ میں شمس العلما، مولانا کمال الدین صاحب پروفیسر عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی جدوجہد سے لکھنؤ میں انجمن اُردو قائم ہوئی تھی اور میں اور سید مسعود حسن صاحب رضوی بھی اس کے ممبر تھے۔ خیر۔ مولانا ظفر الملک صاحب نے منشی پریم چند صاحب کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھئے یہ بھی آپ کی انجمن کے ایک سرگرم ممبر ہوں گے اور جس تعریف کے وہ مستحق تھے یعنی اُردو میں اُن کی افسانہ نگاری اور ہندی میں انکی شہرت یہ سب مختصراً بیان کی۔

منشی صاحب کو دیکھکر میرے اوپر ایک خاص اثر پڑا۔ میانہ قد، چھریرا بدن، کتاب رُو چہرہ، ناک نقشہ نہایت درست، آنکھیں بڑی اور نمایاں، سفید صافہ باندھے ہوئے جو اُن پر بہت زیب دیتا تھا۔ یہ صافہ میں نے اُن کو اکثر باندھے دیکھا ہے۔ مجھ پر منشی صاحب کی ذہانت اور قابلیت کا بیک نظر بڑا اثر ہوا۔ ہر چند کہ اُنہوں نے گفتگو میں کم حصہ لیا مگر ہنسی اور مذاق کی باتوں میں ہمارے ساتھ شامل رہے۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو ہم دونوں سے زیادہ ہنسے۔ منشی صاحب کی یہ خصوصیت تھی (جو اُن کی زندہ دلی اور نیکدلی کی خاص علامت تھی) کہ اکثر ہنستے تھے اور زور سے قہقہہ کے ساتھ ہنستے تھے۔ میں نے اُن کو دو تین برس کے دوران میں ہمیشہ شگفتہ رُو اور ہنس مکھ پایا۔ کبھی غصہ اُن کے چہرے پر نہ دیکھا کبھی کبھی میں اُن سے مذاقاً کہتا تھا کہ کیوں صاحب کیا آپ کو غصہ کبھی نہیں آتا۔ کیا آپ گھر میں بھی کبھی غصہ نہیں کرتے۔ اِس پر وہ ہمیشہ ہنس دیتے تھے۔ یہ شگفتہ رُوئی اور خوش مزاجی انسان کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ اس سے عمر بڑھتی ہے مگر افسوس ہے کہ منشی صاحب اس قاعدہ سے مستثنیٰ نکلے اور ہنوز بوڑھے نہیں ہوئے تھے کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مجھ کو اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ منشی صاحب "انجمن اُردو" کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے یا نہیں مگر اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ

وہ ممبر ہو گئے تھے اور ایک ایسے قابل و مشہور اردو و ہندی نگار شخص کی شرکت پر انجمن کو فخر و ناز تھا۔
سنہ ۱۹۲۶ء میں جب منشی نولکشور کے مطبع سے میرا تعلق ہوا یعنی پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ کا میں سپرنٹنڈنٹ ہوا تو اسی کے کچھ عرصہ بعد رسالہ "مادھوری" کے تعلق سے منشی صاحب بھی وہاں ملازم ہوئے۔ غالباً یہ سنہ ۱۹۲۶ء یا سنہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ گو "مادھوری" کا دفتر ایک کمرہ میں کوٹھے پر تھا مگر منشی صاحب کی اور بعض اسٹاف "مادھوری" کی نشست میرے کمرہ کے متصل ایک دوسرا کمرہ تھا اُسی میں تھی۔ اُسی زمانہ میں جبکہ ہر وقت کا ساتھ تھا مجھ سے اور اُن سے ملاقات بڑھی اور مجھ کو اُن کے کیریکٹر کے مطالعہ کا اچھا موقع ملا۔ اُس زمانہ میں منشی صاحب "مادھوری" کے علاوہ مطبع کی کچھ ٹیکسٹ بُک بھی تیار کرتے تھے۔ جو شخص بڑے بڑے ناولوں کا مصنف ہو مختصر افسانہ نویسی میں ید طولیٰ رکھتا ہو اُس کے متعلق چھوٹے بچوں کی کتابوں کی تیاری کی گئی۔ میں اکثر کہا کرتا تھا کہ دیکھئے گھوڑ دوڑ کا گھوڑا یکے اور تانگے میں جتے تو کیسا چلے گا۔ اُنھیں ٹیکسٹ بکوں کی اُردو کی نظر ثانی جب میرے متعلق کی گئی تو منشی صاحب نے کہا کہ مرزا صاحب۔ اب ٹھیک سے جوڑی ہو گئی۔
جیسا میں نے اُوپر ذکر کیا منشی صاحب کی خوش خلقی، نیک نفسی اور ہنسوڑپن سے اُن کے تمام ساتھی جو اُس کمرہ میں بیٹھتے تھے بے انتہا خوش تھے۔ اُن کے قہقہوں کی آواز سے کمرہ گونج جاتا تھا اور روشن ہو جاتا تھا۔ میرے نزدیک "BEAMING LAUGHTER" یعنی روشن کرنے والی ہنسی اسی کو کہتے ہیں۔ جب میں اپنی کتاب "نوادر" لکھ رہا تھا تو اُس کے لطیفے کبھی کبھی اُن کو بھی سُناتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مؤذن کا لطیفہ جو اذان دیتے وقت دور بھاگتا جاتا تھا اور جب اُس سے پوچھا گیا کہ یہ کیا حرکت ہے تو جواب دیا کہ اپنے اذان کی آواز میں بھی سُننا چاہتا ہوں کہ دُور سے کیسی معلوم ہوتی ہے اس لطیفہ کو سُن کے مرحوم اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری کتاب "نوادر" (جو اُس وقت ناتمام حالت میں تھی) کے بڑے معترف اور قدردان تھے۔
ایک مرتبہ مالک مطبع منشی بشن نراین صاحب بھارگو مرحوم کے بعض ہوا خواہوں نے اُن کو یہ سمجھایا کہ اسٹیٹ پر قرضہ کا بار ہے۔ اُس کے کم کرنے کی ایک یہ صورت ہے کہ عملہ کی تنخواہ گھٹا دی جائے۔ چنانچہ اہلکاران بکڈپو و پریس کو جمع کیا گیا اور ایک صاحب نے نہایت معقولیت سے یہ تقریر کی کہ چونکہ اسٹیٹ پر بار بہت ہو گیا ہے تجویز ہے کہ آپ لوگ اپنی تنخواہوں سے تھوڑا تھوڑا تخفیف کرنے کی اجازت دیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اکثر جگہ ایسی حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اسپیچ سُن کر میں نے مختصراً کہا کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ اسٹیٹ

اتنی زیر بار ہے کہ تخفیف کی ضرورت ہے تو کم سے کم میں اپنی تنخواہ اُس وقت تک کہ قرضہ ادا ہو جائے نصف کر دینے پر راضی ہوں اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی تخفیف تنخواہ کا محض ایک بہانہ ہے تو میں ایک پیسہ بھی تخفیف کرانا نہیں چاہتا۔ منشی صاحب مرحوم نے میری اس صاف گوئی کی تعریف کی اور صاف کہہ دیا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔ اس ادنیٰ واقعے سے منشی صاحب کی خودداری اور مستقل مزاجی ثابت ہوتی ہے۔

منشی لشن نراین صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اپنی ملازمت فوراً ترک کر دی اُسی کے تھوڑے ہی دن بعد منشی صاحب بھی وہاں سے علیحدہ ہو گئے۔

منشی صاحب کبھی کبھی منشی دیا نراین صاحب نگم کی ہمراہی میں بھی غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ اور اب تو چونکہ بے تکلفی ہو گئی تھی بہت دیر تک نہایت پُر لطف صحبت رہتی تھی۔

افسوس صد ہزار افسوس کہ مجھ سے اور اُن سے اس پانچ چھ برس کے عرصہ میں ملاقات نہیں ہوئی مگر میں یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا کہ وہ ایک معقول تنخواہ پر کسی ڈرامیٹک یا فلم کمپنی کے ڈرامہ نگار ہو گئے ہیں۔ اُن کے انتقال کی خبر ایک اچانک تیر کی طرح میرے دل پر لگی۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کے پرچہ "کلیم" میں ایک اشتہار نظر پڑا تھا جس میں کسی ادبی کانفرنس کے سلسلہ میں داعیوں کی فہرست میں منشی پریم چند کا نام سب سے پہلے تھا۔ یہ کانفرنس اکتوبر ہی میں ہونے والی تھی۔ کس کو معلوم تھا کہ کانفرنس کا داعی اُس کے اجتماع سے قبل ہی داعئ اجل کو لبیک کہے گا۔ رہے نام اللہ کا۔

روحانیت

"یہ مادیت ہی ہمیں روحانیت کی طرف لیجائے گی۔ نظام زندگی کو خود مشیت کی پلٹا دیتی رہتی ہے"

(پردہ مجاز)

مذہب

"مذہب کو تولنے کے لئے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا بیگن کو تولنے کے لئے سونار کا کانٹا.... یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں یا پھر اُس میں ایسی زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں پڑتا"

(چوگان ہستی)

آہ! منشی پریم چند

از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

منشی پریم چند کی ناوقت موت پر جتنا غم کیا جائے کم ہے۔ منشی صاحب ہندوستان کے اُن اقبال مند ادیبوں میں تھے جن کے ادبی کمالات کا اعتراف کرنے پر اُن کے حاسد بھی مجبور رہتے۔ یہی واحد خصوصیت اُن کو ادب و انشا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچانے کو کافی ہے۔ چہ جائیکہ تمام وہ خوبیاں جو مبداء فیاض نے اُن کی فطرت میں فراہم کردی تھیں۔ وہ ازل سے خالص ادبی ذوق لائے تھے۔ اُن کی زندگی ابتدا سے انتہا تک اُردو، ہندی زبان کی توسیع و ترقی میں صرف ہوئی اور اب جبکہ وہ بزمِ ادب میں موجود نہیں تو یہاں کے چپہ چپہ میں اُن کا ماتم بپا ہے۔

واقعی منشی صاحب عصرِ حاضر کے بہترین افسانہ نویس تھے۔ اُنھوں نے ذہنِ رسا کی مدد سے اِنسانی فطرت کی جیسی عدیم النظیر تصویریں کھینچی ہیں اُس کا جواب نہ اُردو ادب پیش کرسکتا ہے اور نہ ہندی لٹریچر۔ اُنھوں نے حُبِ وطن اور اخلاق و اخوت کی سچی تعلیم دی ہے۔ اعلیٰ اور پست دونوں طبقوں کی خصوصیات پر بڑی کامیابی سے روشنی ڈالی ہے۔ اُنھوں نے عیوب و محاسن نمایاں کرنے میں نہ کسی کی رعایت کی ہے اور نہ کسی سے تعصب برتا ہے۔ اُنہیں سیرت نگاری میں کمال حاصل تھا۔ وہ افسانے نہیں لکھتے تھے بلکہ اِس پردے میں سماج کا حقیقی مرقع پیش کردیتے تھے۔ جو نہ صرف نشاطِ رُوح کا باعث ہوتا تھا بلکہ حقیقت بین نگاہوں کے لئے عبرت آموزی کے اسباب بھی فراہم کرتا تھا۔ قدرت نے اُنہیں مذاقِ سلیم کے ساتھ ساتھ خوش طبعی اور زندہ دلی کا جوہر بھی عطا کیا تھا اِس لئے اُن کی تحریروں میں دل آویز شگفتگی اور حلاوت پائی جاتی ہے جو اُن کے افسانوں کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اُن کا تجربہ وسیع اور نظر غائر تھی، وہ زندگی کے تمام مسائل کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور اُنھیں مقبولِ عام انداز سے بیان

ترجمانی تھے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کے حقیقت نگار قلم نے سیرت انسانی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ مجھے عرصہ سے اُن کا نیاز حاصل کرنے کی تمنا تھی اور جس قدر اُن کے رشحاتِ قلم سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اُتنی ہی یہ آرزو بڑھتی جاتی تھی۔ آخر یہ مراد اُس وقت حاصل ہوئی جب بابو رادھے لال صاحب کپور جنرل منیجر منشی نولکشور نے ۱۹۲۴ء میں مجھے کلکتے سے طلب کر کے ناولوں کا صیغہ حوالے کیا۔ اور منشی پریم چند آنجہانی مادھوری آفس میں بلائے گئے۔

منشی صاحب بے حد خلیق، ہنس مکھ اور منکسر آدمی تھے۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ مسکراتے ہوئے پایا۔ چونکہ پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں میرا قیام ۱۹۲۵ء تک رہا اس لئے وقتاً فوقتاً منشی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ جب اُنھیں کوئی کام نہ رہتا تو پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلے آتے اور اپنی گل فشانیوں سے ہمارے تھکے ہوئے دماغ کو تازہ کر دیتے تھے قلم کیطرح اُن کی زبان میں بھی زور تھا۔ گفتگو بہت سلیس اور دلچسپ ہوتی کہ اس کے سُننے کا دل سے اشتیاق ہوتا۔ لیکن فرائض کا خیال اُن دل آویز صحبتوں کو دیر تک قائم نہ رہنے دیتا۔

وہ پُرانی کہانیوں اور قصّوں کے بے انتہا شائق تھے۔ اکثر راقم الحروف سے فرمائش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی اُن کے مذاق کے مطابق کوئی چھوٹی موٹی کتاب مل جاتی تو میں اُسے اُن کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ وہ خوش ہو جاتے اور نہایت ذوق سے پڑھتے۔ جب واپس کرنے لگتے تو اُس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے۔ یہ خیالات اُنکی ناقدانہ قوت کا مظہر ہوتے۔

وہ ہر تصنیف پر گہری نظر ڈالنے کے عادی تھے۔ آج کل جن مضامین کو بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اُن کے مطالعہ سے بہترین اور مفید نتائج اخذ کر لیتے تھے۔ نقد و تبصرہ اُن کی طبیعت ثانی بن چکا تھا در اصل وہ اتنی صحیح رائے قائم کرتے تھے کہ کسی کو اس میں کچھ کہنے کی گنجایش باقی نہ رہتی تھی۔ لیکن تنقید ہی ادب اُردو کی وہ صنف ہے جس سے ہندوستانی بھڑکتے ہیں کیونکہ وہ تعریف کے سوا کوئی کلمہ سُننا پسند نہیں کرتے تاہم منشی صاحب کا یہ کمال تھا کہ زبانی اور تحریری تنقیدوں میں اتنا لطیف اسلوب بیان اختیار کرتے تھے جو طبایع پر گراں نہ ہوتا تھا۔ پڑھنے اور سننے والے اُس میں تلخیوں کے بدلے حلاوت

محسوس کرتے تھے۔

جس زمانہ کا تذکرہ لکھ رہا ہوں، اُن دنوں میں نے اُردو[۵] کے اَن پڑھ (اُمّی) شاعروں کا ایک تذکرہ قلمبند کرنا شروع کیا تھا کچھ مسالہ جمع کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ برسبیل تذکرہ اُس کا ذکر آ گیا۔ منشی صاحب نے سُنا تو اُس کے دیکھنے کے شائق ہوئے اور تقاضا کیا کہ جس قدر حصّہ لکھا جا چکا ہے مجھے دکھاؤ۔ اُن کے اصرار اور تقاضوں سے مجبور ہو کر میں نے اُسی طرح جابجا سے کٹا پٹا مسودہ حاضر کر دیا۔ تقریباً آٹھ دس روز اُنہوں نے اُسے اپنے پاس رکھا۔ پھر واپس کرتے وقت اُس کے بابت نہایت حوصلہ افزا خیالات ظاہر کئے جن کا اعادہ ضروری نہیں۔ ساتھ ہی اپنی دستخطی تحریر بھی عنایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے تذکرہ کے ساتھ شایع کر دیجئے گا۔ یہ تحریر جو ۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو عطا فرمائی گئی تھی ہنوز محفوظ ہے اور جب کبھی اُس تذکرے کے چھپنے کی نوبت آئے گی تو انشاء اللہ زیبِ عنوان ہو گی۔ چونکہ اس تحریر سے بھی منشی صاحب کی تنقید نگاری پر تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے اس واسطے اس کا وہ اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق اُمّی شعرا سے ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"موزونیت ایک وہبی صفت ہے، جسے خدا نے یہ صفت عطا کی ہے۔ اُسے عروض و قوافی کا منت شناس بننے کی ضرورت نہیں۔ علمیت اگر اس صفت کو حشو زوائد سے پاک، دائرہ نگاہ کو وسیع اور قوت بیان کو موثر کر دیتی ہے، وہاں شاعری میں تصنع اور آورد کا رنگ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اِن اُمّی شعرا کے کلام میں شاعر کے اصلی جذبات نظر آتے ہیں اور اپنی بے ساختگی سے دل پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ اِن شعرا نے اپنے زمانے کے اساتذہ کی تقلید کی ہے اور اُن کا اندازِ بیان بھی وہی ہے لیکن اِن کے موثر ترین اشعار وہی ہیں جو بندشوں کی قید اور ترکیبوں کی پیچیدگیوں سے پاک ہیں۔"

اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہو گئے اور اُن کی عنایتوں میں خلوص و یگانگت جھلکنے لگی۔ میرے متعدد افسانوں کو دلچسپی سے پڑھا اور اُن پر آزادانہ رائے ظاہر کی۔ بعض افسانوں کی نسبت تو ایسی پسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ مجھے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا پڑا اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ

۵- میں نے اُردو کے اکثر بے پڑھے لکھے شاعروں کا تذکرہ قلمبند کیا ہے۔ ادب نواز حضرات سے ملتمس ہوں کہ جن صاحبان کو کسی اُمّی شاعر کے حالات سے آگاہی ہو۔ وہ براہ کرم اُن کے مختصر حالات معہ سنہ ولادت اور وفات کے مؤلف کو منیجر نامی پریس لین لکھنؤ کے پتہ سے سرفراز فرما کر شکر گذاری کا موقعہ دیں

آپ ہجو ملیح فرماتے ہیں۔ لیکن یہ میری غلطی تھی جیسا کہ اُنھوں نے بعد میں ثابت کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ داد دینے میں وہ نہایت کُشادہ دِل واقع ہوئے تھے مضمون یا افسانے کا جو حصّہ پسند آجاتا تھا۔ خوب دِل کھول کر تعریف کرتے تھے۔

افسوس! اُن کی صحبت سے زیادہ عرصہ تک لُطف اندوز ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ اور مجھے بوجوہ جنوری ۱۹۲۸ء میں پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ سے علیحدہ ہوکر کلکتے جانا پڑا اور کچھ عرصہ بعد مُنشی صاحب بھی علیحدہ ہو گئے۔ سالہاسال گزر گئے لیکن ملاقات تو ملاقات خط وکتابت کا بھی موقعہ نہ ملا۔ پھر جب ایک فلم کمپنی کی طلبی پر مُنشی صاحب بمبئی گئے اور اُن کا پہلا افسانہ فلم بن کر مارکٹ میں آیا تو میں نے اُس کے متعلق چند استفسارات لکھ کر اُن کی خدمت میں ارسال کیئے۔ اُنھوں نے نہایت توجہ سے میرے تمام سوالوں کا تفصیلی جواب دیا۔ کاش! میری طویل علالت کے سلسلے میں وہ خط ضایع نہ ہوجاتا تو آج فلمی دُنیا کے اکثر نکات ظاہر کیئے جا سکتے تھے۔

اِس بیان سے مُنشی صاحب کے وسیع اخلاق کو ظاہر کرنا مقصود تھا کیونکہ وہ سب سے جُھک کر ملنے اور خلوص سے پیش آنے کے خوگر تھے۔ یہی چیزیں ہیں جو احباب کے قلوب میں اُن کی یاد کو ہمیشہ برقرار رکھیں گی اور اُردو، ہندی ادب کا یہ خادم نہیں بلکہ محسنِ اعظم جہانِ ادب میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

تلقین عمل اور اصلاح

سورگ "بہشت" اور نرک "دوزخ" کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں، مُردہ ہیں، ہماری دوزخ اور بہشت سب اسی زمین پر ہے۔ ہم اس وارِ عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

(پریم چند) "نوک جھونک"

نظامِ سلطنت

"نظامِ سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے" (لال فیتہ)

"پریم وہ پیالہ نہیں جس سے آدمی چھک جائے" (پردہ مجاز)

پریم چند کے چند اوصاف

(از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ بی۔اے، ایل ایل۔بی مصنف سیر المصنفین)

یہ اُردو کی بدقسمتی ہے کہ منشی پریم چند جیسا افسانہ نویس آخر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو صرف چھپن ۵۶ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا۔

اگر آپ کے حالاتِ زندگی نظرِ غور سے دیکھے جائیں تو یہ ایک مثال اور سیکڑوں مثالوں میں شامل کرنے کے قابل ہے کہ اہل علم ہمیشہ مفلس اور تنگ حال رہتے ہیں۔ قدرت اس بارے میں فیاض نہیں ہے وہ جس کو علم دیتی ہے اس کو دولت نہیں دیتی۔ ایسی مثالیں بہت ہی شاذ ہیں کہ علم اور دولت دونوں کسی ایک شخص میں جمع ہوگئی ہوں۔ ماں کی شفقت سے وہ بچپن ہی میں محروم ہوگئے تھے اور والد ماجد بھی ان کو آغازِ شباب ہی میں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ چنانچہ ذاتی مصارف کے علاوہ سوتیلی ماں بھائی اور ننھیال کے بعض افراد کا بار کفالت بھی ان کے سر آپڑا تھا تعلیم بھی تکمیل کو نہ پہونچی تھی کہ اُن کو اپنا اور اپنے اقربا کا پیٹ پالنا ضروری ہوگیا۔ سُنا ہے کہ سب سے پہلے پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن ملی اور اسی قلیل آمدنی میں وہ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کرتے رہے۔ پہلی بیوی سے انھیں رنج پہونچا، گندم نما جو فروش احباب سے بھی سابقہ ہوا۔ بعض حضرات نے دھوکے دیئے اور کچھ رقمیں وصول کرکے روپوش ہوگئے۔ ان تمام مصائب کے باوجود اُن کے چہرہ پر کبھی شکن تک نہیں پڑی اور انکی خوش مزاجی اور ہمدردی میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ اُن کا ہنس مکھ چہرا اور اُن کے مزاج کی شگفتگی برابر قائم رہی۔ دوست نوازی اور اولوالعزمی میں بھی کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ عزت و شہرت کے ساتھ ساتھ اُن کا نقطۂ خیال اور وسیع و کشادہ ہوتا گیا۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ایک چالاک نوکر گھر کا بہت کچھ اثاثہ لیکر چلا گیا تھا۔ بیوی کا زیور، کچھ روپیہ نقد، کچھ سرکاری کیش سرٹفکیٹ وغیرہ جو ایک صندوق میں بند تھے کارگزار ملازم لیکر غائب ہوگیا۔ سُنا ہے کہ اس نقصان کے بعد بھی پریم چند جی اپنی معمولی خندہ پیشانی کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی جو خود ایک قابل مصنفہ اور بڑی نیک سیرت اور بلند ہمت خاتون ہیں اس نقصان کا چنداں خیال نہیں کیا۔

واقعی ایسے نیک سیرت خوش اخلاق اور باکمال آدمی کی موت نہایت تکلیف دہ ہے۔ مجھکو ذاتی طور پر اُن سے نیاز حاصل نہیں تھا اور نہ میں افسانوں کے پڑھنے کا چنداں شوق رکھتا ہوں لیکن ایک عرصہ سے رسالۂ "زمانہ" کی بدولت ان کے نتائج افکار کو دیکھتا رہا ہوں۔ اس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی ابتدا اور اُن کی انتہا کا حال مجھے معلوم ہے۔ غالباً اُردو ادب میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چھوٹے چھوٹے قصّوں کے پیرایہ میں نہایت سادگی کے ساتھ دیہاتی زندگی اور ہماری روزمرہ کی ضرورتوں پر بہت ہی خوب لکھا ہے۔ وہ بادشاہوں اور اُمرا اور دولتمندوں کے قصّے بیان نہیں کرتے بلکہ جو کچھ متوسط الحال طبقہ میں گزرتا ہے اُس کا نقشہ نہایت عمدگی کے ساتھ کھینچ دیتے ہیں۔ چونکہ ان کی تعلیم مکمل نہ تھی اور جو کچھ اُنھوں نے حاصل کیا وہ اپنے ہی شوق کا نتیجہ تھا لہٰذا اُن کی تحریرات میں معمولی الفاظ جگہ پاتے تھے۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے اور اُن کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے وہ متوسط الحال گھرانوں کے حال سے بخوبی واقف ہوگئے تھے۔ یہی دو چیزیں اُن کا کمال تھیں اور انھیں دو چیزوں کی بدولت وہ کامیاب ادیب بن گئے۔ چونکہ قدرت کا منشا تھا کہ وہ اس قسم کے افسانہ نویس ہوں اس لئے قدرت نے اُن کے ساتھ فیاضی نہیں برتی، اور اُن کو مفلس گھرانے میں پیدا کیا۔ شاید وہ کسی امیر کے یہاں پیدا ہوتے تو اپنی زندگی اچھی بُری طرح گزار کر مرجاتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ دھنپت رائے کوئی شخص تھے۔ یہ اسی افلاس اور مصائب کا نتیجہ تھا کہ دھنپت رائے سے وہ منشی پریم چند ہوگئے، ایسا نام جس کی عظمت اور جس کی محبت ہم سب خدمتگزارانِ اُردو کے دلوں میں جاگزیں ہے۔

پریم چند اور علّامہ یوسف علی

علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب سابق ممبر انڈین سول سروس نے لندن سے ایڈیٹر 'زمانہ' کے نام ایک خط مورخہ ۱۰- اپریل ۱۹۱۶ئہ میں لکھا تھا کہ آپ نے منشی پریم چند کی جو کتابیں میرے پاس بھیجیں اور اُن کے حالات زندگی کی جو تفصیلات لکھیں اُن کے لئے میں آپ کا بہت شکرگذار ہوں۔ جب آپ کی اُن سے ملاقات ہو تو میری طرف سے اُن سے کہدیجئے گا کہ میں اُردو میں اُن کے طرز تحریر کا بڑا مدّاح ہوں۔ اگر وہ مجھے مشورہ کی اجازت دیں تو میں کہونگا کہ اُنھیں ایسے ناول اور قصّے لکھنا چاہیئے جن سے قومی جذبات کی نشو و نما میں مدد ملے، مگر جو فوق العادت واقعات سے پاک ہوں۔"

پریم چند

ایک اِنسان و مصنف کی حیثیت سے

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

بیس سال سے بھی پہلے کی بات ہے کہ جب میں نے پریم چند کو پہلی بار دیکھا تو میور سنیٹرل کالج الٰہ آباد میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء کے موسم گرما کی ایک شام کو ہماری ملاقات ایک وسیع عمارت کے برآمدے میں ہوئی جس میں اب امپیریل بنک کی شاخ گورکھپور کا دفتر ہے۔ مجھے اُس وقت دُہری خوشی ہوئی تھی، ایک مسرت تو پریم چند سے پہلی بار ملاقات کی تھی۔ اس پر اس خبر سے کہ اب مستقل طور پر میرے مکان کے پاس ہی وہ قیام پذیر ہوں گے مزید خوشی حاصل ہوئی۔ بہرکیف جس ملاقات کی اس [illegible] ابتدا ہوئی اُس نے جلد ہی ایک گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی جس کا سلسلہ صرف اُن کی نا وقت اور افسوسناک موت ہی کے بعد ٹوٹا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اس پہلی ملاقات کے دن مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اتنے دنوں تک نہ ملنے سے مجھے کوئی نقصان ہوا ہے۔ میں پانچ چھ سال پہلے ہی سے جب میری عمر دس بارہ سال کی تھی پریم چند کے نام سے غائبانہ محبت کرنے لگا تھا۔ اِس لئے اب جب اُن سے دُو بدُو ملاقات کی نوبت آئی مجھے اس بات پر دلی افسوس ہوا کہ میں اتنے دنوں تک اُن سے ملاقات کئے بغیر کیوں رہا۔ میں اسکول ہی میں پڑھتا تھا جب میں نے اُن کی پہلی کہانی "زمانہ" میں پڑھی تھی لیکن اُس کا اثر اب تک محو نہ ہوا تھا۔ گھریلو زندگی کے سین اور بیانیہ نثر کی پُرتاثیر قوت جس کی بدولت روزمرّہ زندگی کے مانوس اور معمولی مناظر متشکل ہو کر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ میرے نئے ایک نیا ذہنی تجربہ تھا، گو میں اُس وقت سنِ تمیز کو بھی نہ پہونچا تھا لیکن مجھ پر اُس سیدھی سادی کہانی کا ایک عجیب نرم و نازک اثر پڑا۔

پریم چند کے یہاں میری روزانہ کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہر روز

میری شام اُن کے ساتھ بسر ہونے لگی، جو وقت اُن کے لطف صحبت میں گذرتا تھا وہ بڑا سکون بخش، سُبک سیر اور تیز رو ہوتا تھا، آج جب میں اُن اوقات کا خیال کرتا ہوں تو اُن کی پُرخلوص انسانیت، اُن کے زندگی کا اطمینان بخش پُرسکوت توازن، اُن کے اعلیٰ تخیل اور کمالِ فن کی یاد میرے حافظے میں ابھی تک باقی ہے۔ پریم چند طبعاً بہت سادگی پسند تھے۔ اُن کے مزاج میں نام کو بھی بناوٹ نہ تھی۔ اب میں ذہنی حیثیت سے ایک نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بالکل نامحسوس طور پر اُن سے اس قدر جلد ایسا بے تکلف ہو گیا۔ میں کیا دراصل ہر شخص جسے اُن سے معمولی سے معمولی تعارف ہوگا اپنی جگہ پر یہی محسوس کریگا۔ آج میں ایک ایسے دوست کا ماتم کر رہا ہوں جس کی ذات سے خود دوستی کو عزت حاصل تھی۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اُن سے پہلی دفعہ ملنے کے بعد مجھے اس بات کا افسوس ہوا تھا کہ میں پہلے اُن سے کیوں نہ مل سکا۔ آج میں اُن کے پُرانے دوستوں میں اپنے کو تنہا پاتا ہوں البتہ "زمانہ" کے نامور ایڈیٹر منشی دیانراین نگم کو مجھ سے بھی زیادہ دنوں سے پریم چند کو جاننے کا فخر حاصل ہے اُن کا غم اور اُن کا نقصان مجھ سے بھی سوا ہے۔

ہماری گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی اور ختم ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ پریم چند کا دماغ بڑا متجسس اور مشتاق تھا! مگر ہماری بات چیت زیادہ تر زندگی اور ادب کے مسائل کے متعلق ہوتی تھی۔ پریم چند میں خودبینی نہ تھی، یہاں تک کہ جب اُن کی تصانیف کی عالمگیر مقبولیت اور لاکلام عظمت کا ذکر اُن کے سامنے کیا جاتا تھا تو وہ گھبرا سے جاتے تھے۔ انھیں اپنے متعلق بات کرنے کی عادت نہ تھی اور نہ بار بار کسی اور سے اپنی تعریف سننے کے آرزومند رہتے تھے۔ حالانکہ "اعلیٰ دماغوں کی یہ آخری کمزوری" اہلِ قلم اور صاحبانِ فن میں بھی ناپید نہیں ہے، لیکن بات چیت کی رو میں کبھی کبھی نامعلوم وقفوں کے بعد اور بالکل غیر مربوط طریقہ پر وہ اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے واقعات کو اشارتاً بیان کر جاتے تھے۔ یوں تو وہ اپنے متعلق مشکل سے صرف چند ہی جملے کہتے تھے لیکن چند لفظوں ہی میں خدا معلوم کتنا بیان کر جاتے تھے۔ میں اُن واقعات کو کسی قدر ترتیب کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرونگا۔

پریم چند کے والد نے ضلع بنارس کے موضع پانڈے پور میں تھوڑی سی کاشتکاری وراثتہً پائی تھی وہی اُن کا آبائی وطن تھا جہاں پریم چند نے ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان

بنالیا ہے۔ کاشتکاری کی آمدنی قریب قریب نہ ہونے کے برابر تھی۔ اِس لئے اُن کے باپ نے ڈاکخانہ کی نوکری کرلی تھی جہاں ترقی کرکے غالباً وہ کسی چھوٹے سے ڈاکخانہ کے ڈاک منشی ہوگئے۔ اس طرح اُن کا گھر اور خاندانی روایات اوسط طبقہ کے اُس درجہ کی روایات کا نقشہ پیش کرتے ہیں جسے انگریزی مصنف جارج گسِنگ (GEORGE GISSING) نے اپنے اوراق میں غیرفانی بنادیا ہے۔

اِس طبقہ کے دوسرے لڑکوں کی طرح پریم چند بھی ایک ہائی اسکول میں داخل ہوگئے اور اُن کی تعلیم ابتدائی درجوں کو چھوڑ کر گورکھپور کے ایک اسکول میں شروع ہوگئی جہاں اُن کے والد ملازم تھے۔ پریم چند نے مجھ سے بتایا کہ لڑکپن میں اُن کی دوستی اپنے درجہ کے ایک لڑکے سے ہوگئی جو ایک تمباکو فروش کا بیٹا تھا۔ روزانہ وہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اُس کے مکان پر جاتے تھے۔ وہاں تمباکو کے بڑے بڑے سیاہ پنڈوں کے پیچھے تمباکو فروش اور اس کے احباب بیٹھ کر برابر حقّہ پیتے اور "طِلسم ہوشربا" پڑھتے تھے۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی طولانی کہانی ہے جو اپنی طوالت، وسعت اور مختلف النوع قصّوں کے لحاظ سے یورپ کے عہدِ وسطیٰ کے رومانی افسانوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی طوالت کا یہ حال ہے کہ اُس کا حجم کم و بیش "انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا" کے برابر ہوگا۔ غرض یہاں پریم چند اپنے کمسن دوست کے ساتھ بیٹھ کر "طلسم ہوشربا" کے افسانے سنتے، یہاں تک کہ شام ہوجاتی جب وہ اپنے گھر چلے جاتے۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا لیکن اسی اثناء میں پریم چند ہمیشہ کے لئے رومانی کہانیوں میں ڈوب گئے۔ درحقیقت ان قصوں کو جس دلچسپی اور اشتیاق سے اُنہوں نے سُنا تھا اُس سے اُن کے قوتِ بیان میں روانی اور وضاحت کے انداز جذب ہوگئے اور ان لذیذ حکایتوں کی رُوح اُن میں تحلیل ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد یہی قوتیں پریم چند کی تصانیف میں کس حُسن سے پھلی پھولیں۔

پریم چند کے والد کا انتقال اُس وقت ہوا جب اُن کی عمر مشکل سے چودہ سال کی ہوگی۔ اُس وقت وہ بنارس کے ایک ہائی اسکول میں آٹھویں یا نویں درجے میں پڑھ رہے تھے۔ اُن کی ماں تقریباً آٹھ سال پہلے مرچکی تھیں۔ پریم چند اپنے سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کے ساتھ اِس دُنیا میں تنہا رہ گئے۔ دونوں ان کے بعد بھی بقید

حیات ہیں۔ اب انھیں زندگی کے سخت ترین امتحان اور بے انتہا تکلیف دہ آزمائش سے گذرنا پڑا۔ پریم چند نے اپنے ایک افسانہ میں پُراثر اور زہر میں بجھے ہوئے نشتر کی طرح الفاظ میں اپنی زندگی کے اُن لمحات کی طرف اشارہ کیا ہے جو انہوں نے اپنے والد اور سوتیلی ماں کے ساتھ بسر کئے اور جس وقت اُن کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس افسانہ کا عنوان "سوتیلی ماں" ہے اس کی نزاکت اور عظمت میں خاموش مگر تیز تلخیاں بھی ہیں۔ لیکن کہیں اس میں بے مزہ اور اوچھے جذبات کی ترجمانی نہیں ہے اسے پڑھئے مشکل سے آپ اپنے آنسو روک سکیں گے۔

باپ کے مرنے کے بعد پریم چند کو طالب علمی کے زمانہ میں کام کی جستجو ہوئی اُن نایاب لمحات میں جب وہ مجھے اپنا رازدار بنا لیتے تھے۔ اُنھوں نے ایک دفعہ نہایت سکوت افزا لہجہ میں۔ جس میں ایک خفیف سی لرزش بھی تھی، مجھ سے بتایا کہ کس طرح وہ چھ روپیہ مہینہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے تین میل پیدل پڑھانے جایا کرتے تھے۔ یہ میری یادداشت کا نمایاں مگر دردناک واقعہ ہے۔ کم سے کم ایک بار اُن کے اتفاقیہ مگر سنجیدہ بیان میں سختی و نرمی دونوں ایک ساتھ مل گئی۔ مگر یہ کتنا معصوم اور فطری واقعہ تھا! پریم چند کا شمار بہت تندرست لڑکوں میں نہ تھا۔ اس لئے محنت کرکے اور ریٹ کاٹ کر اُنھوں نے ہائی اسکول کا امتحان دوسرے درجہ ہی میں پاس کیا۔

زیادہ دن نہ گذرے کہ وہ سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ اب پریم چند آسانی سے اپنا اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کا بار اُٹھا سکتے تھے، اُن کی شادی بھی ہو چکی تھی لیکن وہ نہایت ناموزوں اور ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ بیوی سے الگ رہ کر کئی سال تک تن تنہا دن گذارتے رہے مگر اُس کے مرنے تک (جسے تقریباً پندرہ سال ہوئے) مستقل طور پر کچھ روپیہ خرچ کے لئے بھیجتے رہے۔ اسی درمیان میں ایک بیوہ خاتون، شیورانی دیوی سے شادی کر لی، یہ باہمّت اور وفا پرست رفیق حیات اُن کے تین بچوں، ایک لڑکی اور دو لڑکوں کی ماں بنی اور خوشی کی بات ہے کہ آج وہ اور اُن کے تینوں بچے موجود ہیں۔ مرحوم کے ہزارہا قدردانوں اور محبت کرنے والوں کی ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں ایک بیوہ عورت سے دوسری شادی اپنی دلی کیفیات کا پورا جائزہ لینے کے بعد خاموشی سے کی گئی تھی۔ یہ

منشی پریم‌چند (زمانہ تندرستی میں)

شادی کسی خاص جذبہ کا نتیجہ نہ تھی اور نہ ہم اسے عاشقانہ شادی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ رشتہ اُن کے لئے ایک دلیرانہ قدم تھا گو اس میں کسی قسم کا جوش و خروش شامل نہ تھا۔

سب ڈپٹی انسپکٹری مدارس ہی کے زمانے میں اُن کے افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی، اُنھوں نے چار پانچ افسانے اُردو میں لکھے جو تیس سال ہوئے ایک مختصر سی کتاب کی شکل میں "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوئے۔ پریم چند اور اُن کے متبعین نے اُردو و ہندی زبان میں افسانہ نویسی کو اس بلند مقام پر پہونچا دیا ہے جہاں آج ہم اُسے دیکھتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی بہترین تصانیف کی چمک کی روشنی اُس کتاب کی ہلکی اور دھیمی روشنی کو سایہ میں ڈال دیگی مگر وہ تاریخ افسانہ نگاری میں ایک رفیع نشان ہے۔ وطن پرستی کا شریف جذبہ ان صفحات میں سانس لے رہا ہے، ان کہانیوں میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے لڑکے اور لڑکیوں کی درسی کتابوں میں داخل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن تیس برس پہلے کی دُنیا اور تھی! باخبر اور رخائف عُمّالِ حکومت نے مصنّف سے بازپُرس کی۔ میری اُن کی ملاقات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے جب اُنھوں نے اپنے بے تکلف اور صاف طرز میں مجھ سے بیان کیا کہ انسپکٹر مدارس نے انھیں کس طرح اپنی تصنیف کی پانچ سو جلدوں میں آگ لگا دینے پر مجبور کیا۔

اُن کی تصانیف کا سلسلہ جاری ہو گیا اور اگر میں اُن حالات کا ذکر کروں جن کے ماتحت اُن کی زیادہ تر کتابیں لکھی گئیں تو یہ مضمون اپنے حدود سے بڑھ جائے گا۔ کچھ ناول متوسط حجم کے اُن کے قلم سے نکلے اور انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئے۔ انھیں دنوں میں اُن کے مختصر افسانوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو اُن کے انتقال تک دو سو کی غیر معمولی تعداد تک پہونچ گئے۔

اس مجموعہ کی اشاعت ہندوستانی افسانہ نویسی کی تاریخ میں ایک خاموش انقلاب تھا جس کے تنہا علمبردار پریم چند تھے اور جو صرف اُن کی آواز پر ترقی کرتا چلا جا رہا تھا۔ موجودہ طریقہ تعلیم نے اپنی شان و شکوہ اور چمک دمک کے باوجود ہمیں ایک غیر تعلیم یافتہ قوم بنا رکھا ہے۔ یہ شیریں خواب کہ ہندوستان کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ یا اُس کا چھوٹے سے چھوٹا حصّہ کبھی انگریزی زبان میں کوئی قابلِ قدر چیز لکھ سکیگا۔ یا

انگریزی اور دوسری یوروپین زبانوں کی قدر دانی اور لذت کشی کبھی اُس کا قومی مذاق بن سکے گی، محض خواب اور خیال باطل ہے اس زعم ناحق نے ہم کو اپنی زبانوں میں بھی کوئی قابل قدر تصنیف پیدا کرنے یا اپنے ادب کی قدر دانی کی صلاحیت رکھنے کے قابل بھی نہ رکھا۔ غرض اِن حالات میں پریم چند نے اپنا تخلیقی کام شروع کیا درحقیقت وہ دو دُنیاؤں کے بیچ میں تھے۔ جن میں سے ایک تو مُردہ ہو چکی تھی مگر دوسری کسی طرح پیدا ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ ایک عرصہ تک پریم چند کو وہ اخلاقی سرپرستی اور ہمدردی بھی نصیب نہ ہوئی جو ہمارے سربرآوردہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی کبھی کبھی دیسی زبانوں کے خادمان ادب سے برتتے ہیں۔ وہ اس قابل نہ سمجھے گئے کہ ہمارے اعلیٰ طبقہ کے معززین انھیں اپنے ڈرائنگ روم میں ملاقات کی دعوت دیتے۔ غالباً اُنہوں نے اُن کا نام کہیں سُن لیا ہوگا یا زیادہ سے زیادہ "زمانہ" کی فہرست مضامین میں اُن کے نام پر اُن کی نظر پڑ گئی ہوگی بہرحال یہاں اس معاملہ کو طول دینا فضول ہے۔

پریم چند برابر لکھتے رہے اور اہل نظر کے ایک مختصر سے حلقہ میں اُن کی تصانیف کی قوتِ تاثیر اور خوبیاں مقبول ہونے لگیں۔ لیکن اس سے انھیں کوئی مالی نفع حاصل نہ ہوا البتہ دس سال کے عرصہ میں "زمانہ" کے شائع ہونیوالے افسانوں کی بدولت انہیں اردو افسانہ نگاروں میں مسلم الثبوت استاد کا درجہ حاصل ہوگیا۔

جس پہلی ملاقات کے ذکر سے یہ مضمون شروع ہوا ہے وہ اسی زمانہ میں ہوئی، اب وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں گورنمنٹ نارمل اسکول گورکھپور میں سکنڈ ماسٹر کی حیثیت سے آئے تھے اس اثناء میں اُن کی شہرت اس ملک کے تعلیم یافتہ اور علم دوست طبقہ کے علاوہ باہر بھی اچھی طرح قائم ہو چکی تھی۔ اور اس میں ہر روز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اب انہوں نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور قدر دانان ہندی کے وسیع دائرہ نے اُن کا بڑی تپاک سے خیر مقدم کیا اور انھیں فن افسانہ نویسی کے ماہر سمجھنے لگے۔ ہندی رسالوں اور کتب فروشوں نے اُن کے مضامین اور کتابوں کا معقول معاوضہ دینا شروع کیا۔ اُردو میں اُنھیں جو کچھ ملتا تھا وہ نہ ملنے کے برابر تھا۔ اب اُن کی شہرت ہندوستان کے دوسرے حصوں تک بھی پہونچی اور اُن کی کہانیاں بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل اور دوسری جنوبی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگیں۔ مجھے یہ بھی معلوم

ہوا ہے کہ جاپان میں بعض ہندوستانی اہل قلم نے اُن کی کہانیوں کا جاپانی زبان میں بھی ترجمہ کرکے انھیں وہاں شایع کرایا ہے۔ کچھ دن ہوئے یہ بھی سننے میں آیا کہ مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز پریم چند کی بعض کہانیوں کے انگریزی ترجمہ کی نظر ثانی کر رہے ہیں، جو انگلستان میں شایع ہونے والے تھے۔ بعض احباب نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اُن کے بعض تصانیف کے ترجمے یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیو ہرسٹ (PROF. DEW HURST) نے ایک مرتبہ پریم چند کو لکھا تھا کہ اُن کی تصانیف بہت بلند پایہ اور ہندوستانی ادب کے صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ تجربہ کار عالم و نقاد و ادب مولانا شبلی نے بھی ایک بار یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سات کروڑ مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند کی سی لطیف اور سنواری ہوئی نثر نہیں لکھتا۔ پنجاب کے ہر طبقہ کی عورتوں میں، چاہے وہ کسی راجہ کے محل میں ہوں یا ساہوکار وں کے یہاں، اعلیٰ حکام کے یہاں ہوں یا تجارت پیشہ جماعت کے گھروں میں، پریم چند کی تصانیف پڑھنے کا ایک خاص اشتیاق ہو گیا ہے۔ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ہماری عورتوں کے (جو ابھی تک موجودہ طریقہ تعلیم سے زیادہ مستفیض نہیں ہوئی ہیں) دماغی تجسس کی دھار کُند نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال امر واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ہندی، اُردو پڑھی جا سکتی ہے، خدمتگار، خانساماں، معمولی پڑھی لکھی عورتیں، بچے، گانوں کے مُدرس، زمیندار اور کاشتکار جب کبھی اُن کے ہاتھ پریم چند کا کوئی افسانہ یا قِصّہ لگ جاتا ہے تو وہ سب ہمہ تن متوجہ ہو کر اس میں غرق ہو جاتے ہیں۔

پریم چند اب مستقل طور پر ناول نویسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور قریب قریب ہر سال ایک گرانقدر ناول دنیا کے سامنے پیش کرنے لگے۔ اُن کی ناوقت موت تک کم و بیش اُن کے بیس ناول شایع ہو چکے ہیں۔ میں اُن کی تصانیف کے متعلق ذرا آگے چل کر دو ایک باتیں بتاؤں گا جب میں پہلی دفعہ اُن سے ملا تو وہ ایک مُدرس کی حیثیت سے پرائیویٹ طور پر انٹرمیڈیٹ کا امتحان دوسرے درجہ میں پاس کر چکے تھے اور ۱۹۱۹ء میں جب وہ اپنے حوصلہ خیز ناول "پریم آشرم" (جو اُردو میں "گوشۂ عافیت" کے نام سے شایع ہوا ہے) کے لکھنے میں مشغول تھے تو مدرسی اور سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ہاؤس کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔ اُنھوں نے اِسی دوران میں بلا زیادہ محنت کئے ہوئے دوسرے درجہ میں بی۔ اے کی ڈگری بھی لے لی حالانکہ اُنھوں نے تمام عمر طالب علم کی حیثیت سے کسی کالج میں پاؤں تک نہیں رکھا۔

تھوڑے دنوں بعد پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیدیا، آج وہ یقیناً اپنے محکمہ میں کافی ترقی کرچکے ہوتے اور اُن کا شمار صوبہ کے تعلیمی افسروں میں ہوتا مگر ۱۹۱۹ء کے ترک موالات میں، جب اُن کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ ہوچکی تھی، میرے یو۔پی سول سروس کی ملازمت ترک کرنے کے چند ہفتوں بعد وہ بھی سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے۔ اُس وقت اُن کے پاس کچھ روپیہ بھی جمع ہوگیا تھا۔ کیونکہ اُن کی زندگی نہایت سادہ اور باکفایت تھی، وہ اپنے ابتدائی زندگی میں سختی کے دور سے گذر چکے تھے۔ اور تمام عمر بغیر محسوس کئے ہوئے ایسی فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے جس میں نہ خشکی تھی نہ ایذا طلبی۔ نہ خود پرستانہ پاکبازی تھی اور نہ زاہد خشک کا تعصب۔ یہاں بھی اُن کی معصومیت اور عہد طفلی کی سی سادگی میں دھوکا نہ ہوسکتا تھا اور اسی خصوصیت نے ایک مقناطیسی کشش کی طرح نہایت خاموش اور با اعتماد طریقہ پر مجھے اُن سے بہت قریب پہونچا دیا تھا۔ دراصل اُن کے ملنے والوں میں کوئی شخص اس کشش سے بچ نہ سکتا تھا۔ اُن کی شخصیت میں نرم رَو ہواؤں کی تازگی، دوشیزگی اور اچھوتا پن تھا۔ وہ ہمیشہ انسانیت سے نزدیک اور ظاہر داری سے دُور رہتے تھے۔

انھیں سولہ برس اور زندہ رہنا تھا۔ بنارس میں اُنھوں نے سرسوتی پریس قائم کیا اور اپنے گانوں میں ایک پکا مکان آبائی مکان پر بنوایا، یہیں وہ اپنی زندگی کے باقی دن گذار دینا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہوا اور وہ وہاں مشکل سے تھوڑے دنوں رہ سکے۔ مگر یہ اُن کے مختصر اور اتفاقی قیام کے زمانہ میں یہ جگہ تمام ہندوستان سے اُن کے قدردانوں اور شاگردوں کی آمد و رفت کی بدولت ایک طرح کا مقدس مقام بن جاتی تھی۔ اس جملے کو اگر وہ خود سُنتے تو متعجب اور خوش ہوکر پریشان ہوجاتے۔ ہندوستان میں مضمون نگاری اور صحافت کے ذریعہ کوئی مستقل آمدنی ہونا یا دیانتداری سے اپنی زندگی کے لئے کچھ پیدا کرلینا ناممکن ہے۔ یہاں لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا تھوڑا بہت شوق ہے لیکن کتاب کون خریدتا ہے؟

ترک موالات کے زمانے میں متعدد قومی اسکول قائم ہوگئے تھے۔ چنانچہ پریم چند کو بھی کچھ عرصہ کے لئے کاشی ودیاپیٹھ میں پرنسپل کی خدمت انجام دینی پڑی، چار پانچ سال تک وہ ہندی کے رسالہ مادھوری کے مدیر اعلیٰ بھی رہے اور ایک سال سے بھی کم مدت کے لئے بمبئی کی ایک ہندوستانی فلم ساز کمپنی کے لئے ڈرامے لکھتے رہے جس سے انھیں ہزار روپیہ ماہوار کے قریب

لتا رہا۔ یہ باتیں غیر مسلسل اور بے ترتیب طور پر واقع ہوئیں۔ جب ملازمت کا سلسلہ نہ رہا تو وہ بنا ذاتی پریس چلاتے رہے جس سے اُن کے کئی ناول اور مختصر افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے مگر پریس میں انھیں بالآخر عظیم نقصان اُٹھانا پڑا۔ ایک ہندی ہفتہ وار اخبار کے علاوہ نھوں نے "ہنس" نامی رسالہ بھی نکالا جو اب تک استقلال کے ساتھ شریمتی شیورانی دیوی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ گذشتہ اکتوبر میں دو مہینہ کی سخت اور جانگداز علالت کے بعد اُنکا انتقال گیا۔ میں نے دسہرہ کی تعطیل میں اُن کے آخری دیدار کا ارادہ کیا تھا لیکن اُن کی موت کی بر چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ہی مل گئی!

ملک کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں نے، جن میں اُن کے ادبی رفیق کار اور شاگرد بھی تھے اُن کے گھر جاکر اُن کے علالت کے زمانے میں اُنھیں دیکھا جہاں اُن کی بیوی قابل قدر نت و محبت کے ساتھ اُن کی تیمارداری میں مشغول تھیں۔ ان سبھوں نے پریم چند کو بیماری میں ویسا ہی سادہ دل، معصوم اور خوش مزاج پایا، اُن کے مردانہ چہرے پر آخر تک ے فن کار کی حقیقی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن اُن کی صحت اِس طرح اُکھڑ چکی تھی کہ زندگی کی اُمید باقی نہ رہی تھی۔ پھر بھی وہ بظاہر اپنی بیماری کی اہمیت سے بے خبر رہنا چاہتے تھے۔ اُن کے غ میں اب بھی خیالات کی فراوانی تھی۔ اُنھوں نے نئی تصنیفوں کی کارآمد اسکیموں کا تذکرہ ، اُن کی گفتگو اُسی طرح فطری، پُرجوش اور رواں تھی اور اس میں برابر بذلہ سنجی، سرگرمی ساختگی، تفکر اور لطافت کے اثرات منعکس ہو رہے تھے۔ صرف وہ نہ بھولنے والے بے اختیار ے جو کبھی کبھی چیزوں کا مضحکہ انگیز رُخ دیکھ کر بلند ہوتے تھے اب پہلے سے کم اور کمزور ہو گئے اور معلوم ہوتا تھا کہ تھکا ہوا جسم موت کے پُرسکون آرامگاہ کی طرف جا رہا ہے اور اب وہ بے پروا طفلانہ قہقہوں کے قابل نہ رہا تھا۔ جو اُن کے ملنے والوں کے نزدیک اُن کی شخصیت کا ہو گئے تھے بہرحال وہ کام کرتے ہوئے جئے اور کام کرتے ہوئے مرے اور جب انجام آیا تو اُسی ن اور نرمی کے ساتھ آیا جو اُن کی اکثر کہانیوں کے آخری حصّوں میں نمایاں ہے۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے جب پنڈت رتن ناتھ سرشار کا انتقال ہوا تو جہاں تک مجھے ہے، سر تیج بہادر سپرو نے اپنے گرانقدر اور پُراثر تعزیتی مضمون کے ابتدائی جملوں میں (جو دستان ریویو" میں شائع ہوا تھا) اُس فخر روزگار ادیب کے متعلق لکھا تھا کہ سرشار کا جادو قلم اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ واقعی یہ بالکل درست تھا۔ فسانہ آزاد کی طویل

داستان میں واقعات مکالمہ، ظرافت اور مزاج کا جو سلسلہ تقریباً چار ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے، کوئی سحر آفرینی ضرور ہے لیکن اس میں غیر حقیقی طلسم بندی بھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سرشار نے خوجی کا کیریکٹر سروینٹیز (CERANTES) کی ڈان کوئکزوٹ (DON QUIXOTE) کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ لیکن کوئکزوٹ اپنی مضحکہ خیز افراط و تفریط کے باوجود حقیقی اور شجاعت کی غیر فانی روح کی نمائندگی کرتا ہے۔ سرشار کی تصنیف اپنے مصنف کی ناقابل انکار کمال فن کے باوجود ایسی چیز پیش کرتی ہے جو ظاہری وجود کے اعتبار سے کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے، بلکہ عالم خواب کی ایک نمایاں فلمی عکاسی تھی۔ فسانہ آزاد لکھنؤ کے زوال پذیر اور جلد مٹنے والے شیعہ امراؤ روسا کے مشاغل زندگی کا دلکش مرقع ہے۔ سرشار کی پرسکون ذہانت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زور قلم سے اس سایہ کی طرح غیر حقیقی دنیا کو لافانی بنا دیا ہر ملک اور ہر زمانہ کی رئیسانہ زندگی میں ایک طرح کے غیر حقیقی طلسم کی کشش ضرور ہوتی ہے۔ سرشار نے اسی تکلف و تصنع کی زندگی کے نظر فریب نقوش کو فسانہ آزاد کے صفحات میں اپنی ساحرانہ قلم سے کچھ اس طرح منقش کر دیا ہے کہ ناظرین کے لئے اس کا ہر صفحہ ایک جادو کے محل کی کھڑکیوں کی طرح معلوم ہوتا ہے جو عالم خواب میں کھلتی اور دعوت نظارہ دیتی ہیں۔

"جادو نگار قلم" کا خطاب پریم چند کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہ ہوگا درحقیقت اُن کے ہر صفحہ میں ہندوستانی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کے پہلے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اُن کی کتابوں میں اجتماعی زندگی کے تمام لافانی مستقل و مستحکم تاثرات میں از سر نو روح پڑ گئی۔ ہندوستان کے قدیم تاریخی تمدن اور اس کی طوفان بیداری کی یہ پہلی دھیمی کروٹیں تھیں جو اُن کے قلم سے کہانیوں کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

اِس طرح کی کوئی چیز بنکم چندر چٹرجی، رابندرناتھ ٹیگور، سرت چندر چٹو پادھیا اور دوسرے بنگالی اہل قلم نے بھی دنیا کے سامنے پیش نہیں کی ان سب کے ناول اور کہانیاں اپنی تمام گہرائی اور قوت کے باوجود، زیادہ تر جذباتی، داخلی اور رومانی ہیں اور اکثر اپنی ضرورت سے زیادہ باخبری کی وجہ سے نثر کے افسانوں کا صحیح نمونہ نہیں ہو سکتے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک پریم چند کی تصانیف ہندوستانی افسانہ نگاری میں ایک انقلاب عظیم کی بانی ہیں کیونکہ اُن میں ادبی خصوصیت کے پہلو بہ پہلو ہمہ گیری اور وسعت، توازن اور حقیقت، جوش اور متانت سبھی کچھ موجود ہے۔ وہ جذبات کو پیش کرتے وقت بال کی کھال نہیں نکالتے لیکن اُن کی نثر میں زندگی کی تڑپ موجود ہے

میں پھر ایک دفعہ اپنے خیال کو تیس برس پیچھے لئے جاتا ہوں جب میں نے اُن کی ایک کہانی پڑھی تھی، اُس وقت میری عمر مشکل سے دس بارہ سال ہوگی۔ اُس وقت میں دنیا میں بچوں کے لئے جو ادب موجود ہے اُس کا خیال کرتا ہوں۔ حکیم السیپ کی کہانیاں (ÆSOPS FABLES) اُس سے پہلے کی کتاب ہتوپدیش، الف لیلیٰ، گرم اور انیڈرسن کے حور و پری کے قصے (FAIRY TALES OF GRIMM AND ANDERSON) جی۔ اے ہنٹی (G. A. HENTY) کی تصانیف اور دوسری بہت سی کتابیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے کئی گرانقدر تصانیف ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر میں دھک سے رہ جاتا ہوں کہ ادب کی لطیف رُوح اور رنگینی، حقیقت کی جھلک اور نازک احساسات کا اظہار اور وہ بسی ہوئی تاثیر جو پریم چند کے یہاں ملتی ہے، ان سب میں مفقود ہے۔ ادبیات کی یہ لطافت اور انفعال، حقیقت اور خارجیت کا امتزاج، ہمیشہ نظم و نثر کی اُن تصانیف میں دیکھنے کی توقع کی جاتی ہے جو اعلیٰ تربیت یافتہ لوگوں کے لئے لکھی جاتی ہیں یہ صفات شاذونادر ہی بچوں کی کتابوں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر پریم چند کی کم و بیش پچاس کہانیاں ایسی ہیں جنھیں بچے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اور اُن کی لطافت اُنھیں متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان کے حساس دِل کو غور و فکر کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اور بچوں کے نیم شعور دماغ میں عجیب جذبات کی تحریک کرتی ورگذرے ہوئے واقعات کی یاد دلاتی ہیں۔ دُنیا کے ادب میں اِس طرح کی کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔ اُن کے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد میں ایک طرح کی جاذبیت، بے نظیر سادگی، روانی اور خیالات کے سچے نقوش ملتے ہیں۔ ہزار ہا جگہوں پر اُن کے قلم کا ہلکا سا لمس س قدر پُر اثر ہوتا ہے کہ وہ اصلی ادب اور ہندوستان کے عالمگیر کشش رکھنے والے تمدن کا نقشِ دام بن جاتا ہے اُسی میں اُس خاموش اور گہرے اثر کا راز پوشیدہ ہے جو اُن کی تصانیف، ہر ھنے والے اور ہر ہندوستانی پر ڈالتی ہیں (خواہ وہ کسی عمر کا ہو اور ذہنی ارتقار کی چاہے س منزل پر پہونچ چکا ہو) اُن کی تصانیف میں سرزمینِ ہند کی امرت میں بسی ہوئی رُوح ہے س سے ہندوستانی زندگی کی نشو و نما ہوئی ہے اور جس سے خود اُن کی تصانیف پھولیں پھلیں، بڑھیں ر لہلہائیں۔

اُن کے مختصر افسانے یکساں طور پر کامیاب نہیں ہیں، بہت سے عجلت اور روا روی میں ے گئے ہیں۔ کئی ایک ایسے بھی ہیں جن میں مصنف کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کا کارنامہ

بہت عظیم الشان ہے۔ انہوں نے ہندوستانی زبان کو مختصر افسانہ نگاری کے مخصوص فن سے آشنا کرایا اور اُس بے نظیر بیانیہ طرزِ تحریر کا نمونہ پیش کیا جو فرانسیسی نثر کے محاسن ظاہری اور ضرورت سے زیادہ چچا تلا پن، اور جرمن نثر کی آورد اور اُلجھے ہوئے طرزِ بیان سے پاک ہے اُن کی نثر نرم، رواں، سلیس، وقیع اور مستحکم ہے، ان کا طرزِ تحریر ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ اُن کے مذاحیہ اور المیہ اشاروں میں بھی وہی سلامت رَوی اور اثر ہے جو اُنکی تحریر کی جان ہے۔ اُنہوں نے ہندوستانی زبان کو پہلی دفعہ ایسے حکیمانہ اقوال اور نکات سے مالا مال کر دیا جن کا مجموعہ خود ایک وقیع کتاب بن جائیگا۔

اُن کی عظمت اُن کے ناولوں کے بعض ٹکڑوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالباً ناول کی پیچیدگی اور فنی دشواریاں، مختلف حصّوں کا مرکزی اِتحاد اور دَر و بست جو کامیاب ناول کے لئے ضروری ہے اُن کا مرکزِ کمال نہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اُردو اور ہندی کے سب سے بڑے ناول نگار تھے اور اُن کا شمار ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دو چار بہترین ناول نویسوں میں تھا۔ مختلف ضخامت کے ناولوں کے بعض ٹکڑے جن کی تعداد بہت ہے اُن کے ماہرِ فن ہونے کا بہترین ثبوت ہیں۔ اور اُنھیں میں وہ اپنی بہترین کہانیوں سے بھی زیادہ بلند ہو جاتے ہیں یہ ٹکڑے اِلہامی انداز میں لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور غیر فانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک گرانقدر ماہرِ فن کے ادھورے کارنامے معلوم ہوتے ہیں یہیں پریم چند آسمان کے تارے توڑلاتے ہیں! رنگ بھومی یا "چوگان ہستی" کے ابتدائی صفحات بے تکلفی، زندہ دلی، سادگی، روانی، اور ایسی فضائیں پیدا کرتے ہیں جن معنویت کا مقرآئینی ہی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس ناول اور اُن کے دوسرے ناولوں میں تھوڑی تھوڑی دُور پر ایسے صفحات ملتے ہیں جو صرف ایک بڑی ہستی کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ وہ اپنے اکثر ناول کافی غور و فکر کے بعد بڑے زور میں شروع کرتے تھے۔ مگر بعض اوقات اُن کا چمکتا ہوا تخیل کچھ دُور پر ماند پڑ جاتا ہے مگر تھوڑے سے وقفہ کے بعد پھر شروع ہو جاتا تھا۔

پریم چند کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات میں ایک چیز خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جسے میں صرف ایک "عجیب مشکل" کے نام سے پکار سکتا ہوں۔ اپنے ملک کے تمام اُن لوگوں کی طرح جنھیں ہندوستان کے موجودہ ادب سے کچھ بھی دلچسپی ہے، میرا ذاتی رُجحان بھی خالصتاً شعر و شاعری تک محدود تھا اور ابتدا ہی سے مجھے اُمید تھی کہ پریم چند بھی اُردو شاعری کا بہترین نمونہ پیش کریں گے

اُسی طرح مشتاق اور گرویدہ ہوں گے۔ اگرچہ وہ تغزل سے بسے ہوئے اشعار کی کشش سے بالکل غیر متاثر نہ رہتے تھے تاہم اُنھیں سُن کر وہ بے اختیار بھی نہ ہو جاتے تھے۔ مجھے اس بات سے ہمیشہ ایک حسرت انگیز اُلجھن سی پیدا ہو جاتی تھی۔ کیونکہ اُن کی ملاقات کے ابتدائی دور میں دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بھی یہی یقین تھا کہ اُردو ادب کی عظیم ترین چیز غزل ہی ہے، جمالیاتی نثر خصوصاً ناولوں اور افسانوں کی نثر میرے نزدیک بہت ہی بے اصل شے تھی۔ بہرحال میرے لئے پریم چند کا شاعری سے مستقل طور پر غیر متاثر رہنا ایک معمّہ تھا۔ میں اُنھیں ادبی تنقید اور جمالیات کی نزاکتوں کا بھی کچھ زیادہ مشتاق نہ پاتا تھا۔ اس موضوع میں وہ ابتدا ہی سے میرا شغف دیکھ کر مجھے وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے جس سے مجھے ایک طرح کی دلی مسرت ہوتی تھی۔

وہ باقاعدہ مطالعہ کے بھی عادی نہ تھے۔ لیکن یہ تو صرف چند ہی بڑے مصنفین کا وطیرہ رہا ہے غرض پریم چند کسی خاص اصول کے ماتحت کبھی کتابیں نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اور انھیں زیادہ تر انھیں کتابوں اور ناولوں سے دلچسپی ہوتی تھی جو رسم و رواج و روایات، تاریخی واقعات اور زندگی کے دوسرے نقوش سادہ اور مانوس طریقہ پر پیش کرتی تھیں۔ اس میں بھی وہ اپنے طلب و تحقیق اور ذوقِ ادب کا بھی پتہ دیتے تھے۔ خواہ وہ پُرانی باتوں، ناخوشگوار واقعات، گذشتہ روایات اور ماضی کی لڑائیوں کا بیان ہو (آلہا: رانی سارندھا اور روٹھی رانی پڑھیئے) یا صرف روزمرہ کی چیزوں، مثلاً فطری غم، تکلیف یا نقصان کا ذکر ہو جو دُنیا میں پہلے بھی ہوئے اور آیندہ بھی بار بار ہوتے رہیں گے یہ سب پریم چند کے لئے ایک مانوس تجربہ اور حیرت خیز عالم بن جاتے تھے۔ لیکن اس پر بھی میں دل ہی دل میں حیرت کیا کرتا تھا کہ شاعری سے اُن کی رُوح میں گرمی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ اس معمّہ کا ایک حل سا میری سمجھ میں اُس وقت آیا جب میں اُن کے انتقال کے بعد اپنے ایک دوست اور ہندوستان کے ایک قابل قدر فرزند کے کم ہو جانے پر غور کر رہا تھا۔ اُس وقت یکایک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نثر نگاری کے ماہرین کامل شاذونادر ہی شاعری کے پُرجوش قدردان رہے ہیں، بیکن (BACON) جانسن (JOHNSON) ہیزلٹ (HAZLITT) کارلائل (CARLYLE) رسکن (RUSKIN) کو دیکھئے وہ لوگ کبھی تغزل اور رس سے بھری ہوئی شاعری کے قبضہ میں نہیں رہے اور دُنیا کے نہ صرف بڑے بڑے ناول نگار بلکہ ڈرامہ نویس اور بیانیہ شاعر کبھی محض غزل اور جذباتی شاعری کے زیر اثر نہیں ہوئے۔ کیا ورڈسورتھ (WORDSWORTH) جو ایک بہت بڑا جذباتی شاعر تھا، شیلی (SHELLEY) کی شاعری سے لے کر شیلی اُس کی شاعری سے بدمزہ ہو جاتا تھا؟

جو کچھ ہو جذباتی شاعر شاذ ہی کبھی ایک طرح کے فاسدانہ خود بینی سے محفوظ رہ سکتا ہے، اور پریم چند جذبات پرست اور خود پسند انسانوں میں نہ تھے۔ قریب قریب اُن کی ہر تصنیف میں ایک صحت بخش وسعت اور خارجیت ہے جس کی بدولت وہ اپنے موجودہ پلاٹ اور کیریکٹروں سے نکل کر تاریخ ہند کے پانچ ہزار سال پُرانے تمدن تک پہونچ جاتے ہیں۔

اُن کے افسانے اپنے ظاہری حدود سے بہت بڑے ہوتے ہیں، اُن میں ایک تاریخی تہذیب کا احول اور رنگ ہے۔ اُن کی کتابیں ہمیں اُن زندہ دوروں سے روشناس کراتی ہیں جو تاریخ کی ابتدا سے شروع ہوئے اور جن میں اب بھی شباب کی تازگی موجود ہے۔ جب کبھی ہم اُن کی کوئی کہانی پڑھتے ہیں تو ہم کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کے متعلق ہی نہیں بلکہ خود ہی ہندوستان ہے نہ اُن میں صرف رُومانی اور غیر حقیقی نصب العین کا بیان ہوتا ہے اور نہ ہندوستانی تہذیب کی غیر نقادانہ توصیف۔ اس تمدن کے متعلق وہ بعض اوقات بہت تلخ باتیں کہہ ڈالتے ہیں۔ اُن کی تصانیف اب ایک نئے دور کی طرف گامزن ہو رہی تھیں۔ اُنکی آخری کہانیوں میں زیادہ گہرائی اور تیکھا پن نظر آرہا ہے۔ اُن کا فن نئی قوت حاصل کر رہا تھا کہ مرگ بے ہنگام نے اُسے ختم کر دیا۔ اُن کی طرز تحریر سے ہندوستانی ادب کو بڑا فائدہ ہوا ہے اُن کی موت سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے جب کبھی کسی آنے والے زمانے میں اُن کا لائق جانشین آئے گا تو اُس کی پیشانی پر اُس شخص کے سہرے بیداغ اور تازہ سہرا آئیگا جس نے کبھی کوئی ہیٹی بات نہیں کہی۔!

الوداع ! منشی پریم چند ! الوداع !!

فرشتہ خصلت پریم چند

مکرمی حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی بی۔ اے۔ اڈیٹر زمانہ کے نام ایک نجی خط میں لکھتے ہیں:—

"میں کہتا ہوں خدا نے کسی فرشتہ کا نام پریم چند رکھ دیا تھا۔ اُن کی محبت۔ اُن کی بے ریائی۔ اُن کا بھولا پن۔ اُن کی صاف گوئی کن کن چیزوں کو یاد کروں۔ فسانہ نویس ممکن اُن سے لاکھ درجہ اچھے پیدا ہو جائیں ہندی میں بھی اور اُردو میں بھی۔ مگر ایسا انسان ہم کہاں سے لائیں گے۔ ایسے انسان تو صدیوں کے الٹ پھیر میں بھی پیدا نہیں ہوتے۔" حامد اللہ افسر

منشی پریم چند مرحوم

از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔ اے ایل ایل بی،

تھوڑے ہی عرصہ میں دنیائے ادب سے تین مقتدر ہستیاں ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگئیں۔ جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کی وفات سے اُردو وہندی ناٹکوں ونیز ہندوستانی اسٹیج واسکرین پر اوس پڑ گئی علامہ برق دہلوی کی رحلت کا سانحہ فراموش نہ ہونے پایا تھا۔ کہ اُردو ہندی اَدب کی جان منشی پریم چند صاحب داعی اَجل کو لبیک کہہ گئے۔ جس طرح آغا صاحب مرحوم ڈرامہ نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اسیطرح ناول وافسانہ میں منشی جی ملک میں جواب نہ تھا۔

عجب اتفاق ہے۔ کہ لاہور میں نیشنل سووی ٹون کے اسٹوڈیو میں جناب حشر سے آخری ملاقات کے بعد راقم واپسی میں دہلی میں برق صاحب مرحوم کا نیاز حاصل کرکے بریلی واپس آیا اور اس کے بعد پھر کبھی یہ صورتیں دیکھنے کو نہ ملیں۔ اُسی دوران میں منشی صاحب مرحوم سے بھی شرف ملاقات نصیب ہوا۔ آپ کانگرس کے ایّام میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی صدارت کے لئے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ افسوس جس طرح مذکورہ دونوں ملاقاتیں آخری ثابت ہوئیں ٹھیک وہی حشر اس تیسری صحبت کا بھی ہوا۔

لکھنؤ میں جن حضرات نے منشی جی کو دیکھا ہوگا اُن میں سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی داغ مفارقت دے جائیں گے۔ اُس وقت اُن کی صحت بظاہر خاصی نظر آتی تھی۔ مگر جب وہ بریلی آئے تھے تو صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ اب وہ ایک نحیف وزار اور ایک مختصر سے انسان نظر آتے تھے۔ لیکن ایسی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا کہ اتنا بڑا افسانہ نگار عنقریب ہی خود افسانہ بنکر رہ جائے گا۔

مرحوم کی زندگی ہر اعتبار سے نہایت قیمتی اور مصروفیت کی زندگی تھی۔ وہ قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں نمایاں حصّہ لیکر رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہتے تھے۔

ادبی حیثیت سے ہم منشی پریم چند کی زندگی کو چار مختلف شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:-

(۱) پریم چند بحیثیت ادیب وافسانہ نگار (۲) پریم چند بحیثیت ناول نویس (۳) پریم چند بحیثیت ڈرامہ نگار (۴) اور پریم چند بحیثیت اخبار نویس۔

منشی جی کی ابتدائی زندگی عام کالیستھ نوجوانوں کیطرح سرکاری ملازمت سے شروع ہوئی ہے۔ جس کا

جو معاشی ضروریات نے جبراً ان کے گردن پر لادو دیا تھا چنانچہ وہ کچھ عرصہ تک اسکول ماسٹر کی حیثیت سے ملک و قوم کی خاموش خدمت کرتے رہے۔ لیکن مہاتماجی کی قومی تحریک نے اُن کے قلب کو کچھ ایسا گرمایا کہ ملازمت کے قید و بند سے آزاد ہو کر مادرِ وطن کی سچی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اور آخری دم تک اسی دُھن میں لگے رہے۔ ترک ملازمت کے بعد منشی جی کٹر ستیاگرہی بن گئے۔ اور اپنی چند روزہ زندگی سے صفحۂ ہستی پر یہ حقیقت منقوش کر گئے کہ علم و ادب کی حقیقی خدمت کے لئے جس روحانی آزادی اور بے باکی کی ضرورت ہے وہ حرص و طمع اور مادی منفعت کی سنہری زنجیروں میں جکڑی نہیں جاسکتی۔

منشی جی کی علمی قابلیت مسلمہ تھی۔ اُن کے تبحر و ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ صفحہ کے صفحہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے اور جس موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے اُسے وہیں ختم کر دیتے تھے۔ اور کہیں کہیں ایزاد و اضافہ کی گنجایش باقی نہ رہتی تھی۔ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی وہ کبھی کسی کا دل دکھانا پسند نہ کرتے تھے۔ اور نصیحت کی تلخ سے تلخ گولیوں کو شیریں کلامی کا قند اور ظرافت کی چاشنی چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ صاحبِ وضع۔ حلیم الطبع اور سنجیدہ مزاج بزرگ تھے۔ صُلح کل اور آزاد منش تھے۔ ادبی مذہبی رواداری اُنکی خو تھی۔ اور اسدرجہ بے لوث واقع ہوئے تھے کہ کبھی اپنے دامن کو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے دھبّوں سے ملوّث نہ ہونے دیتے تھے۔ غرض خوبیوں کا خوبصورت مجسّمہ اور نیکیوں کا معصوم پتلا تھے۔

منشی جی کی اخلاقی بلندیوں کا اندازہ اُن کے معاصرین کی پست مذاقی کی اس ایک مثال سے بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ منشی جی کے مختصر افسانوں اور ناولوں سے اُردو اور ہندی زبانوں کی دنیائے ادب میں عالمگیر ذہنی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اور انکی غیر معمولی کامیابی دیکھکر بہتوں نے ان کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایسے کامیاب افسانہ نویسوں کی کمی نہیں ہے جو منشی جی کے رنگ میں ڈوبکر اُبھرے اور دُرِ مقصود اُن کے ہاتھ لگا۔ مگر بعض ایسے فرعونِ بے سامان بھی ہیں جو بزعمِ خود اپنے کو منشی جی کا مدِ مقابل سمجھتے ہیں۔ مگر بلا تکلف مرحوم کے چمنستانِ فکر سے گل و بوٹے چننے کے لئے سرقہ کے اندھے کنوئیں میں غوطہ زن رہتے ہیں۔ لیکن چوری کا علم و یقین ہوتے ہوئے بھی منشی صاحب نے کبھی کسی سے مواخذہ نہیں کیا۔

منشی پریم چند صاحب کے ایک مشہور افسانہ کی ابتدا اس طرح پر ہوتی ہے:۔ "لال مرچ دیکھنے میں کسقدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے لیکن . . . . وغیرہ" بعینہ یہی الفاظ بلا کسی رد و بدل کے ہمیں ایک دوسرے مصنف کے افسانہ کے دیباچہ کی زینت بنے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کی صرف ایک نہیں بلکہ سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن ان کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔

آدمی کا کریکٹر اور اس کی بزرگی اسکی مصروفیات سے بھی مترشح ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے منشی جی کی

زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے اُن کی اور ان کے کام کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) منشی جی بہ حیثیت افسانہ نگار ان کی ادبی زندگی کی ابتدا اُردو کے افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوئی تھی اس میدان میں انھیں اسقدر کامیابی ہوئی کہ بلاشبہ انھیں اس صنفِ ادب کا استاد ماننا پڑیگا۔ ہندی میں بھی اُن کی کہانیاں دیگر مصنفین کے لئے مشعل ہدایت بنی ہوئی ہیں۔ اُردو میں تو افسانہ نگاری کی ابتدا ہی منشی جی کی مختصر کہانیوں سے ہوتی ہے۔ لیکن ہندی میں اُن سے پہلے بھی مختصر افسانے لکھے جاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ہندی پر بنگلہ زبان کا بہت کچھ اثر ہے اور اس کا دامن بنگالی ادبیات کے تراجم سے لبالب ہو رہا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ بنگلہ زبان کے افسانے تمام ہندوستانی زبانوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھیں افسانوں کی دیکھا دیکھی ہندی میں بہت سی مشکور و نامشکور کوششیں ہوئیں اور یہی بنگالی کہانیاں منشی جی کی افسانہ نویسی کی بھی محرک ہوئیں۔ ہندی میں منشی جی کے ہمعصر پنڈت بشمبر ناتھ کوشک اور جے شنکر پرشاد ہیں۔ بعض لوگ پنڈت مہاویر پرشاد دویدی سابق ایڈیٹر رسالہ سرسوتی الہ آباد کو ہندی کا اولین نثر نگار بیان کرتے ہیں۔ بہرحال اسوقت منشی جی کے سامنے کسی دوسرے کا چراغ نہ جل سکا۔ اور ہندی میں بھی اس صنفِ ادب میں اُنکی کہانیوں سے چار چاند لگ گئے۔ منشی جی کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہماری روزمرہ زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ اور اس کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو پیش کر کے ہمارے دلوں پر لافانی نقوش مرتسم کر دیتے ہیں۔ انکا ہر افسانہ ڈرامیٹک اور اسدرجہ جامع ہوتا ہے کہ کوزہ میں دریا کو بند کر دینے کی اس سے بہتر مثال نہیں ملسکتی۔ انکا مخصوص طرز بیان ہے۔ کہ جو بیک وقت سادگی و رنگینی سے ہمدوش اور تصنع سے خالی و عاری رہتا ہے۔ اُن کی ہر کہانی واقعات کی خشک تشریح کے بجائے جذبات کی دلدوز ترجمانی کرتی ہے۔ اُردو کا ایک شاندار افسانہ جو منشی جی کے قلم سے نکلکر مقبولِ عام ہوا۔ "خوفِ رسوائی" ہے جو ادیب الہ آباد میں شائع ہوا۔ من حیث المجموع ان کی کہانیاں ٹالسٹائے، ٹیگور، گورکی، لیول، چیخوف، موپاسان، پربھات کمار، جلدھر سین، سیتا اور ہری سادھن مکرجی کے افسانوں کی ٹکر کی ہیں۔ اور ہم انھیں بڑے فخر کے ساتھ بین الاقوامی افسانوی اَدب کے پہلو بہ پہلو رکھ سکتے ہیں۔

منشی جی بہ حیثیت ناول نگار اُردو میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ہندی میں للو لال جی سے جس افسانوی ادب کی ابتدا ہوئی اُسے منشی پریم چند جی نے معراجِ کمال کو پہنچا دیا۔ دراصل اُردو ہندی ہر دو زبانوں میں ایسے طبع زاد طویل افسانوں کا منشی جی سے قبل فقدان تھا جو چارلز ڈکنز، شرت، ٹیگور، ہیوگو، اور ہارڈی وغیرہ کے سامنے رکھے جا سکیں اور جنھیں صحیح معنوں میں ناول کہا جا سکے اور ائمیں کوئی اصطلاحی عیب موجود نہ ہو۔ منشی پریم چند نے اپنی خداداد قابلیت سے اس کمی کو ایک درجن کے قریب ناول لکھکر پورا کر دیا۔ ہندی میں

انکا پہلا ناول پرتیا اور اُردو میں پرتاپ چندر ہے یہ دھنپت رائے کے نام سے (جو منشی جی کا اصلی نام ہے) شائع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تقریباً ایکدرجن ناول منشی جی کے قلم سے نکلے اور سب کے سب مقبول ہوئے۔ انمیں بازارِ حسن یا سیوا سدن (ہندی) اور رنگ بھومی یا گوئے چوگاں (اُردو) خاص طور پر مشہور ہیں۔ لیکن بعض خصوصیات کی بنا پر ہم بازارِ حسن کو منشی جی کی مستقل تصنیف اور شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ قطعاً مجلسی زندگی کا آئینہ دار اور وقتی ہنگاموں کی الجھنوں سے معرّا ہے۔ اس ناول کو کئی زبانوں میں ترجمہ ہونیکا فخر حاصل ہوا ہے۔ علاوہ بریں بازارِ حسن ایک خاص وجہ سے بھی نہایت اہم و وقیع چیز ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اس کی تصنیف کے بعد منشی جی اُردو سے بددل ہو کر ہندی کی ملاحت پر لوٹ ہوگئے۔

ہندوستانی افسانوی ادب پر مغربی زبانوں کا بہت گہرا اثر پڑا ہے جس طرح شرت بابو بنگلہ کے چوٹی کے ناول نگار ہیں اسیطرح منشی پریم چند ہندی اُردو کے بہترین ناول نویس تھے۔ لیکن شرت چندر کا پایہ منشی جی سے قدرے بلند ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ شرت بابو بنگلہ اُردو ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ مشرق کے لاثانی مصنف ہیں اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کے ناولوں کا تقریباً تمام مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور یہی بات ان کی فنی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ باعتبارِ فن شرت بابو اور منشی پریم چند دونوں ہی نے مغربی صناعوں کے چمنستان تخیل کی خوشہ چینی کی ہے۔ شرت بابو کا ضخیم ترین ناول "چرترہ" ہے جو بلاشبہ ہارڈی کے جوڈ دی ابسکیور[1] اور ٹیس[2] کے کیمیاوی اختلاط کا حسین چربہ ہے۔ بنگلہ کے ایک دوسرے ناول "تسوتی"[3] کی بھی یہی کیفیت ہے ٹھیک یہی حال سیوا سدن کا ہے۔ لیکن اس کوشش میں شرت بابو کا دامن جسقدر ملوث ہے منشی پریم چند کا قلم اُسیقدر پاک وصاف ہے۔

بازارِ حسن کی طرح منشی جی کی رنگ بھومی "وینیٹی فیر" (Vanity Fair) کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور ان کی کایا کلپ" پر ہارڈی کی "ریٹرن آف دی نیٹو" کا سایہ پڑ گیا ہے۔ تاہم یہ ایسے بیش بہا نوادر ہیں کہ اُردو وہندی ادبیات میں ہمیشہ کوہ نور کی طرح روشن و درخشاں رہیں گے۔

انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرنا اور اس کے روشن پہلو کو ابھارنا ناول نویس کا اہم فرض ہے۔ اس کے مجلسی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، قومی، انفرادی، اجتماعی اور علمی و تعلیمی مسائل و نکات کو واقعیت کے قالب میں ڈھال کر حل و واضح کر جانا اس فن کی معراج کمال ہے۔ اور یہ تمام باتیں منشی پریم چند کی ہر تصنیف میں موجود ہیں۔ "بڑے بابو" منشی جی کا ایک بہترین مختصر افسانہ ہے اور د

---

[1] JUDE THE OBSCURE [2] YEATS RETURN OF THE NATIVE

[3] راقم الحروف نے تسوتی کا ہندی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کر دیا ہے۔ شائقین ۱۰ سے ۸ رمیں مینیجر آکاش بانی آفس بر سے طلب فرما سکتے ہیں۔ اس کتاب کا ہندی نام بجلی ہے۔

اس لحاظ سے کہ جس موضوع کو انھوں نے اس کہانی میں پیش کیا ہے اگر اور کوئی ہوتا تو فسانۂ آزاد سے بھی زیادہ ضخیم ناول لکھ کر اسے ختم کر پاتا۔ لیکن منشی جی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اُسے چند صفحات ہی میں منقوش کر دیا ہے۔ یہ کام وہ محض جذبات کو نمایاں کر کے کر گئے ہیں۔ اور وہ بھی کس انداز تمسخر کے ساتھ کہ جو درد مند دلوں کو گدگدا کر آنسو بہانے کے لئے کافی ہے۔ یہی مہتم بالشان اختصار اور یہی رنگینئ بیان انکے تمام ناولوں میں موجود ہے۔ اور بذات خود منشی جی کے ماہر نفسیات و ذہنیات ہونے کی بین دلیل ہے۔

کردار نگاری، واقعات کی جدت، تخلیق و ترتیب کے محاسن، مکالموں کی ندرت اور فطرت بشری و نظری کی مصوری، غرض ایسی کونسی بات ہے جس کی منشی پریم چند کے یہاں بہتات نہ ہو۔ آغا حشر مرحوم منشی جی کے بڑے مدّاح تھے۔ اور انکی ہر تصنیف کو بقول خود "طفل مکتب کی طرح گھوٹے لگا لگا کر پڑھا کرتے تھے"۔ مرحوم کی رائے تھی۔ کہ "منشی جی کا ہر افسانہ زندہ اسٹیج معلوم ہوتا ہے اور اس کا ہر کردار منھ سے بولے اُٹھتا ہے۔ اس کی عبارت ایسی پیاری نئی اور نادر تراکیب سے مملو ہوتی ہے کہ قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے"۔

حضرت تماشائی بریلوی اُردو کے مشہور فسانہ نویس ہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ کہ مدیر شعاع نے ان سے اپنے رسالہ کے خاص نمبر کے لئے ایک افسانہ کی فرمائش کی۔ تماشائی اُن دنوں علی گڑھ کالج میں معلّم تھے اور گرمی کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ یہ بات چیت بریلی کے کتب خانہ میں ہوئی تھی۔ تماشائی صاحب نے اس فرمائش کا یہ جواب دیا کہ "منشی پریم چند کے افسانوں کا کوئی مجموعہ مجھے پڑھنے کے لئے دیدیجئے اُسے پڑھکر ہی مجھے افسانہ لکھنے کی سوجھے گی"۔ تماشائی صاحب کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ واقعی منشی جی کے افسانوں میں ایسا ہی زور ہے کہ انھیں پڑھکر خود کچھ لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ راقم الحروف نے بھی ہندی زبان میں چند افسانے لکھنے کی جسارت کی ہے انمیں سے بعض بہترین افسانوں کے لکھے جانے کا باعث بھی منشی پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ ہے۔

12546

منشی جی بحیثیت ڈرامہ نگار | منشی جی صاحب مرحوم کی ہمہ گیری کا تقاضہ تھا کہ انھوں نے اس صنف میں بھی داد کمال دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے "کربلا" لکھ کر اپنے ذوق فن کا ثبوت دیا ہے۔ "کربلا" ادبی حیثیت سے ایک کامیاب چیز ہے۔ اس کے بعد منشی جی نے اس میدان میں جو دوسرا قدم اُٹھایا وہ اسکرین کے لئے دو ڈرامے تھے۔ اجنتہ مووی ٹون نے انھیں پردۂ سیمیں پر چمکایا ہے۔ ان دونوں ڈراموں کا نام "مزدور" اور "شیر دل عورت" ہے۔ "مزدور" پر گورنمنٹ کے کالے قانون کا کلہاڑا چل چکا ہے۔ لیکن "شیر دل عورت" ابھی زندہ ہے۔ مگر منشی جی اپنی تصانیف کی مسخ شدہ صورت دیکھ کر اس مشغلہ سے کچھ ایسے مایوس ہوئے کہ انھوں نے پھر کبھی فلم کے لئے کچھ لکھنے سے توبہ کر لی۔ اور اس طرح ان کی ڈرامہ نگاری کے نہایت مختصر دور کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

منشی جی بہ حیثیت اخبار نویس | ایک فرض شناس اور ایماندار اخبار نویس کے فرائض نہایت اہم ہیں۔ اور ان سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے۔ یہ مشکلات اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہیں جبکہ ایسا اخبار نویس ہندوستان جیسے ماتحت ملک کا باشندہ ہو۔ اخبار نویس کے فرائض کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ بعض حضرات اپنی ہر جا و بیجا حرکت کو بھی اپنا فرض کہہ سکتے ہیں۔ لیکن در اصل فرض وہ ہے جو اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے مستحسن ہو۔ اور قوم کی فلاح و بہبود کے بھی منافی نہ ہو۔ اس طرح اخبار نویس ایک سچا مصلح، ایک سرفروش سپاہی، ایک مہربان استاد اور ایک بیخوف و ہمدرد رہنما ہوتا ہے۔

منشی جی کی اخبار نویسی غالباً رسالہ زمانہ سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد وہ نولکشور پریس میں مادھوری نامی مشہور ہندی رسالہ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اور وہاں سے قطع تعلق ہو جانے کے بعد انھوں نے بنارس سے ہندی کے دو پرچے نکالنا شروع کئے۔ ان میں سے ایک ماہوار رسالہ ہنس تھا اور دوسرا ہفتہ وار جاگرن یہ دونوں پرچے خوب نکلے اور گذشتہ ایام میں تو ہنس ہندی کا بہترین رسالہ بن گیا۔

اخبار نویس کی حیثیت سے منشی جی نے ہماری قومی و مجلسی زندگی کے ہر شعبہ میں جس بے باکی کے ساتھ حصہ لیا وہ قابل ستایش ہے۔ ملک کی سیاسی، مالی، معاشرتی، اور ہر اس تحریک میں جس سے غلامی کی بیڑیاں کٹنے میں امداد مل سکنے کی توقع کی جا سکتی تھی منشی جی نے بلا کسی خوف و خطر کے اپنا ہاتھ ڈالا۔ اور وقتی مسائل و موضوعات پر نوٹ لکھتے وقت انھوں نے کبھی اس بات کی پروا نہ کی کہ اسکا کیا انجام ہوگا۔ اس طرح وہ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر کم و بیش اثر انداز ہوئے۔ آخری ایام میں وہ عوام کی تحریر و تقریر کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہوئے۔ لیکن قضا نے ان کے اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچنے دیا۔

اخبار نویسی بڑے سے بڑے مصنف کو ترجمہ کی پناہ لینے کیلئے مجبور کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ منشی جی پر بھی اس کا یہ جادو چلے بغیر نہ رہا اور انھوں نے مختلف مضامین کے علاوہ بعض کتب کا بھی نہایت کامیاب ترجمہ کیا۔ لیکن ان کی اس قسم کی خدمات سے اردو کے بجائے ہندی زیادہ مستفید ہوئی چنانچہ انکی بدولت ہندی کو "سکھ داس"، "مہاتما سعدی" اور "آزاد کتھا" وغیرہ کے درشن نصیب ہوئے ہیں۔

ہنس و جاگرن کی قلمی معاونت کے سلسلہ میں منشی جی سے جو خط و کتابت ہوئی ہے اُس سے اُن کی زندہ دلی اور بالغ نظری کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ مرحوم کا آخری مکتوب وہ تھا جسمیں انھوں نے اپنی ایک ماہ سے زائد علالت کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد مزاج پرسی و عیادت کے لئے جو عریضہ انھیں لکھا گیا اس کا جواب دینے کی مشیت ایزدی نے انھیں فرصت ہی نہ دی۔

اُردو زبان کے بدنصیب ہندو مصنفین کو جس عالمگیر بے اعتنائی کا شکار ہونا پڑتا ہے اُس کا حال

ئی مرحوم سے پوچھتا تو سمجھتا۔ افسوس منشی پریم چند کی زندگی میں ان کے علم و کمال کی ویسی قدر نہ ہوئی سی کہ ہونا چاہیئے تھی غالبًا اسی مایوسی سے بددل ہو کر منشی جی ہندی کی شیرینی پر ریجھ گئے تھے اور ایک ج سے اُسی کے ہو بھی رہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ مرنے کے بعد اہلِ کمال کی قدر ہوا کرتی ہے۔ اُردو سے تو اسکی اُمید نہیں کی جاسکتی۔

بہرحال منشی جی صاحب موصوف بیش بہا نوادر اور ایک ضخیم ذخیرہ اپنا یادگار چھوڑ کر جنت نشین چلے ہیں۔ یہ سارا ذخیرہ اُن کی عمر بھر کی کمائی اور ملک کی بہترین میراث ہے۔ اب یہ ملک اور قوم کا کام ہے س کی حفاظت کرے یا اُسے زمانہ کی لاابالیوں کے ہاتھوں ضائع ہو جانے دے۔

پریم چند کی خصوصیت

ملک کے نامور ادیب مسٹر سچدانند سنہا سابق ممبر مال صوبہ بہار و حال وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی و ایڈیٹر ہندوستان رِ زمانہ کے نام اپنے انگریزی خط مورخہ ۹ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"ابھی ابھی اخبارات سے محبّ مکرم پریم چند جی کے وفات کی خبر معلوم ہو کر از حد صدمہ ہوا آپ کے پچھلے خط سے مجھے خیال ہوا تھا کہ اب وہ اچھے ہو رہے ہیں۔ اس لئے میں اس افسوس ناک ملال انگیز خبر سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ شمالی ہند کے ادبی دنیا کے لئے پریم چند کی وفات لفظ کے وسیع ترین معنی میں ایک سانحۂ عظیم ہے۔ مرحوم کو ہندوستانی زبان کی دونوں صورتوں (اُردو ہندی) میں یکساں مشق و مزاولت تھی اور اُردو ہندی دونوں میں انھیں یکساں کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ ہندی کے حامی انھیں ہندی زبان کا ایک بہترین مصنف سمجھتے ہیں اور اُردو داں اصحاب انہیں اُردو کے بہترین مصنفین میں شمار کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت شمالی ہند کے شاذ ہی کسی اہلِ قلم کو نصیب ہوئی ہوا اور اس پر جسقدر فخر کیا جائے کم ہے۔ میں ممنون ہونگا اگر آپ اس حادثۂ عظیم میں مرحوم کے غم نصیب اعزا کے ساتھ میرے دلی ہمدردی کا اظہار کردیں۔

مسٹر ممدوح ایک دوسرے خط مورخہ ۲۳ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں کہ گو مجھسے پریم چند سے ایک ہی[1] مرتبہ الہ آباد میں جنوری گذشتہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ جب آپ بھی وہاں میرے ساتھ تھے۔ تاہم مجھے پریم چند کے وفات کا بڑا رنج ہوا ہے۔ میں ہندوستان ریویو میں اُن کے ادبی کارناموں پر ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اخبارات میں جو کچھ اُن کے متعلق لکھا گیا ہے میں نے اسی غور سے پڑھا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوؤں نے عام طور پر انکو بابت ہندی مصنف کے حیثیت سے لکھا ہے۔ اور مسلمانوں نے اُردو مصنف کے حیثیت سے رائے زنی کی ہے۔ میں اُن کی ادبی خدمت کے دونوں پہلوؤں سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل پٹنہ یونیورسٹی کی وجہ سے بہت عدیم الفرصت ہوں۔

---

[1] غالبًا اس ملاقات کی آپکو یاد نہیں رہی جس کا ذکر مکرمی لال کرشن صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ ا۔ ز

پریم چند کی قومی خدمت

ابوعمر زکریا بھاگلپوری، ایڈیٹر "مومن گزٹ" کانپور

ہندوستان میں اُردو ہندی کا تنازع چل رہا ہے، اور عمداً ایک زبان کو دو بنایا جارہا ہے ہندی کے معترف سنسکرت سے مدد لیکر اور اُردو کے مداح عربی اور فارسی کی اعانت سے زبان کی مشاطگی اس طرح کر رہے کہ جس سے ہندو اور مسلمانوں کی دو زبانیں نظر آرہی ہیں۔ یہ اجنبیت ہندوستانیوں کے اتحاد و محبت میں فرق ڈال رہی ہے۔ منشی پریم چند آنجہانی کی ہستی وہ نادر اور مغتنم ہستی تھی جس نے اس اجنبیت کی ڈراؤنی صورت کو دیکھکر فوراً مستقبل کو بھانپ لیا۔ آپ نے اُردو کی مسلسل خدمت شروع کردی، اور اتنی من موہنی سادگی برتی کہ ہندو حضرات بھی لوٹ ہو گئے۔ اُدھر ہندی کا قلم بھی سنبھالا اور ہندی کو برج بھاشا میں رنگ دیا۔ ہمارے پریم جی دونوں زبانوں کے درمیان ایک "پریم کے پل" تھے جو دوئی کی خلیج کو وحدت کے پل سے پاٹ رہے تھے، دونوں زبانوں میں پھر یگانگت پیدا ہو رہی تھی اور چولی دامن کا ساتھ ہو رہا تھا، مگر ملک کی بدقسمتی سے پیکِ اجل نے اس مفید کام میں فرق ڈال دیا۔

پریم چند جی صرف ماہر زبان ہی نہ تھے، آپ فاضلِ ادب تھے، زبان کو گوناگوں الفاظ و بوقلموں بندش و اسالیب سے مزین کر رہے تھے۔ آپ اپنے قابل قدر ترجموں سے علوم و فنون کے گراں بہا موتیوں سے خزانہ کو بھر رہے تھے، مصلح قوم و ملک تھے، اپنے قلم کو ہر رقم سے قوم و ملک کی اصلاح کر رہے تھے، اخلاقیات کی تعلیم سے قوم کی کمزوریاں دُور کر رہے تھے

آپ کا زندہ دل لٹریچر کی چلبلی سطروں میں زندہ دلی پیدا کر رہا تھا۔ آپ کی سحر نگاری مقبول خلائق داستانوں میں چمک رہی ہے، آپ کے آمر جذبات افسانوں میں گرمی پیدا کر رہے ہیں، افسوس آپ افسانہ نگار تھے مگر اب خود افسانہ ہو گئے ہیں۔ مگر جبتک آپ کی "تصنیفات" زندہ ہیں اور جبتک خاکدان عنصری عالمِ امکان میں جلوہ گر ہے آپ کی تصنیفات ہر منبر کی زینت اور ہر دل کی مونس و رفیق بنیں گی۔ آپ کا نام آسمانِ ادب پر آفتاب کی طرح درخشاں رہیگا اور آپ کا تذکرہ سخنوروں کی محفلوں میں گونجتا رہیگا۔

منشی پریم چند کی ادبی خدمات

از حضرت جگر بریلوی بی۔اے

موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی سرزمین ادبی نشو و نما کے لئے "زمین شور" نظر آتی ہے اور یہاں دب و شعر کا فروغ پانا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اوّل تو ہندوستان کی ناداری و افلاس کے باعث مدیوں سے اہل ہند کے دل و دماغ ضعیف و ماؤف ہو گئے ہیں اور دل سے احساس لطافت ور د ماغ سے بلند پروازی کے جوہر پرواز کر گئے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ کشمکش حیات کسی فرد بشر کو نی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خالص ادبی مشاغل میں زندگی کا کوئی معتد بہ حصہ بھی صرف کر سکے۔ ن تمام دشواریوں کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم و تہذیب کے سطحی اثرات بھی ذوق ادب کے راہ میں سنگ راہ ن گئے ہیں۔

ایسے زمانہ میں منشی پریم چند کا پیدا ہو جانا تو تعجبات سے نہیں تھا۔ ہندوستان کی خاک میں ابھی وئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ کوہِ ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیاں دنیا بھر کے پہاڑوں کو پست کئے ہوئے یں اور دنیائے آب و گل کے قیام تک پست کئے رہیں گی۔ اس خاک سے جو ذرّے اُٹھتے رہتے ہیں نہیں سے اکثر اُن بلندیوں پر پہونچے ہیں جہاں پہونچتے ہوئے فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ کالیداس، بھوبھوتی، ویاس، تلسی داس وغیرہ وہ عظیم الشان ہستیاں گزری ہیں جن کے کارناموں سے جہاں دب کا وقار قایم ہے۔ آج بھی مادر ہند کا ایک سرمایہ ناز سپوت رابندر ناتھ ٹیگور اپنے لاہوتی نغموں سے عالم شعر و ادب پر چھایا ہوا ہے اور ہندوستان جنت نشان کی روحانی لطافتوں سے دلوں کو سرور کیف بخش رہا ہے۔ مگر ٹیگور ایسے دودماں میں پیدا ہوئے تھے جو جواں بخت ہے اور دولت و ثروت جس کا منھ چومتی ہے۔ ناز و نعمت کے گہوارے میں جب اُنھوں نے آنکھ کھولی تو ہر در و دیوار کو رنگین وحسین پایا جس کے باعث اُن کے جمالیاتی ذوق نے وہ ترقی کی جس نے نگار خانہ ادب کا حُسن دوبالا کر دیا۔ لیکن منشی پریم چند اس معاملہ میں خوش نصیب نہیں تھے۔ اُنکی قسمت کا نوشتہ ٹیگور سے بالکل برعکس تھا۔ وہ ایک دیہات میں پیدا ہوئے تھے۔ مہر مادری سے بچپن ہی محروم ہو گئے، کرشن

آتے آتے ظلِ پدری بھی سر سے اٹھ گیا اور سوتیلی ماں، بھائی اور دیگر متعلقین کا بارِ کفالت گردن پر آپڑا۔ پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن کی۔ آدھے میں خود گزر کی اور آدھا اپنے متعلقین کی گزر بسر کے لئے دیتے رہے۔ یہ تھا وہ آزمایش کا زمانہ جس سے منشی پریم چند کے سن شعور کا آغاز ہوا۔ ایسی حوصلہ شکن اور صبر آزما مشکلات میں بڑے بڑے جوانمردوں کے پتّے پانی ہوجاتے ہیں ایک نوعمر ہندوستانی طالب علم سے جس کا کوئی ہمدرد، دستگیر اور رہنما نہیں ایسی سخت کشمکش حیات کے مقابلہ ہی کی اُمید نہیں کی جاسکتی ادبی شوق کا پیدا ہونا اور قایم رہنا تو امکانات بعید ہیں لیکن ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

قدرت کو منشی پریم چند کے ہاتھوں ادبی دنیا میں ایک مہم سر کرانا تھی اسلئے جو جوہر اُن کی طبیعت میں ودیعت تھے وہ نشو ونما سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ تائید غیبی تھی کہ اُنھوں نے نہایت صبر و سکون کیساتھ اس آزمایش کا مقابلہ کیا اور اپنی ہمت اور بلند حوصلگی سے زندگی کے دشوار گزار مرحلے طے کرڈالے۔ ذوقِ ادب کو بھی فروغ دیکر اُس عظیم الشان مرتبہ پر پہونچا دیا جو معراج کمال کی آخری حد ہے۔ اور وہ بلند نامی و ناموری حاصل کی جو اُردو دنیا کے کسی مصنف کو نصیب نہیں ہوئی۔ اپنی ملک کے گوشے گوشے میں تو آپ مشہور و معروف تھے ہی بیرونِ ملک میں بھی بہت سی قوموں میں آپ کی تصنیفات ترجمہ ہوکر مقبول ہوئیں اور خراج تحسین و آفریں حاصل کرکے رہیں۔ آپنے اپنے ادبی مشغلہ کے لئے ابتدا میں اُس زبان کو منتخب کیا جو کم سے کم ممالک متحدہ کی مادری زبان سمجھی جاتی ہے اور جس کو بہ نسبت ہندی کے اُردو کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اس زبان سے کسقدر دل برداشتہ کردینے والی حقیقت ہے کہ اس کا سہارا لیکر آپ اپنا رزق بھی پیدا نہ کرسکے متعلقین کو کیا امداد دے سکتے تھے۔ آپ کو بہت جلد اس کس مپرسی کا احساس ہوگیا اور آپنے اپنے ادبی مشاغل کا رُخ ہندی زبان کیطرف پھیر دیا۔ ہندی کے قدردانوں نے سر آنکھوں پر جگہ دی اور آپ رفتہ رفتہ اطمینان و آسودگی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ ملازمت کے اُس قید و بند سے بھی آپ کو رستگاری حاصل ہوگئی جس کے اثرات دل کو آلودہ، دماغ کو بیکار اور رُوح کو تاریک کردیتے ہیں اور جو خواب و خیال سے بھی آزادی کی قوت سلب کرلیتے ہیں۔

اگرچہ ہندی آپ کے لئے ایک برکت ثابت ہوئی لیکن اُردو کی محبت نے بھی آپ کو اپنی طرف سے بیگانہ نہیں ہونے دیا آپ اُن تمام حوصلہ شکن اور مایوس کن دشواریوں کے باوجود اُردو کے حقوق فراموش نہ کرسکے اور دل و جان سے اُس کی خدمت بھی تادم مرگ انجام دیتے رہے۔ بلکہ جس سخت کشمکش

ں اُردو زبان کو اُس کے نادان دوستوں نے ڈال کر ہندی کا رقیب بنا دیا ہے اُس سے آپ کا دل ست متاثر تھا اور اُردو کے موافقین ومخالفین کی افراط و تفریط سے جو خطرات اس زبان کے لئے پیدا ہو گئے تھے اُن کے مٹانے کے لئے اور اپنی زبان کو ہندوستانی (وہ زبان جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کی صحیح معنی میں ترجمان ہو) بنا دینے کے لئے جو مساعی جمیلہ آپ نے کیں وہ اس قابل ہیں کہ دلدادگانِ اُردو ان کو شمعِ ہدایت بنالیں ورنہ اُردو ہندی کی رقابت کبھی نہ مٹ سکیگی اور نہ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان بنجانے کی منزل کی طرف ترقی کر سکے گی۔

یہ بحث بہت وسیع ہے یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اس کا ذکر آ گیا ورنہ میں عرض تو یہ کر رہا تھا کہ منشی پریم چند آخری وقت تک اُردو زبان کی بھی خدمت انجام دیتے رہے اور آپکے ادبی کارنامے اس زبان کے شیدائیوں سے بھی خاموش داد لیتے رہے۔ رفتہ رفتہ آپنے اُردو کے خزانہ کو بھی ایسی بیش بہا، نادر متاع سے مالامال کر دیا جو آپ اپنی نظیر ہے۔

اُردو میں افسانہ نگاری کی ابتدا "فسانہ آزاد" سے ہوئی۔ اس عجیب و غریب افسانہ کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج گیا۔ اس گرانقدر تصنیف کے ایک ایک فقرے ایک ایک لفظ میں جادو کا سا اثر ہے۔ چند سطریں پڑھ لینے کے بعد کیسا ہی ثقہ اور خشک مغز، کیسا ہی غبی اور نحس آدمی کوئی کیوں نہ ہو ایک متحرک پتلا بنکر افسانہ کی کیفیتوں کا جزو بنجاتا ہے اور بے اختیار کبھی مُسکراتا ہے، کبھی قہقہہ لگاتا ہے، کبھی مرعوب خائف ہو جاتا ہے کبھی رونے لگتا ہے غرض وہ زبردست جادوگر جس کا نام رتن ناتھ سرشار ہے جو طرح اُسے نچانا چاہتا ہے ناچتا چلا جاتا ہے۔ سرشار کے بعد یہ سحر کارانہ رنگ ناپید ہوگیا۔ ایک مدت گزر جانے پر اُردو کی قسمت جاگی اور منشی پریم چند کے قالب میں اُردو ادب نے جنم لیا۔ جس کو آپکے وسیع مشاہدہ، بلند معیار اخلاق اور وسعت نظر نے ایسے ایسے حقیقی، دلفریب، اور پاکیزہ مرقعوں میں پیش کیا ہے جس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ملتی آپکے افسانوں میں مافوق الفطرت ہوکل یا انسان نظر نہیں آتے بلکہ یہی عام انسانوں ہیں جن سے ہماری دنیا آباد ہے لیکن آپنے ان عام انسانوں کی نفسیاتی خصوصیات کا اسقدر صحیح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے۔ کہ یہ انسان مخصوص کردار بن گئے ہیں۔ افسانوں میں جو واقعات ہیں وہ بھی نوع انسان کے فطری مقتضیات سے بالاتر یا کسی خصوصیت میں مختلف نہیں۔ وہی معاملات ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں اور دیکھنے والوں کو عام طور پر کچھ متاثر نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو صرف اتنا کہ لبوں پر کبھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی یا تعجب سے ذرا آنکھوں کے پلک اوپر کو چڑھ گئے اور ٹھوڑی نیچے کو کھنچ گئی یا کوئی افسوس یا تحسین کا کلمہ زبان پر آگیا۔ لیکن ایک شاعر یا افسانہ

نگار انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اس انداز سے نمایاں کرتا ہے کہ وہ غیر فطری بھی نہیں ہونے پاتیں اور پڑھنے والے کے دل پر ایک مقناطیسی اثر بھی ڈال دیتی ہیں۔ منشی پریم چند کے افسانوں کی بھی یہی خصوصیت ہے پھر افرادِ افسانہ کے حرکات و سکنات، خصائل و شمائل، جذبات و کیفیات، اعمال و افعال میں اتنی ہی گوناں گونی ہے جتنی نوعِ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے اس قلبِ انسانی کے مبصر کامل اور جذبات کے پکے ماہر کو اگر ہم ہندوستان کا شکسپیر کہیں تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر اس فطرتِ انسان کی چگونگی و بوقلمونی کے اندازِ بیان پر نظر کی جائے تو ہر ہر لفظ پر پڑھنے والے کے قلب کی حالت اس کیفیت و سرعت کے ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے جس طرح برسات کے موسم میں اُفق پر جلوہ فرما سورج کی کرنیں ابر کے ٹکڑوں میں مسلسل رنگینی کے عالم پیدا کرتی و رٹاتی رہتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور افسانہ نگاری کی حدیں ملجاتی ہیں اور مصنف کی قدرتِ خلاقی کو دیکھ کر اُسے خدایانِ اَدب میں تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس یگانۂ روزگار نباضِ فطرت اور معجز نگار انشاپرداز کی شاندار ادبی فتوحات پر مکمل تبصرہ کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کے تمام مجموعہ تصنیفات کا وسعتِ نظر کے ساتھ گہرا مطالعہ کرنا لازمی ہے جس کے لئے بہت فرصت چاہیئے پھر ان پر شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہے۔ مجھے اس اہم خدمت کے انجام دینے کے لئے نہ وقت نصیب ہے نہ یکسوئی۔

منشی پریم چند انگریزی میں عالمانہ دستگاہ رکھنے کے بدولت فکرِ معاش کی پریشانیوں سے امن میں رہ سکتے تھے۔ ہندی کی طرف اُنکا متوجہ ہو جانا اُن کے لئے اور نیز قوم کے لئے ایک فال مُبارک ثابت ہوا۔ شہرت و عظمت نے سر آنکھوں پر جگہ دی اور ایک دن وہ آیا کہ دنیائے ادب نے اُنھیں اقلیم افسانہ نگاری کا تاجدار تسلیم کر لیا۔ اگر خدانکردہ وہ انگریزی زبان سے نابلد ہوتے اور ہندی میں بھی قدرت کاملہ نہ بہم پہونچا سکتے تو اُن کا کیا انجام ہوتا اور اُن کے خداداد جوہروں کی کیا گت ہوتی اسکے تصور سے دل لرزتا ہے۔

یہ بھی ہزار ہزار شکر کا مقام ہے کہ یہ باکمال حضرات جو درخشاں تارے آسمان سے توڑ کر لائے وہ کچھ عرصہ کے لئے فنا ہو جانے سے محفوظ ہیں یعنی اُن کے ادبی کارنامے کتابی صورتوں میں منتقل ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن جب تک ان کارناموں کو ارتقائے ادب اُردو کی زنجیر کا ایک مستقل جزو نہیں بنایا جائیگا یہ تمام کارنامے اور خدمات رائگاں ہیں۔ رواں، برق اور منشی پریم چند موجودہ دور سے متعلق ہیں۔ اُنکے کارناموں سے ابھی کان آشنا ہیں۔ ان سے پیشتر دور کے مشاہیر کی ایک دُھندلی سی یاد اُن لوگوں

کے دلوں میں باقی ہے جنکی آنکھوں کو ان کی شمع فکر کی تابانیوں نے خیرہ کردیا تھا تھا۔ یہ بزرگ کون تھے؟ یہ بزرگ حضرات نظر لکھنوی، سرور جہان آبادی اور برق سیتاپوری ونشی جوالا پرشاد صاحب مثنوی بہار، تھے۔ ان سے پیشتر دور کی طرف اگر نگاہیں دوڑائی جائیں تو بہت دور جاکر سرشار ونسیم نظر آتے ہیں جن کے بعد یعنی ان سے پہلے دوروں میں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے جہاں سے نگاہ تجسس مایوس ہوکر چارو ناچار پلٹ آتی ہے۔ عقل، قرائن اور موجودہ مثالیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ایسی ایسی جلیل المرتبت ہستیاں ابتدائے زبان اردو سے ہر دور میں ملنا چاہیئے مگر نہیں ملتیں یہ ایک دلخراش حقیقت ہے لیکن حقیقت ہے اس کو کیا کیا جائے۔ کیوں نہیں ملتیں اسکے جواب میں جب کبھی لکھے جائینگے دفتر کے دفتر لکھے جائینگے۔ یہاں صرف مقصود گذارش یہ ہے کہ اس کس مپرسی اور ناقدر شناسی کے حالت سے جن دلدادگان ادب کا دل پانی پانی ہوتا ہے اور کلیجہ دکھتا ہے اور جو اس دیکھے کو اردو کے لئے باعث ننگ سمجھتے ہیں وہ اب کوئی ایسا کام کردکھائیں جس سے منشی پریم چند ہی کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ نہ رہے بلکہ ان متوسطین و متقدمین مشاہیر ادب کو بھی جو فراموش کرکے گمنام کردئے گئے ہیں، حیات تازہ و ابدی میسر ہو۔ ورنہ جس طرح وہ فنا ہوکر بے نام ونشاں ہو گئے یہ بھی ہوجائیں گے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے سہ

بے نام ونشاں ہیں آہ وہ اہل شعور ۔۔۔ تھی بزم ادب جن کے اثر سے پرنور
کچھ ان کی بقا کا آج ساماں کرلیں ۔۔۔ زندہ رہنا اگر ہمیں ہے منظور

یہ عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے بدی میں اتنی ہی رغبت۔ عالم عالم کو دیکھ کر سادھو سادھو کو دیکھ کر۔ شاعر شاعر کو دیکھ کر جلتا ہے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا مگر جواری جواری کو دیکھ کر شرابی شرابی کو دیکھ کر چور چور کو دیکھ کر ہمدردی جتاتا ہے۔ مدد کرتا ہے۔ ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھاکر گرپڑیں تو دوسرے پنڈت جی انھیں اٹھانے کے بجائے دو ٹھوکر اور لگائیں گے کہ وہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں۔ مگر ایک چور پر آفت آتے دیکھ کر دوسرا چور اس کی آڑ کرلیتا ہے۔ بدی سے سب نفرت کرتے ہیں اسلئے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے اس لئے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔ چور کو مار کر چور کیا پائے گا؟۔ نفرت۔ عالم کی توہین کرکے عالم کیا پائیگا؟ نیکنامی

(فردوس خیال) پریم چند

پریم چند اور ہندوستانی زبان

پروفیسر رام پرشاد کھوسلا۔ ایم اے۔ آئی ای ایس

منشی پریم چند کی بے وقت موت سے جو نقصان ہندوستان کی ادبی دنیا کو پہونچا ہے وہ ہر تعلیم یافتہ شخص پر ظاہر ہے۔ اُردو اور ہندی کے صفِ اولیں کے مصنفوں میں ایک جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہو گئی ہے اُنکی دلچسپ داستانوں سے کون واقف نہیں۔ اُنہوں نے مشرقی تمدّن کے مختلف پہلوؤں پر ایک نئی روشنی ڈالی ہے اور اس کا مقابلہ مغربی تہذیب کے ساتھ کیا ہے اور دونوں کے نتائج اپنے دلچسپ افسانوں میں ظاہر کئے ہیں۔ انہوں نے کتاب زندگی کا خوب مطالعہ کیا اور زندگی کے بھید کھول کر ہمارے سامنے رکھدئے۔ اُن کی داستانیں زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

منشی پریم چند ایک اعلیٰ درجے کے ناولسٹ تھے اور مشرقی تہذیب کے ہر پہلو سے پوری واقفیت رکھتے تھے اُن کے خیالات کی وسعت اور ان کے جذبات کی گہرائی قابل تعریف ہے۔ اُنہوں نے ہمارے تمدّن کی ایک صحیح تصویر کھینچ کر ہمارے سامنے رکھدی ہے۔ ہندوستانی ناول کی تاریخ میں انکا نام لوگ ہمیشہ آدب اور عزت کے ساتھ لیں گے اور انکا بار احسان تا ابد ہمارے سر پر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی بے وقت موت پر ملک کے ہر حصے میں اظہار افسوس ہوا۔ جا بجا ماتمی جلسے منعقد ہوئے اور ہر طبقے کے لوگوں کو دلی صدمہ ہوا اور ان کی یادگار قائم رکھنے کے لئے مختلف اقسام کی تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔

منشی پریم چند جس طرح اُردو کے شیدائی تھے اُسی طرح ہندی پر بھی جان دیتے تھے۔ وہ مشکل الفاظ کے استعمال کی مرض میں مبتلا نہ تھے۔ ان کی زبان عام فہم ہے اسی وجہ سے ان کی تصانیف مقبول خاص و عام ہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ بہت وسیع تھا اور اُنہوں نے اپنے آپ کو کبھی تنگ نظری کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اُن کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں سے اعلیٰ درجے کی واقفیت تھی اور اُنہوں نے دونوں کی خدمت بھی پوری تندہی سے کی اس طرح گویا اُنہوں نے دونوں زبانوں کو ایک بنا دیا اور صرف رسم خط کا فرق رہ گیا۔ نہ وہ اُردو کے اُن مصنفوں میں تھے جنہوں نے فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت سے اپنی زبان کو نہایت مشکل بنا دیا ہے اور نہ وہ ہندی کے ان لیکھکوں میں تھے جن کی بھاشا سنسکرت کے شبدوں کی بہتات کے سبب اسقدر کٹھن ہوگئی ہے کہ پڑھنے والا قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ اُن کی زبان کسی خاص فرقے سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ سارے شمالی ہندوستان

کی زبان تھی۔ آج کل سب سے بڑی ضرورت ملک کی یہی ہے کہ زبان عام فہم ہو۔ خواہ وہ اُردو رسم خط میں لکھی جائے خواہ دیوناگری حُروف میں۔ بہر حال رسم خط کے سوال سے قطع نظر منشی پریم چند مرحوم کی زبان ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اور یہی زبان ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے۔ اگر اُردو اور ہندی کے مصنف منشی پریم چند کی تقلید کریں تو زبان کے دلخراش سوال کا جو آجکل ملک کے سامنے پیش ہے ایک حد تک خود بخود حل ہو جائے گا۔

بہ حیثیت مصنّف پریم چند کا مرتبہ

بنگال کے نامور فسانہ نگار شرت چندر چٹوپادھیائے کی رائے ہے:۔

"رابندر ناتھ ٹیگور کی تو بات ہی اور ہے لیکن مختصر کہانیوں میں پریم چند کا مرتبہ بہت بلند ہے۔"

سری مہیندر لکھتے ہیں۔ کہ:۔

"ہندی میں گوسوامی تلسی داس کے بعد اگر کوئی مصنف عوام میں ہر دلعزیز ہوا ہے تو وہ صرف منشی پریم چند جی تھے۔"

مرہٹی زبان کے نامور مصنف پنڈت آنندراؤ جوشی جنھوں نے پریم چند کی کئی کتابوں کا مرہٹی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ:۔

"پریم چند" ہندوستان کے اعلیٰ رہنمائے فن تھے۔ اُن کے شاہکار دوسری زبانوں میں اُسی شوق و دلچسپی اور احترام سے پڑھے جاتے تھے جیسے اُردو اور ہندی میں۔"

رائے بہادر شیام سندر داس سیکریٹری ناگری پرچارنی سبھا۔ بنارس رقمطراز ہیں۔ کہ:۔

"منشی پریم چند نے ہندی زبان اور لٹریچر کا مرتبہ بلند کیا ہے۔ آپ نے اسے معراج کی منزل تک پہونچایا ہے۔ آپ کی کتابوں کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ جاپانی زبانوں میں بھی ہوا ہے۔

منشی پریم چند مصورِ جذبات

(از شیو کماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی)

قدرت نے منشی پریم چند کو شاعر کا دماغ اور مصوّر کا قلم عطا کیا تھا جس نے ایسے ایسے گلہائے مضامین کھلائے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ حضرت سرشار کے بعد اگر افسانہ نویسی کو کسی نے معراج بخشی تو وہ آپ ہی کی ذاتِ گرامی تھی جس کے قلم معجز نگار نے روزانہ کے معمولی واقعات کو جو ہماری زندگی میں کثرت سے رونما ہوتے ہیں افسانہ کا جامہ پہنا کر ایسا دلچسپ بنا دیا کہ بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ آپ افسانہ نگار نہیں بلکہ واقعہ نگار یعنی آپ نے افسانہ کو واقعہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں کو قبول عام کی سند حاصل ہوئی مرحوم نے جو سرمایۂ تصنیفات چھوڑا ہے اُس میں کئی سو افسانے اور ناول ہیں، اگر ان کے ہر پہلو کو غور سے دیکھا جائے تو یہ ہر اعتبار سے افسانہ نویسی کے معیار پر پورے اُتریں گے۔ اس معیار کو دو پہلوؤں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صوری اور دوسرا معنوی۔ صوری معیار میں زبان محاورہ، اور طرزِ بیان شامل ہیں اور معنوی میں جذبات نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور کردار نگاری ہیں۔ جذبات نگاری اور کردار نگاری میں تو مرحوم کو کمال حاصل تھا۔ آجکل افسانہ نویسوں کی کمی نہیں، کوئی رسالہ یا اخبار ایسا نہیں جس میں افسانے نہ نکلتے ہوں۔ مگر بہت کم افسانے ایسے ہوتے ہیں جو معیاری کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی افسانے میں جذبات نگاری کا موقعہ آیا مرحوم کی فکر رسا اُن میں جذب ہو گئی۔ اور اُن کی ایسی صحیح پُر اثر کیفیتیں پیش کر دیں کہ پڑھنے والا بھی ہمہ تن اُن کا جزو بن گیا اور لطف یہ کہ سیکڑوں طرح کے جذبات ایک ہی قلم سے صورت پذیر ہوئے ہیں مگر سب اپنی اپنی کیفیت میں علٰحدہ اور حقیقی ہیں۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر کردار کے دل میں مصنف بیٹھا ہوا ہے اور اُس کا قلم جذبات کی زبان بنکر بولتا چلا جاتا ہے۔

جذبات و واقعات کی صحیح ترجمانی اور اُن کی ایسی تصویریں کھینچنا جن سے حالتِ وقت کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جائے حقیقی شاعری ہے خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ کیونکہ شاعر اور افسانہ نگار ایک ہی

چمن کے دو باغبان ہیں صرف اُن کی طرز چمن بندی میں اختلاف ہے۔ ایک گلاب کی قلم لگاتا ہے دوسرا چنبیلی کی یعنی شاعر جذبات یا واقعات کو وزن اور قافیہ کی قیود میں ادا کرتا ہے جس سے دلکشی کے ساتھ ساتھ طبیعت میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نثر کا سادہ لباس پہناتا ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ شاعر زیادہ تر اپنے ہی جذبات و واقعات کا مترجم ہوتا ہے، افسانہ نگار تمام دنیا کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُس کے قلم سے ہر طبقہ، ہر حیثیت اور ہر طبیعت کے افراد خلق ہوتے ہیں۔

منشی پریم چند کے افسانے انشاپردازی اور افسانہ نگاری دونوں کی جان ہیں۔ اگر ایک افسانہ پڑھکر طبیعت میں شگفتگی اور سرور پیدا ہو جاتا ہے اور دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے تو دوسرا افسانہ پڑھکر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں اگرچہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ یہ محض افسانے ہیں، مگر کچھ اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے آدمی اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے کبھی روتا، کبھی برہم ہوتا اور کبھی مایوس ہوتا ہے۔ غرض مصنف کا قلم جو ناچ سے نچاتا ہے ناچتا چلا جاتا ہے۔ گویا خود بھی ان کرداروں میں سے ایک بن جاتا ہے۔ مرحوم کا ایک افسانہ "کفارہ" میں اپنی ماں کو سنا رہی تھی، میرا چھوٹا بھائی بھی وہیں بیٹھا تھا۔ یکایک سسکیوں کی آواز آئی دیکھا تو میرا چھوٹا بھائی زار و قطار رو رہا ہے، ماں اور بہن کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک رہے تھے مگر وہ ضبط کئے تھیں۔ میں نے بھائی سے سبب پوچھا تو کوئی جواب نہ دیا۔ اور جواب بھی کیا تھا یہ افسانہ سنکر جو اثر اُن کے ننھے سے دل پر ہوا اُس کا اظہار بجز آنسوؤں کے کس طرح ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جب دل پر کوئی شدید کیفیت طاری ہوتی ہے تو زبان اُس کی ترجمانی سے قاصر رہتی ہے اور آنکھ زبان کا کام انجام دیتی ہے۔

یوں تو منشی پریم چند کا نام ابد تک قائم رہیگا اور لوگ آپ کے افسانے پڑھ پڑھ کے سر دھنیں گے، مگر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس یگانہ روزگار ہستی کی یادگار قائم رکھنے کی اہل وطن کیا کوشش کرتے ہیں۔ مرحوم کی یہ عظیم الشان خدمات مستحق تو اس صلہ کی ہیں کہ آپ کی ایک نہایت مستحکم و مستقل یادگار ہی نہ قائم کی جائے بلکہ آپ کے نام پر ایسی انجمنیں اور ادارے قائم کئے جائیں جن سے علم و ادب کی حقیقی خوبیوں کے سرچشمے رواں ہوں۔

منشی پریم چند کی مصوری

از مسٹر "سلیم جعفر"

فسانہ نگار اور مصور میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ دونوں واقعات کو لیتے اور انھیں دکھا کر ایک خاص اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو وہ مسالہ کا ہے۔ مصور خطوط سے کام لیکر انھیں اُجاگر اور موثر بنانے کے لئے رنگ بھرتا ہے۔ فسانہ نویس کے خطوط اس کے کردار ہیں اور اس کا رنگ وہ الفاظ ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے کرداروں کو پیش کرتا ہے۔

مصور طرح طرح کی لکیریں کھینچ کر وہ تمام چیزیں نظر کے سامنے لاتا ہے جو ذہن میں کسی واقعہ کا تصور پیدا کر سکتی ہیں۔ فسانہ نگار اپنے کرداروں کو پیش کر کے اُن کی زبان سے وہ الفاظ ادا کراتا ہے جن سے اشیاء و واقعات کا تصور پیدا ہو۔ جس طرح مصور کا فرض ہے کہ وہ طرح طرح کے رنگوں سے کام لے اور اُن میں تناسب قائم رکھے اسی طرح فسانہ نگار بھی جب تک قسم قسم کے کردار پیش کر کے ان میں مناسبت قائم نہ رکھے اُس کی تصویر بھدی اور بے اثر ہوگی۔ مصور کو تصویر کی فضا بھی دکھانی پڑتی ہے۔ فسانہ نگار کو بھی اس سے چارہ نہیں۔ وہ بھی لفظوں کی مدد سے ایک فضا پیدا کرتا ہے جس کے اندر رہ کر اُس کے کردار عمل کرتے ہیں۔ اس لئے کسی افسانہ نگار کے کام کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے فسانہ کا موضوع کیا ہے۔ یعنی کسی اثر کے پیدا کرنے کے لئے اس نے کس واقعہ کو چُنا ہے اور پھر اس واقعہ سے متعلق جس جس طرح کے اور جن جن کردار کی ضرورت ہے اُس نے انھیں پیش کیا یا نہیں، جن الفاظ میں انھیں پیش کرنا تھا یا جو باتیں اسے لکھنی چاہیئے تھی اس نے وہی لکھے اور اس کے کرداروں کے منہ سے وہی باتیں نکلیں یا کہیں لغزش ہوگئی، اور فضا مناسب حال ہے یا غیر متعلق۔ منشی پریم چند صاحب مرحوم کے افسانوں کو اس کسوٹی پر کسنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چابک دست مصور

اور ماہر فن تھے۔

ہندوستانیوں کا عام خیال ہے کہ سوتیلی ماں بچوں کو اچھی طرح نہیں رکھتی اور بچوں کے باپ اکثر اس بارے میں اپنی دوسری بیوی سے بدگمان رہتے ہیں۔ لیکن بدگمانی بہرحال بدگمانی ہے اس لئے اکثر اس کی کچھ اصلیت نہیں ہوا کرتی۔ پریم چند ملک میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ واقعات کی تفسیر بدگمانی کے رنگ میں نہ کرنی چاہیئے بلکہ حقیقت کو تلاش کرنا ضروری ہے چنانچہ اپنے مشہور قصہ "سوتیلی ماں" میں اُنہوں نے چار کردار مقرر کئے ہیں (۱) ایک وہ شخص جس کی بیوی مرچکی ہے اور اس نے دوسری شادی کرلی ہے (۲) پہلی بیوی سے اس کا ایک لڑکا (۳) دوسری بیوی یا اس لڑکے کی سوتیلی ماں۔ (۴) ایک دوست۔

غور کیجئے کہ یہ اتنے گنے کردار کس قدر ضروری ہیں۔ آپ ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ چوتھا بظاہر بیکار نظر آتا ہے لیکن یہ اس لئے ضروری ہے کہ بیوی کی طرف سے شوہر کو جو بدگمانی ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ صرف بچہ کے ذریعے سے لگ سکتا ہے اور بچہ چونکہ طبعاً اپنی سوتیلی ماں کے سامنے اس کی شکایت نہیں کرسکتا اس لئے اُس کو ایسا موقع ملنا چاہیئے جہاں وہ کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کرسکے۔ یہ موقع تنہائی میں بھی مل سکتا ہے لیکن اس صورت میں ضروری ہے کہ وہ لڑکے سے خود پوچھے کہ اس کی سوتیلی ماں اس سے کس طرح پیش آتی ہے۔ لیکن اس سوتیلی ماں کا بچہ کے ساتھ ایسا برتاؤ ہے کہ بچہ سے وہ اس قسم کا سوال ہی نہیں کرسکتا۔ اس کے دل میں صرف چور ہے اور اس بدگمانی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بچہ سے سوال کرنے سے افسانہ کی نزاکت میں فرق پڑتا ہے۔ اگر اس نے کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جس نے اسے بیوی کے بُرے برتاؤ کا یقین دلایا ہے تو بچے سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ اس کا تدارک کرنا چاہیئے۔ اس نے اپنی آنکھ سے کچھ نہیں دیکھا، بچہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اس کی باتوں اور حرکتوں سے بیوی کے برتاؤ کا حال معلوم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس سے اچھا موقع کونسا ہوسکتا ہے کہ بچہ سے دوست کے ہاں ایک ایسی حرکت سرزد ہوجائے جس سے اس کی بدگمانی یقین کا درجہ حاصل کرے۔ اس لئے یہ کردار نہایت ضروری ہے اور مصنف نے اسے ایسے تین کرداروں میں شامل کرکے اپنے ماہر فن ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

پہلا کردار اس خیال کا مرکز ہے کہ اکثر لوگ بیوی کے مرجانے پر محض اس وجہ سے مجبوراً

شادی کر لیتے ہیں کہ مرحومہ کی اولاد کو آرام ملے۔ چنانچہ اُس نے شادی کر لی لیکن وہ اپنے دل سے اس خیال کو نہ نکال سکا کہ سوتیلی ماں اس کے بچّہ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کر سکتی کیونکہ عام خیال یہ بھی ہے کہ اولاد ماں کا کلیجہ چھُو کر پیٹ سے نکلتی ہے۔ سوتیلی ماں وہ ہستی تو کسی طرح ہو سکتی نہیں جس کا کلیجہ چھو کر وہ نکلا ہے پھر اس سے سچّی محبت اور مادرانہ برتاؤ کی کیسے امید ہو سکتی ہے جسے ماں کی مامتا کہتے ہیں۔ بہر حال شادی کرنے کے بعد وہ بچہ کی طرف سے بے فکر نہیں ہے اور نہ اپنی بیوی کی طرف سے اطمینان ہے اس لئے ایک واقعہ پیش آتے ہی اُس کی بدگمانی میں جان پڑ جاتی ہے جو سوتیلی ماں کے اچھے برتاؤ کی وجہ سے دبی ہوئی تھی اور وہ فوراً اس کے برتاؤ کو بدگمانی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہ بدگمانی اُس وقت جا کر دور ہوتی ہے جب بچہ خود اپنی سوتیلی ماں کے اچھے برتاؤ کا ثبوت دیتا ہے۔

دوسرا کردار خود بچّہ ہے۔ ماں کے مرجانے سے وہ باوجود سوتیلی ماں کے اچھے برتاؤ کے دل گیر رہتا ہے۔ یہ پہلے اور تیسرے کردار میں واسطہ کا کام دیتا ہے۔ اس کردار کے بغیر افسانہ کا تیار ہونا ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ پہلے اور تیسرے کردار کو کام کرنے کا موقع تبھی مل سکتا ہے جب یہ دوسرا کردار موجود ہو۔ وہ دونوں کردار گویا عامل ہیں اور یہ معمول۔

فسانہ بہ لحاظ خدوخال کامل ہے۔ اگر اس میں کوئی پانچواں کردار داخل کر دیا جاتا تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی اور لطف زایل ہو جاتا۔

اِن چاروں کرداروں کے عمل میں تناسب بھی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ یہ افسانہ "شعورِ تناسب"[۵] کی بھی ایک قابل قدر مثال ہے۔ یہ اس قسم کے افسانوں میں نہیں ہے جنکی جان مکالمے ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ اس نوع کا ہے جسے میں "حکایتی" افسانہ سے تعبیر کرتا ہوں جس میں کوئی شخص اپنے یا کسی اور کے تجربات و واردات کسی کو سُناتا ہے۔ ایسے افسانوں میں مکالمہ کی بہت کم گنجائش ہوا کرتی ہے اور ہر کردار منظر پر صرف اتنی ہی دیر رہتا ہے جب تک اس کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ افسانہ زیر بحث میں بھی کردار نمبر ۴ صرف ایک دفعہ نمبر ۲ و ۳ دو دفعہ منظر پر تھوڑی دیر آکر غائب ہو جاتے ہیں اور سارا افسانہ کردار نمبر ایک کے خیالات و تاثرات سے بھرا پڑا ہے کیونکہ درحقیقت مرکزِ افسانہ یا ہیرو وہی ہے۔

---

۵ SENSE OF PROPORTION

نفسیاتی پہلو سے بھی افسانہ میں کوئی کمی نہیں ہے چنانچہ سرشت انسانی کے ایک کمزور پہلو کو اس طرح دکھاتے ہیں۔

"میں مکان کی طرف چلا تو سوچنے لگا کہ کیوں کر اپنے غصہ کا اظہار کردں۔ کیوں نہ منہ ڈھانپ کر لیٹ رہوں؟ امّاں پوچھے تو ترش ہو کر کہہ دوں۔ سر میں درد ہے۔ مجھے دق مت کرو۔ کھانا کھانے کو اٹھائے تو کرخت لہجہ میں جواب دوں۔

امّاں ضرور سمجھ جائے گی کہ کوئی بات میری طبیعت کے خلاف ہوئی ہے خوشامد کرنے لگے گی۔ اُس وقت طنز و طعن سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دوں گا۔ ایسا رلاؤں کہ وہ بھی یاد کرے۔ پھر خیال آیا اس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر مجھے اپنے دل پر قابو بھی رہے گا۔ اس کی ایک میٹھی بات میرے غیض و غضب کا سارا ہوائی قلعہ ڈھا دے گی۔

اس کمزوری پر میری طبیعت جھنجھلائی۔ یہ میری کیا حالت ہے۔ کیا اتنی جلدی ہوا کا رخ بدل گیا؟ مجھے ہوئی تھا کہ میں بھلا دے کی باتوں اور سخن ہائے دل آویز کے سیلاب میں بھی اٹل رہ سکتا ہوں۔ اب یہ کیفیت ہے کہ ان ہلکے جھوکوں کے بھی متحمل ہونے کی تاب نہیں! اس ملامت نے میرے دل کو مضبوط کیا۔ تاہم ایک ایک قدم پر غصے کی باگ ڈور ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ آخر میں نے طبیعت پر زور ڈال کر ایک فرضی و نقلی غصہ کی کیفیت پیدا کی اور ارادہ کیا کہ چلتے ہی چلتے برس پڑوں گا۔ ایسا نہ ہو تاخیر کی ہوائیں اس ابر خشک کو اڑا لے جائیں۔"

افسانے کی کامیابی میں لطیف بیان کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس میں بھی کوئی کمی نہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"بیوی کی وفات کے تین ہی ماہ بعد دوسری شادی کرنا مرنے والے کے ساتھ ایسی بے وفائی اور اُس کی روح پر ایسا ستم ناروا ہے کہ، اس کی تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ میں نہ کہوں گا کہ یہ مرحومہ کی آخری وصیت تھی۔ اور نہ شاید میرا یہ عذر ہی قابل پزیرائی سمجھا جائے کہ ہمارے کم سن بچے کے لئے ماں ایک لازمی کیفیت تھی۔ پر اس معاملہ میں میرا ضمیر بالکل صاف ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ نرخ میں میرا یہ فعل زیادہ سرزنش کے قابل نہ سمجھا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ میں نے شادی کی۔"

غرض منشی صاحب مرحوم اپنے فن میں کامل و یکتا تھے اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گراہم بیلی نے گو اپنی تصنیف تاریخ ادب اردو میں اس کا التزام کیا تھا کہ جو مصنف بقید حیات ہیں ان کا ذکر نہ کریں گے پھر بھی وہ اُردو کا افسانہ سناتے سناتے مرحوم کا ذکر کر ہی گئے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"ناولوں کی بھرمار ہوتی جارہی ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسا بڑا ناول نگار پیدا نہیں ہوا جو کریکٹر کے ارتقاء کی تصویر کھینچ سکے اور پلاٹ تیار کر سکے۔ فسانہ نگاری ترک کرکے طویل ناول شروع کرنے سے پہلے پریم چند...... نے اس باب میں قریب قریب ایک بلند درجہ حاصل کر لیا ہے اُن کے افسانے بہت قابلِ تعریف ہوتے تھے۔"

منشی پریم چند کی تمنائیں

۳ جون ۱۹۳۰ء کو منشی پریم چند نے پنڈت بنارسی داس صاحب چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کھانے بھی کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن انکا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو۔ اپنے دونوں لڑکوں کے لئے بھی میں کوئی منصوبہ نہیں رکھتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار مخلص اور مستقل مزاج ہوں۔ عیش پسند اور دولت پرست اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ دھیان ہے۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں۔"

"سونے روپے سے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہوسکتا ہے۔ دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اسکے بلند بانگ بڑبولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قایم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا پجاری ہو۔ ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بینک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریکِ غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔"

(ایک خط کا اقتباس) ۱۶ فروری ۱۹۳۵ء پریم چند

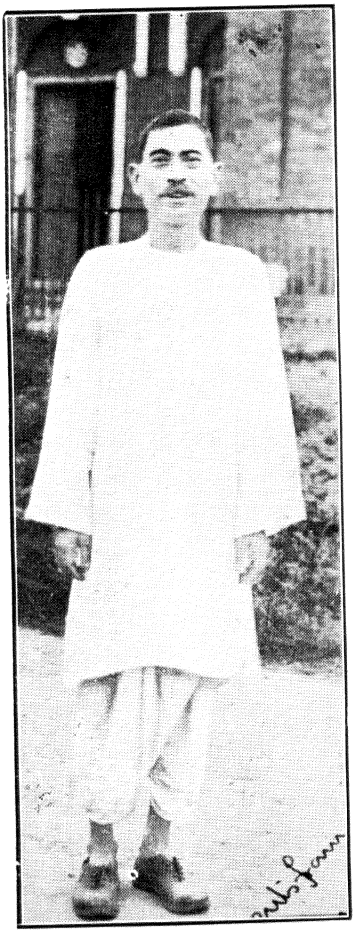

منشی پریم چند سرکاري ملازمت
سے مستعفي ہونیکے بعد

پریم چند کی یاد

از پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ

مجھے سب سے پہلے ۱۹۲۴ء میں پریم چند جی سے ملنے کا لکھنؤ میں اتفاق ہوا جب میں لبرل فیڈریشن میں شریک ہونے وہاں گیا تھا۔ اس وقت وہ "رنگ بھوم" نامی ناول لکھ رہے تھے۔ مگر انھوں نے مجھے بہت کافی وقت دیا اور ہم لوگ دیر تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ جو بات مجھے اُن کی سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ ان کا مزاج تکلف اور تصنع سے قطعی پاک تھا۔ حالانکہ ان کی شہرت تمام ملک میں قائم ہو چکی تھی لیکن کسی بات سے بھی یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ وہ خود کو کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ دراصل انھیں اپنے ملنے والوں سے تکلف برطرف کرنے کا ایک خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی بات چیت میں اُن کے ملنے والے اُن کی دوستی و رفاقت کا دم بھرنے لگتے تھے۔

اس کے بعد مجھے ۱۹۳۲ء میں اُن سے بنارس میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور دو دن تک انھیں کے مکان پر قیام رہا۔ اس لطفِ صحبت کو میں تمام زندگی نہ بھول سکوں گا۔

پریم چند بڑے خوش طبع، حاضر جواب و زندہ دل تھے۔ وہ آپ کے ساتھ گھنٹوں ہنس سکتے تھے۔ اور اپنی باتوں پر بھی ہنس پڑتے تھے۔ بنارس کی ملاقات کے بعد مجھے پریم چند سے صرف ایک مرتبہ اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ حالانکہ خط و کتابت برابر جاری رہی۔ ایک مرتبہ باتوں ہی باتوں میں دن کے دو بج گئے اور کھانا کھانے کی نوبت نہ آئی۔ یہ دیکھ کر پریم چند جی کہنے لگے کہ اتنا غنیمت ہے کہ مسز پریم چند کے پاس کوئی گھڑی نہیں ہے۔ نہیں تو اس تاخیر کے لئے جھاڑ بتاتیں۔ میں نے اس ملاقات کا جو حال "وشال بھارت" میں لکھا تو اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ پریم چند جی کی ہوشیاری دیکھیے کہ گھر بھر میں ایک ہی گھڑی رکھتے ہیں اور وہ بھی اپنے ہی پاس۔ اس کے بعد میں نے پریم چند جی سے پوچھا کہ اب وہ مسز پریم چند کو رسٹ واچ کب تک لے دیں گے۔ اس کا انھوں نے یہ ظریفانہ جواب دیا کہ جب کوئی اولوالعزم اخبار نویس مسز موصوفہ کے مضامین کا کوئی قابل قدر معاوضہ دیگا تو وہ خود ہی گھڑی خرید لینگی یا کیا عجب ہے انھیں کوئی گھڑی کسی نیازمندانہ تحفے میں مل جائے۔

پریم چند کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ جب کبھی وہ بنارس سے کہیں باہر جاتے تو مسز پریم چند کو بھی ضرور اپنے ساتھ لے جاتے۔ میں نے ایک دفعہ انھیں مشہور جاپانی شاعر ناگوچی سے ملنے کے لئے کلکتہ مدعو کیا تو اس کا یہ جواب ملا کہ اس وقت میرے دونوں لڑکے الہ آباد میں ہیں اور میں کلکتہ چلا آؤں تو میری

بیوی بنارس میں بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ اور اگر اُن کو بھی کلکتہ لاؤں تو مفت میں ایک اچھی خاصی رقم درکار ہوگی۔ اس لئے روپیہ کی زیر باری سے مکان ہی پر رہنا مناسب ہے:"

اس کے بعد میں نے کئی دفعہ انھیں کلکتہ آنے کی دعوت دی مگر انھوں نے یہی جواب دیا کہ کوئی موقعہ ہو تو میں شوق سے کلکتہ آؤنگا۔ محض سیر و سیاحت کے لئے دوسروں کی امداد پر بھروسہ کرنا مضحکہ انگیز ہے۔ ہاں کوئی ضروری موقعہ ہوگا تو بیوی سمیت حاضر ہونگا۔

———— (۳) ————

ایک مرتبہ جب میں نے پریم چند کی خانہ نشینی کی عادت پر نکتہ چینی کی اور لکھا کہ اُنھیں کم سے کم اپنا شباب و زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے سیر و سفر کرنا چاہیئے تو اس کا اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ:-

"نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے۔ بہت سے نوجوان ہیں جو مزاج کے اعتبار سے مجھ سے زیادہ بُڈھے ہوگئے ہیں، اور بہت سے مُسن لوگ ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مجھ سے بھی کہیں زیادہ نوجوان ہیں۔ لیکن اُن کو یہی خیال ہے کہ اس اعتبار سے میری نوجوانی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ میں عقبیٰ کا معتقد نہیں۔ اس لئے آخرت کا خیال جو انسان کی نوجوانی کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہے مجھے کبھی ستاتا ہی نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک صحت بخش اور دوسری جنون انگیز۔ صحت بخش جوانی کا خاصہ یہ ہے کہ انسان خطرناک غاروں سے بچتا ہوا ایک ترقی پذیر اور پُرامید راستہ اختیار کرے۔ جنون انگیز شباب میں آدمی اندھا رہتا ہے اور اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات رکھتا ہے اور اپنے ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات ناعاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں۔ اس لئے جنون کے بہتر حصہ ہی سے فائدہ اُٹھاتا ہوں۔ اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔"

———— (۴) ————

ایک دفعہ میں ایک خط میں یہ پوچھ بیٹھا کہ آپ کا کوئی خاص ارمان ہو تو بتائیے، اس کا جواب مجھے عرصہ تک یاد رہیگا، اُنھوں نے لکھا کہ:-

"میرا کوئی اور ارمان نہیں بلکہ سب سے زبردست خواہش یہی ہے کہ ملک کو سوراج کی جدوجہد میں کامیابی حاصل ہو، دولت یا شہرت کی کوئی آرزو تو نہیں ہے، کھانے بھر کو مل ہی جاتا ہے، موٹر اور بنگلہ کی ہوس نہیں، ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں چھوڑ جاؤں۔ بچوں کو بھی یہی چاہتا ہوں کہ ایماندار سچے اور ارادے کے پکّے ہوں۔ تن آسان، عیش پسند اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔"

(۵)

اکثر معاملات میں میری اور اُن کی رائیں مختلف تھیں۔ مثلاً پریم چند جی ٹالسٹائی کے بڑے مداح اور قدر دان تھے، جب میں اُن کے سامنے دوسرے روسی مصنف ترگنیف کی تعریف کرنے لگا تو بلا کسی پس و پیش کے کہنے لگے کہ ٹالسٹائی کے سامنے ترگنیف کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بہر حال اس پر میرا اُن کا اختلاف رائے رہا۔

(۶)

میں چاہتا تھا کہ پریم چند جی کو مسٹر اینڈریوز سے ملاؤں لیکن میں اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مسٹر ممدوح ان کے بعض قصوں کے انگریزی ترجمے کو ایڈٹ کر کے کتابی شکل میں چھپوانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن پریم چند نے بالآخر یہی جواب دیا کہ:۔

"آپ میرے قصوں میں جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لئے میں آپ کا تہ دل سے شکر گذار ہوں لیکن جب تک مجھے کوئی قابل مترجم نہ ملے اس وقت تک پادری اینڈریوز صاحب کو مفت میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ درحقیقت ابھی اُس کا وقت نہیں آیا ہے لیکن جب وقت آ جائیگا تو معین و مددگار از خود پیدا ہو جائیں گے۔"

ہماری درس گاہیں

ہماری تعلیم گاہوں میں جتنی سختی سے فیس وصول کیجاتی ہے اتنی سختی سے شاید کاشتکاروں سے مالگذاری بھی وصول نہیں کی جاتی۔ مہینے میں ایک دن وصولی کے لئے معین کر دیا جاتا ہے۔ اس دن فیس کا داخل کرنا لازمی ہے۔ یا تو فیس دیجئے یا نام کٹوائیے یا جب تک فیس داخل نہ ہو روز کچھ جرمانہ دیجئے کہیں کہیں ایسا بھی قاعدہ ہے کہ اگر اُس تاریخ کو فیس وصول نہ ہوئی تو دگنی کر دی جاتی ہے۔ اور فیس کی وصولی کے لئے دوسری تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اُس تاریخ کو فیس وصول نہ ہوئی تو نام یقیناً کٹ جائے گا۔ ایسے جابرانہ قواعد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ غریبوں کے لئے مدرسے کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ قرض لو۔ گھر کے برتن بیچو چوری کرو مگر فیس ضرور دو۔ ورنہ دوگنی دینی پڑے گی۔ یا نام رجسٹر سے خارج ہو جائے گا۔ زمین و جائداد کے مطالبوں میں تو کبھی کبھی کچھ رعایت کی جاتی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں نرمی ممنوع ہے۔ یہاں مستقل طور پر فوجی قانون برتا جاتا ہے۔ دیر میں آئیے تو جرمانہ۔ کتابیں نہ خرید سکئے تو جرمانہ۔ کوئی خطا ہو تو جرمانہ۔ تعلیم گاہ کیا ہے جرمانہ گاہ ہے۔ عدالتوں میں پیسے کا راج ہے۔ ہمارے مدرسوں میں بھی پیسے کا راج ہے۔

(میدان عمل)

پریم چند

منشی پریم چند اور فلم کمپنیاں

از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔ اے بمبئی

منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات دفتر زمانہ کانپور میں سنہ ۱۹۱۶ء یا سنہ ۱۹۱۷ء میں ہوئی تھی جب میں تھیاسوفیکل ہائی اسکول کی ملازمت کے سلسلہ میں کانپور میں رہا کرتا تھا۔ اُس کے بعد کانپور ہی میں دو ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرحوم اُس زمانہ میں کسی اسکول سے وابستہ تھے۔ محض اپنے پرائیویٹ مطالعہ کے زور پر بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت بھی انھیں اتنی شہرت حاصل ہو چکی تھی جو کسی دوسرے مصنف کو مشکل سے نصیب ہوگی۔ اُس ملاقات کی کچھ یاد دماغ میں محفوظ رہ گئی ہے بہر حال اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم سے میں نہایت خلوص سے ملا تھا اور اس میں برابر اضافہ ہی ہوتا گیا۔

منشی پریم چند جون یا جولائی سنہ ۱۹۳۴ء میں اجنتا سینے ٹون میں ملازم ہو کر بمبئی تشریف لائے مگر یہاں اُن کے قیام کا زمانہ کچھ طویل نہ رہا۔ غالباً وسط سنہ ۱۹۳۵ء سے پہلے وہ بمبئی سے ہمیشہ کے لئے تشریف لے گئے۔ یہاں کی آب و ہوا اور یہاں کا ماحول انھیں بالکل راس نہیں آیا۔ اس کی شکایت اُنہوں نے ایک خط میں بھی کی ہے جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

(۲)

بمبئی کے زمانہ قیام میں مرحوم سے میرے خاصے اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے انھیں تعلقات کی بنا پر میں کبھی کبھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اُن کی عادت تھی کہ شام کا وقت کسی نہ کسی تفریح گاہ میں گزارا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپالو تشریف لے جاتے تو راستہ میں دفتر میں مجھ سے ملتے ہوئے جاتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے از راہ مہربانی اپنے ایک تازہ افسانہ سُنایا جو ہلاکو کی زندگی سے متعلق تھا اور جو اُس زمانہ میں کسی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت مسٹر سید محمد یعقوب بھی میرے ہمراہ تھے۔

بمبئی تشریف لانے سے قبل انہوں نے بمبئی کی ایک فلم کمپنی مہالکشمی سینے ٹون کو اپنے ایک

ناول کی فلم بنانے کی اجازت دیدی تھی۔ چنانچہ وہ ناول "سیوا سدن" کے نام سے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوا۔ صحیح معاوضہ کی تو خبر نہیں لیکن سننے میں آیا تھا کہ مہالکشمی سینے ٹون نے پندرہ سو یا دو ہزار روپئے دیئے ہیں۔

اجنتا سینے ٹون سے وابستہ ہو جانے کے بعد انہوں نے دو ڈرامے اور لکھے۔ ایک کا نام "مل" تھا دوسرے کا "نوجیون"۔ اول الذکر میں ہندوستان کے مزدوروں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا دوسرے میں پرانے زمانے کے راجپوت کے حالات پیش کئے گئے تھے۔ افسوس حکومت بمبئی نے "مل" کو قابلِ اعتراض ٹھہرا کر اس کی نمائش بند کر دی۔ پنجاب میں البتہ یہ فلم کچھ دنوں تک دکھائی گئی تھی، لیکن جب حکومت بمبئی نے اُسے بند کر دیا تو پنجاب گورنمنٹ نے بھی اسکی پیروی میں اُس کی اشاعت حکماً بند کر دی۔ بار بار کی ترمیموں سے اصل افسانہ کا حُلیہ بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا لیکن مسٹر بھوٹانی (مالک کمپنی) ڈیڑھ سال کی کوششوں کے بعد اُسے بالآخر "غریب مزدور" کے نام سے دکھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فلم کی تیاری میں خود منشی صاحب نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس میں اُنہوں نے یونین کے پریسیڈنٹ کا پارٹ ادا کیا ہے جو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے مابین صلح کرانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس فلم کے کہانی کا ڈھانچہ کمپنی نے تیار کیا تھا۔ اور اس پر گوشت و پوست منشی صاحب نے منڈھ دیا تھا۔ دونوں فلموں کی زبان اُن کے اور افسانوں کی طرح نہایت اچھی اور دل پر اثر کرنے والی تھی۔

چونکہ مرحوم کی صحت بمبئی میں اچھی نہ رہتی تھی اور اجنتا سینے ٹون کمپنی بھی بند ہونے کے قریب تھی اس لئے مرحوم نے بمبئی میں مزید قیام کا ارادہ ترک کر دیا۔ مسٹر بھوٹانی کہتے ہیں کہ انکی کمپنی منشی صاحب موصوف کو سات سو روپئے ماہانہ ادا کیا کرتی تھی۔

بمبئی ٹاکیز کے ڈائرکٹر مسٹر ہمنسو رائے جو "لائٹ آف ایشیا" اور "کرما" جیسی کامیاب فلمیں بنا چکے ہیں اس امر کے خواہشمند تھے کہ منشی صاحب کسی طرح اُن کی کمپنی سے وابستہ ہو جائیں چنانچہ جب اُنہوں نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے منشی صاحب سے اُن کی ملاقات کرا دی لیکن ملاقات کے وقت انہوں نے بمبئی کی خراب آب و ہوا کا عذر کیا اور فرمایا کہ میں اجنتا سینے ٹون سے علیحدگی کے بعد بنارس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرحوم فلمی کام سے بددِل ہو چکے ہیں اس لئے کہ جب مسٹر ہمنسو رائے نے اُن سے درخواست کی کہ وہ بنارس ہی سے اُن کی کمپنی کے لئے افسانے لکھ کر بھیجا کریں تب بھی

اُنہوں نے اپنے معذوری کا اظہار کیا اور اپنی جگہ پر مسٹر کیشب کی سفارش کر دی جو آج کل بمبئی ٹاکیز میں کام کر رہے ہیں۔

آخر میں میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ منشی صاحب کی جو ادا مجھے خاص طور پر پسند تھی، وہ اُن کی انتہائی سادگی اور شرافتِ نفس تھی۔ کپڑے اتنے سادہ پہنتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور ہی نہیں ہو سکتا، اُن کی ذاتی ضروریات اس قدر کم تھیں کہ چھوٹے پیمانہ پر مہاتما گاندھی نظر آتے تھے۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے پیش آنا اُن کی سیرت میں داخل تھا۔ وہ تکلیفوں میں بھی ہمیشہ ہنس مکھ رہا کرتے تھے۔ اُن کی قلبی شرافت کا اِس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی زبان اور قلم سے کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ مہربانی، منکسر مزاجی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان میں اور باہر بھی غیر معمولی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اُن میں کبھی خود نمائی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ وہ اس سے واقف ہی نہ تھے کہ خود نمائی کیا چیز ہوتی ہے۔ کبر و نخوت سے وہ کوسوں دور تھے۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا بھی وہ زندہ مجسمہ تھے۔ غرض اُن میں وہ تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں جو لوگوں سے پہلی ہی ملاقات میں خراجِ احترام حاصل کر لیا کرتی ہیں۔

پریم چند کے بہترین افسانے

پریم چند کے بہترین افسانے ان کی نظر سے

پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ نے منشی پریم چند سے ان کے بہترین افسانوں کے نام پوچھے تھے۔ منشی صاحب نے پنڈت جی کو جو جواب دیا اُس کا اقتباس یہ ہے:-

"آپ کے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ میرے سب سے اچھے افسانے کون ہیں۔ اب تک دو سو سے زیادہ افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کہاں تک انتخاب کروں یادداشت پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں،

(۱) بڑے گھر کی بیٹی (۲) رانی سارندھا (۳) نمک کا داروغہ (۴) سوت (۵) زیور۔ (۶) کفارہ (۷) تمنا (۸) مندر اور مسجد (۹) گھاس والی (۱۰) بچ اکبر (۱۱) ستیاگرہ۔ (۱۲) بدنامی (۱۳) ستی (۱۴) لیلیٰ (۱۵) منتر۔

میں کسی مصنف کے طرز سے خاص طور پر متاثر نہیں ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا زیادہ اور ڈاکٹر ٹیگور کا اثر مجھ پر ضرور ہوا ہے۔" اردو

منشی پریم چند کے معترضین

از منشی راج بہادر لمگوڑہ ایم ۔ اے ۔ ایل ایل بی

سب سے پہلے مجھے موصوف کی چھوٹی کہانیوں سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ میرے خیال میں اس فن میں ہندوستان کیا، دوسرے ملکوں میں بھی موصوف سے شاید ہی کوئی سبقت لے گیا ہو۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات سے مجھے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے اور ان میں تو مجھے موصوف سے بڑھ کر چھوٹے قصوں کا لکھنے والا نظر نہیں آیا۔

دس بارہ سال ہوئے آپ کی بڑھتی ہوئی شہرت کو دیکھکر اودھ اپادھیائے جی نے اعتراض اٹھایا تھا کہ آپ کا رنگ بھومی (چوگانِ ہستی) نام ناول تھیکرے کے مشہور ناول وینٹی فیر (Vanity Fair) کی نقل ہے۔ میں نے اُن دونوں کتابوں کا بغور مطالعہ کیا اور رسالہ سرسوتی الہ آباد میں اس مسئلہ پر ایک مضمون بھی لکھا۔ آخر حقیقت حال روشن ہوگئی۔ رنگ بھومی پر ایک گرانقدر ادبی انعام بھی دیا گیا۔ اس وقت منشی پریم چند کا ایک خط اسمی حضرت سحر ہنگامی کے میرے سامنے ہے جس کا ضروری اقتباس ہے:۔

"مکرمی منشی راج بہادر صاحب کا خط بھی دیکھا تسکین ہوئی۔ آپ صاحبان کا خیال بالکل درست ہے۔ الہ آباد میں ایک برہمن پارٹی ہے۔ اودھ اپادھیائے جی اُس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں لکھکر مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ رنگ بھوم اور وینٹی فیر میں ذرہ بھر بھی مناسبت نہیں ہے۔ اور پریم آشرم (گوشہ عافیت) کو ریسرکشن (Resurrection.) کے مماثل بتلانا تو حد درجہ بیہودگی ہے۔ میں نے آج تک ریسرکشن پڑھا بھی نہیں، حالانکہ اس کی تعریف بہت سُن چکا ہوں۔ ایسی مماثلت جیسے اپادھیائے جی دکھلاتے ہیں قریب قریب سبھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وینٹی فیر میں ایک آدمی غلط سلط انگریزی بولتا ہے اسی سے رنگ بھومی میں ایک بنگالی بابو لائے گئے۔ اس شخص کو یہ بھی خبر نہیں کہ بنگالی بابو کیوں لائے گئے۔ اُن کے وجود کا منشاء کیا ہے۔ اندیا کو آپ صوفیہ سے ملاتے ہیں حالانکہ صوفیہ کا اصل مسز اینی بسنٹ ہیں۔"

میں یہ نہیں کہتا کہ ایک علم کے اصول دوسرے علم میں برتے ہی نہ جائیں۔ دیکھئے ارتقاء کا مسئلہ سائنس نے دریافت کیا جو ہر جگہ استعمال ہوتا ہے۔ ہاں احتیاط لازم ہے۔ ریاضی میں مساوات کا اصول بہت قابل قدر ہے

جس سے نامعلوم شے یعنی لا کی قیمت معلوم ہو جاتی۔ مگر مساوات اور نقل میں فرق ہے۔ اگر کوئی بات جیوں کی تیوں رکھدی جائے تو نقل ہوئی جس میں نہ کوئی مزہ ہے نہ لطف۔ جیسے ۹ = ۹ لکھا جائے تو بے معنی سا معلوم ہوگا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ۴ + ۵ = ۱۱ - ۲، تو مساوات بنتی ہے۔ اپادھیائے جی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ صوفیہ = امیلیا + ربیکا کے بہت سے جزو۔ جب منشی پریم چند خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے صوفیہ کا خیال مسز بیسنٹ صاحبہ کی شخصیت سے لیا ہے تو کوئی شک باقی ہی نہیں رہتا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا اور وقعی صوفیہ کو وینٹی فیئر ہی سے لیا جاتا اور امیلیا اور ربیکا کے خصلتی اجزا سے اُس کی ترتیب دی جاتی تو بھی ہم اُسے نقل کیسے کہہ سکتے تھے؟ یہ تو مساوات ہی ہوتی اور مساوات بلا جدت کے بن نہیں سکتی۔ علم ریاضی میں جوڑ، باقی، ضرب، تقسیم، یہی چار بنیادی اُصول ہیں اور ایک سے نو تک بنیادی عدد اور ایک صفر۔ ماہرانِ ریاضی انھیں کے مختلف استعمال سے بیشمار سوالات مرتب کر چکے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے جنھیں کوئی بھی نقل نہیں کہے گا۔ کیا یہ جدت نہیں ہے کہ ایک ناولسٹ کئی جگہ سے مسالہ لیکر اپنے ناول کی ترتیب دے ٹھیک اُسی طرح پر جیسے پچی کار مختلف رنگ کے پتھروں کو گڑھ کر اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ نئے نئے بیل بوٹے بن جاتے ہیں۔ شکسپیئر نے پلوٹارک (Plutarch) کی کتابوں سے اپنے ناٹکوں کے پلاٹ لئے، مگر اُسے کوئی نقال نہیں کہتا۔ گوسوامی تلسی داس جی نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ چاروں وید چھ شاستر اٹھارہ پران اور تمام گرنتھوں کا رس لیکر رامائن بنی ہے، مگر اُسے کوئی نقل نہیں کہتا۔ بقول ٹیگور علمی دنیا میں بھی ٹھیک اسی طرح ساکھ پر کام ہوتا ہے جیسا تجارتی دنیا میں، شرط یہ ہے کہ مصنف میں اصل کو معہ سود واپس کر دینے کے قابلیت ہو اور ساتھ ہی وہ اپنے لئے کچھ نفع بھی اُٹھا سکے۔"

آج پریم چند جی نہیں ہیں مگر اُن کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا، کیونکہ وہ اپنے طرز کے اُستاد اور اپنے فن کے زبردست ماہر تھے۔

عورت کا سہاگ

سہاگن عورت کیلئے اُسکا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے۔ وہ اسی کیلئے جیتی ہے اور اُسی کیلئے مرتی ہے۔ اُسکا ہنسنا، بولنا اسی کو خوش کرنے کے لئے اور اُس کا بناؤ سنگھار اُسی کے لبھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اُس کا سہاگ اُس کی مسرت اور زندگی ہے اور سہاگ کا اُٹھ جانا اُس کی زندگی اور جانداری کا خاتمہ ہے۔ (جلوۂ ایثار ۱۴۰)

ﷲ آخر مصنف بھی اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے کام لیتا ہے

پریم چند کی باتیں

از ایڈیٹر زمانہ

میرے لئے پریم چند کے متعلق کوئی مدلل و مفصل مضمون لکھنا آسان کام نہین ہے۔ ان کا خیال آتے ہی سالہا سال کی سیکڑوں پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہین۔ اور میں ان میں گم سا ہو جاتا ہوں۔

تیس سال کے قریب میرا ان کا دوستانہ نہیں بلکہ حقیقی طور پر برادرانہ تعلق رہا۔ ذہنی طور پر ہم دونوں ہر معاملے میں ہمخیال نہیں تو ایک دوسرے کے بڑے ہمدرد ضرور تھے اور وہ اکثر اصولی و ضروری باتوں میں میری رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ گو وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے لیکن شروع سے آخر تک وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے رہے جن دنوں ہر وقت کی بے تکلفی اور ہنسی دلگی رہتی تھی اُس وقت بھی وہ میری باتون کی بڑی قدر کرتے اور میرا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے عزیز اُن کے عزیز اور میرے احباب اُن کے احباب ہو گئے۔ مجھے بھی انکے کسی معاملے میں دخل دینے میں کبھی پس و پیش نہیں ہوا۔ بہت سے اُمور میں تو جو میری رائے ہوتی اسی پر وہ کاربند ہوتے تھے۔

کئی سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق رہا، اور یہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ پریم چند۔ نوبت رائے نظر، درگا سہائے سرور اور کئی احباب واغراشام کے وقت دو تین گھنٹہ کے لئے یکجا ہو جاتے اور زندگی کا کوئی مرحلہ اور دین و دنیا کا کوئی مسئلہ ان یاران بے تکلف کے غور و فکر سے محفوظ نہ رہتا، واقعات عالم پر بحثیں ہوتیں، ہر معاملہ پر رد و کد ہوتی، ہر مسئلہ کی چھان بین کیجاتی، ایک دوسرے کی نکتہ چینی ہوتی۔ خوب مذاق ہوتا، قہقہے پر قہقہے اُڑتے۔ غرض اب ان صحبتوں کی یاد دل سے ٹلائے سے بھی نہیں مٹ سکتی افسوس اب یہ باتین کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔ مگر ان کا لطف دل میں ہمیشہ باقی رہے گا۔

اے رفتگانِ محفلِ ما   رفتید و لے نہ از دلِ ما

آخری حصۂ زندگی میں ہم لوگ ایک عرصے سے اپنے اپنے مصروفیات میں کچھ ایسے مشغول رہے کہ کہاں روز کا ساتھ اور کہاں برسوں میں دو چار دن کی یکجائی بھی مشکل ہو گئی۔ مگر اس اخلاص اور محبت کی کیا تعریف کی جائے کہ مہینوں برسوں میں جب کبھی ملنے کا موقعہ ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ پرانا زمانہ از سر نو عود کر آیا۔ اگرچہ

کوئی غلط فہمی یا شکر رنجی بھی ہوتی تو دو ہی خط میں صفائی ہو جاتی اور پھر پرانی محبت و بے تکلفی کا نقش ابھر آتا اپریل ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں دو دن تک لکھنؤ میں جو لطف صحبت رہا اس کا نقش دل پر ہمیشہ باقی رہیگا۔ تمام مجمع میں ہمیں دو آدمی ایسے تھے جن کو تیسرے شخص کی ضرورت نہ تھی۔ صدارتی تقریر کے بہت سے احباب مشتاق تھے لیکن انھوں نے "زمانہ" ہی کو اس کے اشاعت کی عزت دی۔ کانگریس کی نمائش کی بھی ساتھ ہی سیر ہوئی اور قدم قدم پر فقرہ بازیاں رہیں۔ کانپور کے ہندی شاعر ہردیش بھی ساتھ تھے۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں بیمار ہو کر آخری مرتبہ لکھنؤ آئے تب بھی مجھی کو یاد کر کے بلایا اور جب میں پہونچا تو اس طرح دل کھول کر ملے جیسے کوئی مدتوں کا بچھڑا ہوا بھائی برسوں کی مفارقت کے بعد ملتا ہے۔ چند ہی روز میں کئی ڈاکٹروں سے مشورہ ہوا۔ رائے بہادر ڈاکٹر ہرگوبند سہائے نے بھی بڑے خلوص و توجہ سے طبی معائنہ کیا اور نہایت ہمدردی سے مرض کی نوعیت و اہمیت دل نشین کی۔ میرا دل تو اسی وقت بیٹھ گیا، پریم چند بھی سمجھ گئے لیکن لڑکا ساتھ تھا اور اس کے خیال سے ناامیدی ظاہر نہ کی چند ہی روز کے اندر دو تین دفعہ لکھنؤ دیکھنے گیا۔ جب علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو وہ پھر بنارس واپس گئے، اور اس مرتبہ ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے!

موت سے پندرہ دن پہلے تار دے کر مجھے بنارس بلایا، تمام راستہ عجب امید و بیم کی حالت میں کٹا، صبح کو آخری ملاقات کا سماں عمر بھر نہ بھولے گا۔ وہی پریم چند جو اپنی سرخ و سپید صورت کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک تھے، ایسے نزار و نزار ہو گئے تھے کہ مشکل سے پہچان پڑتے تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بیٹھے ہوئے گال کانٹے کی طرح سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھ کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اُن کے مسلسل قہقہے بات کرنے کی بھی مہلت نہ دیتے تھے، مگر اب آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ نہ اُٹھنے کی طاقت تھی اور نہ بیٹھنے کی سکت۔ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ پکڑ لیا اور گلے سے چپٹا لیا۔ جیسے کوئی ڈرا ہوا بچہ بلک بلک کر سینہ سے چمٹنے کی کوشش کرے۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بات کرنے میں بھی تھکن ہوتی تھی، تاہم دم لے لے کر آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہی رہے میں نے منع کرنا چاہا تو کہنے لگے کہ "دوبارہ ملاقات کی اُمید نہیں ورنہ تمہارا کہنا نہ ٹالتا یہاں اور جو کوئی آتا ہے یاس انگیز باتیں کر کے پریشان کر جاتا ہے۔ بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ ڈھارس نہ بندھائے رہتیں تو کب کا مر چکا ہوتا۔" واقعی مسز پریم چند جی نے ان دنوں بڑی ہمت سے کام لیا، اور دلشکن حالات میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دلی صدمے کو اُن پر ظاہر نہ ہونے دیا، اگر کبھی انھوں نے مایوسی کی بات بھی کی تو سمجھا بجھا کر تسلی دیدی اسی لئے کہتے تھے کہ ان کے بغیر خدا معلوم میرا کیا حال ہوتا۔ واقعی اس روحانی اذیت میں مسز ممدوحہ نے جس صبر و تحمل و مستقل مزاجی سے کام لیا اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مگر انکی قوت ارادی اور بلند ہمتی بھی کچھ کام نہ آئی۔ آئی اٹل تھی، ہو کر رہی۔

پریم چند کے عادات و اخلاق کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ملک کے نامور انشا پرداز، بڑے بڑے اہل قلم اور واقف حال دوست احباب ان کی قابل قدر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مختلف مسائل زندگی پر اُن کے خیالات اور جذبات، اصول، اور نظریے احباب کے روبرو پیش کروں۔ اور بعض ذاتی حالات و واقعات بھی جو اکثر اصحاب کے علم میں نہیں ہیں یا جو اُن کے مضامین میں نظر انداز ہو گئے ہیں مختصراً بیان کر دیئے جائیں۔

پریم چند جی کا اصلی نام اور ولدیت و سکونت وغیرہ تو سب کو معلوم ہے، یہ بھی سب لوگ جانتے ہیں وہ سنہ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے، اُن کی ابتدائی مشکلات زندگی کا حال بھی دیگر مضامین میں آ چکا ہے انٹرینس پاس کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۰۳ء کے سشن میں تعلیم حاصل کر کے انھوں نے اپریل سنہ ۱۹۰۴ء میں جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اس کے سرٹیفکیٹ مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۹۰۵ء میں جس پر مسٹر جے۔ سی۔ کیمسٹر پرنسپل اور مسٹر بکین انسپکٹر مدارس الہ آباد سرکل کے دستخط ہیں عبارت ذیل قابلِ ذکر ہے:۔

Not qualified to teach Mathematics, Conduct satisfactory and regular. He worked earnestly and well.

(یعنی ممتحن نے اس سرٹیفکیٹ میں یہ صاف لکھ دیا ہے کہ "ریاضی پڑھانے کی قابلیت نہیں ہے مگر چال چلن قابل اطمینان رہا اور وہ پابند اوقات بھی رہے اور اپنا کام جانفشانی اور خوبی سے کیا۔)

سنہ ۱۹۰۴ء میں قدیم الہ آباد یونیورسٹی کا اسپیشل ورنیکلر امتحان بھی اُردو ہندی دونوں میں پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کئی بار دیا لیکن ہر دفعہ ریاضی میں ناکامیاب ہوئے۔ آخر جب یہ مضمون لازمی نہیں رہا اور اختیاری ہو گیا تو سنہ ۱۹۱۰ء میں سکنڈ ڈویژن میں اس کو بھی پاس کر لیا۔ اُس وقت وہ گورنمنٹ اسکول بستی میں اسسٹنٹ ٹیچر تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں ان کے مضامین یہ تھے:۔

انگریزی - منطق - فارسی اور زمانہ حال کی تاریخ

نو سال کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں جب گورکھپور میں ٹیچر تھے تو الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان بی۔ اے بھی سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس مرتبہ اُن کے سبجکٹ یہ تھے:۔ انگریزی۔ فارسی اور تاریخ۔

سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک گورنمنٹ اسکول کانپور میں اسسٹنٹ ٹیچر رہے۔ اس اثنا میں عرصہ تک ایڈیٹر "زمانہ" کے ساتھ اور پھر اُن کے قریب ہی ایک دوسرے مکان میں رہے۔ کانپور سے مہوبا ضلع ہمیرپور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر گئے[1] اور مہوبا میں چھ سال تک مسلسل رہے اور یہیں بعض مشہور افسانے لکھے۔ "آلہا" "رانی سارندھا" "وکرمادت کا تیغہ" اور بندیلوں کی بہادری کے بہت سے

---

[1] جون سنہ ۱۹۰۹ء

قصّے جو اپنا جواب نہیں رکھتے اسی زمانہ کی تصنیف ہیں۔ گرمھوبا میں وہ بیمار ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں تبدیلی کی درخواست دی۔ خیال تو یہ تھا کہ کوئی اچھا مقام ملے گا لیکن تبدیلی بستی میں ہوئی، جہاں جولائی ۱۹۱۴ء سے ڈھائی سال تک برابر رہے، پہلے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے پھر جب مسلسل دوروں کا بار برداشت نہ ہوسکا اور صحت خراب ہی تو مجبور ہو کر پھر مدرسی پر لوٹے اور جولائی ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ اسکول بستی کے اسسٹنٹ ٹیچر ہو گئے۔ یہاں سے اگست ۱۹۱۸ء میں نارمل سکول گورکھپور کے اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہو کر بھیجے گئے گورکھپور میں وہ نسبتاً خوش رہے۔ چند ہی دنوں میں نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اُن کے قدر دان ہو گئے اور کئی علم دوست اصحاب کا ساتھ ہو گیا۔ رگھوپت سہائے صاحب فراق اور مہا بیر پرشاد جی پوتدار سے یہیں ملاقات اور دوستی ہوئی، یہیں اُن کا بڑا لڑکا (سری پت رائے) پیدا ہوا۔ یہیں وہ کانگریس کی تحریک عدم اشتراک عمل میں شامل ہوئے دو سال تک وہ نارمل اسکول بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ بھی رہے جس کے لئے علاوہ تنخواہ اُنھیں پندرہ روپیہ ماہوار کا الاؤنس ملتا تھا۔ گورکھپور میں وہ مارچ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ ایک مرتبہ درمیان میں وہ پھر زیادہ بیمار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اُنھیں کئی ماہ کی رخصت لینا پڑی، کئی جگہ علاج کے لئے گئے، اور کانپور بھی آئے تھے۔

آخر فروری ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے نان کوآپریشن کے سلسلہ میں سرکاری ملازمت سے استعفےٰ دے دیا[1] اور پوتدار جی کی امداد و اعانت سے شرکت میں ایک چرخہ کی دوکان کھلوائی، مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مارچ ۱۹۲۲ء میں بنارس چلے گئے اور اسی ماہ وہ کانپور آئے۔ اور مہاشے کاشی ناتھ جی منیجر مارواڑی اسکول کی کوشش سے اس اسکول کے ٹیچر ہو گئے۔ اس دفعہ اُنھوں نے میسٹن روڈ میں مکان لیا جہاں اگست ۱۹۲۲ء میں اُن کا دوسرا لڑکا امرت رائے پیدا ہوا۔ کاشی ناتھ جی بڑے محب وطن اور ہمدرد انسان ہیں مگر اسکول کے انتظام میں اُن سے پریم چند کی اَن بن ہو گئی۔ اس طرح مارچ ۱۹۲۳ء میں وہ یہاں سے مستعفی ہو کر پھر بنارس چلے گئے اور اپنے مکان واقع موضع لمہی میں رہنے لگے جو بنارس سے ۴ ½ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں انھوں نے کئی ہزار روپیہ کی لاگت سے ایک پختہ مکان بنایا۔ اور یہیں آباد ہو کر لٹریری کام کرنے کا تہیہ کیا۔ لیکن ہندی کے نامور سرپرست سریجت شیو پرشاد جی گپت کی تحریک پر اُنھوں نے ہندی رسالہ "مریادا" کا ایڈیٹوریل چارج لے لیا۔ اس کے ایڈیٹر بابو سمپورن آنند جی کو نان کوآپریشن کے سلسلے میں جیل جانا پڑا تو گپت جی نے پریم چند جی کو یاد کیا۔ ڈیڑھ سال تک وہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے اور جب شریجت سمپورن آنند جی جیل سے واپس آئے تو گپت جی نے پریم چند کو کاشی ودیا پیٹھ میں ٹیچر مقرر کر دیا اس طرح سرکاری ملازمت سے استعفے کے بعد گپت جی نے پریم چند جی کی امداد و اعانت کا برابر خیال رکھا۔

[1] گورکھپور سے ۱۵ فروری ۱۹۲۱ء کا کارڈ ہے جس میں لکھتے ہیں کل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گیا، آج استعفےٰ منظور ہو گیا۔

"مریادا" میں اُنھیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملتے تھے لیکن ودیا پیٹھ میں صرف سوا سو کی تنخواہ ملی۔ بہرحال ایک سال تک یہ خدمت بھی انجام دی۔ اس کے بعد اُنھوں نے بلا منّت غیرے زندگی بسر کرنے کے خیال سے تین صاحبوں کی شرکت میں (جنمیں سے ایک فراق صاحب اور دو اُن کے قریبی عزیز تھے) سرسوتی پریس قائم کیا۔ اسمیں خود انھوں نے ساڑھے چار ہزار روپیہ لگایا، لیکن جب کافی منافع نہ ہوا تو رفتہ رفتہ پریس کی ساری ذمہ داری انھیں پر آپڑی۔ اب وہ ایسی تجارتی کشمکش میں پڑ گئے جس کے لئے اُن کی طبیعت موزوں نہ تھی۔ پیہم نقصانات نے انھیں پھر دوسروں کی ملازمت کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ اس اثنا میں اور اس سے پہلے بھی کئی بار "زمانہ" میں آنے کا ارادہ ہوا[1]، مختلف اسکیمیں بنیں لیکن ایک طرف مالی بےبضاعتی دوسری طرف اُن کی صریح ضروریات کی وجہ سے کوئی اسکیم مکمل نہ ہو سکی۔ تو ۱۹۲۵ء میں ہندی کے مشہور دارالاشاعت گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ میں غالباً سو روپیہ ماہوار پر انھوں نے لٹریری اسسٹنٹ کی اسامی قبول کرلی۔ یہاں دس ماہ تک کام کیا لیکن گذارہ نہ ہوا تو اپریل ۱۹۲۶ء میں پھر بنارس لوٹے اور جون ۱۹۲۸ء تک وہیں رہے۔ جولائی ۱۹۲۸ء میں منشی بشن نراین صاحب بھارگو مالک مطبع منشی نولکشور کی قدردانی نے انھیں پھر لکھنؤ کھینچ بلایا۔ منشی صاحب پریم چند جی کے ہندی افسانوں کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے دو سو روپیہ ماہوار پر اپنے مشہور ہندی رسالہ "مادھوری" کی ایڈیٹری اُن کے سپرد کردی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۲۸ء سے نومبر ۱۹۳۱ء تک وہ نولکشور پریس میں رہ کر مطبع کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ منشی بشن نراین صاحب ایک نوجوان و اُولوالعزم علم دوست رئیس تھے اور گو اُنھوں نے درویشانہ طبیعت پائی تھی تاہم بعض رئیسانہ شوق بھی دامنگیر تھے، مزاج میں ازحد مروّت تھی، دل غنی اور دماغ جمع خرچ کی اُلجھنوں سے آزاد تھا، وہ ہر صیغہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کرنا چاہتے تھے مگر استقلال و جفاکشی سے کسی کی طرف رجوع نہ ہوتے تھے اور مطبع خسارہ سے چل رہا تھا، "مادھوری" کا ایڈیٹوریل اسٹاف بھی کافی سے زیادہ تھا۔ چنانچہ کارخانہ کو ترقی دینے کے خیال سے پریم چند کو تصنیف و تالیف کے صیغہ میں منتقل کیا گیا، جہاں اُنھوں نے کئی زیرِ طبع کتابوں کی نظر ثانی کرنے کے علاوہ ابتدائی درجوں کیلئے اُردو ہندی ریڈریں بھی مرتب کیں۔ اِسی سلسلے میں اُنھیں مکرمی مرزا عسکری صاحب اور حضرت آسی لکھنوی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مگر منشی بشن نراین صاحب کی ناوقت وفات نے تمام منصوبے ختم کر دیئے۔ اور ریاست کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہو گئی جس کے عہدِ حکومت میں اہلِ کمال کی قدردانی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مسٹر منرو ڈپٹی کمشنر سے کہا سُنا گیا لیکن یہاں اصحابِ حل و عقد نے موقعہ غنیمت جانکے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس طرح نومبر ۱۹۳۱ء میں پریم چند جی کا مطبع نولکشور سے بھی قطع تعلق ہو گیا۔

[1] اس زمانہ میں بعض احباب کی اپنی ریشہ دوانیوں کا بھی موقعہ ملا۔

مگر چونکہ لڑکے لکھنؤ ہی میں تعلیم پا رہے تھے اس لئے اپریل ۱۹۳۲ء تک آپ کو بھی لکھنؤ رہنا پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر بنارس چلے آئے اور ایکسال یعنی مئی ۱۹۳۵ء تک اپنے مطبع سرسوتی پریس کا کام دیکھتے بھالتے رہے اس اثنا میں وہ اُردو سے بالکل مایوس سے ہوکر ہمہ تن ہندی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تصنیف وتالیف کے علاوہ انھوں نے ہر ممکن طریقے سے پریس کو فروغ دینا چاہا۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں اُنھوں نے "ہنس" نامی ایک ہندی ماہوار رسالہ جاری کیا۔ مگر چھ مہینہ بھی مشکل سے گذرنے پائے تھے کہ جون ۱۹۳۰ء میں آرڈیننس کے ماتحت اس سے ایک ہزار کی ضمانت مانگی گئی، جس پر آپ نے پرچہ بند کر دیا۔ مگر چھ ماہ بعد جب یہ آرڈیننس منسوخ ہوگیا تو آپ نے جنوری ۱۹۳۱ء میں اسے دوبارہ جاری کر دیا مگر دو ہی تین نمبر نکلے ہونگے کہ "قاتل" نامی ایک کہانی کی اشاعت کی علت میں پھر ضمانت مانگی گئی۔ مگر مسٹر پنالال صاحب کلکٹر بنارس کی سفارش پر گورنمنٹ نے اپنے حکم کو واپس لے لیا اور "ہنس" پھر بدستور نکلتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ہندی ساہتیہ پرشید نے اسے اپنے اہتمام میں لے لیا اور جون ۱۹۳۶ء تک رسالہ پرشید ہی کی ملکیت میں نکلتا رہا۔ لیکن جون ۱۹۳۶ء کے پرچے میں سیٹھ گوبند داس کا ایک مضمون شائع ہوا جسے گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا اور "ہنس" سے پھر ضمانت مانگی۔ پرشید نے ضمانت دینے سے انکار کر کے پرچہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ منشی پریم چند کو یہ کارروائی ناگوار ہوئی۔ انھوں نے "ہنس" کو پرشید سے اپنی ملکیت میں واپس لیکر جاری رکھا۔ اور گو اُس وقت سے برابر نقصان آرہا ہے لیکن مسز پریم چند اور اُن کے صاحبزادے اسے پریم چند کی یادگار سمجھکر اب بھی شائع کر رہے ہیں۔

اگست ۱۹۳۲ء میں اُنھوں نے "جاگرن" نامی ایک ہندی ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی جو سرپرست نبود شنکر جی ویاس کے اہتمام میں جاری ہوا تھا۔ پریم چند بھی سمجھتے تھے کہ اس ہفتہ وار سے مطبع کو مدد ملے گی اور اُن کی بھی گذر اوقات ہو جائے گی لیکن دو ہی سال کے اندر اُنھیں آٹھ دس ہزار کا گھاٹا ہوا جس سے مجبور ہو کر بالآخر اُنھیں اسے بند کرنا پڑا۔ اسی اثنا میں بعض کارکنوں نے بھی انھیں دھوکا دیا۔ غرض پریس پر قرض کا بار کثیر ہوگیا جس کی ادائیگی کے لئے ان کو اپنی خلاف طبیعت[1] بمبئی جاکر اجنتا سینی ٹون کی ملازمت کرنا پڑی۔ ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ طے ہوئی اور باقاعدہ معاہدہ ہوگیا۔ لیکن بمبئی میں اُن کی صحت اچھی نہیں رہی اور کام کے متعلق بھی سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ تو یہ سمجھکر گئے تھے کہ اچھے اچھے ڈرامے تیار کر کے ، ملک میں علمی وادبی فلم جاری کرینگے۔ لیکن وہاں کچھ اور ہی صورت حال نظر آئی۔ مالکان اپنی مرضی کے مطابق عام پسند تماشے بنواتے ہیں اور بڑے سے بڑے مصنف کے تصنیف کردہ پلاٹ میں من مانی کاٹ چھانٹ کر دیتے ہیں اور مصنف کو دم مارنے کا موقع نہیں رہتا

---

[1] جون ۳۴ء میں

کچھ اور بھی باتیں تھیں جو شاید سینما کمپنیوں کی خصوصیات میں داخل ہیں، لیکن جن سے آپ کو نفرت تھی، اس لئے آپ نے معاہدہ سے پہلے ہی اپنی گلو خلاصی کرلی اور مارچ ۱۹۳۵ء میں یہ سلسلہ منقطع کرکے بنارس واپس آگئے اور بقیہ زندگی یہیں ختم کردی۔

پریم چند کو عرصے سے ضعف معدہ کی شکایت تھی۔ سرکاری ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں بھی وہ مہوبا میں بہت بیمار ہوگئے تھے۔ اس کے بعد یہ شکایت کم وبیش برابر جاری رہی، وہ زیادہ احتیاط یا پرہیز کے عادی نہ تھے۔ اور نہ اپنی صحت کی زیادہ پروا یا کوئی خاص فکر کرتے تھے۔ بمبئی کی آب وہوا انھیں بالکل موافق نہ آئی اور یہاں اُن کا ہاضمہ اور بھی کمزور ہوگیا۔ آخر جون ۱۹۳۶ء میں یہ شکایت حد سے متجاوز ہوگئی اور بالآخر جلندھر ہوگیا جس سے باوجود علاج ومعالجہ جانبر نہ ہو سکے۔ جب وہ لکھنؤ گئے تو مرض بہت ترقی کرچکا تھا اور اُن کی طبیعت بھی علاج سے اکھڑ چکی تھی۔ ضعف بہت بڑھ چکا تھا، کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی، اور اُٹھنا بیٹھنا محال ہوگیا تھا۔

بنارس پہونچکر ہومیوپیتھک علاج ہوا۔ مگر مرض میں کوئی تخفیف نہ ہوئی بلکہ حالت خراب ہوتی گئی۔ آخر ۷۔ اکتوبر کو صبح سے دست آنے شروع ہوگئے۔ شام تک کئی دست آئے اور نقاہت اور زیادہ ہوگئی۔ تمام رات بے چینی سے کٹی۔ صبح ہوئی، منہ دھونے کو منجن اور پانی مانگا، لیکن لڑکا منہ دُھلانے آیا تو حالت غیر ہوچکی تھی اور وہ ہل بھی نہ سکتے تھے۔ گھبراکر بیوی چلا اُٹھیں کہ کیا آپ منھ بھی نہ دھوئیں گے، وہ مشکل سے کچھ اشارہ کرسکے، چند ہچکیاں لیں اور ہمیشہ کے لئے سوگئے، ڈاکٹر آیا، نبض دیکھی مگر روح جسم سے عالمِ بالا کو پرواز کرچکی تھی۔

اے رہ نوزدِ عالمِ بالا چگونۂ ما بے توخستہ ایم تو بے ما چگونۂ

مسز پریم چند صاحبہ

مسز پریم چند صاحبہ (شریمتی شیورانی دیوی) کی عمر اس وقت ۴۷-۴۸ سال کی ہے، اُن کے الدنے جو کنوار ضلع فتحپور کے باشندے تھے اُن کی شادی بہت ہی کم سنی میں کردی تھی۔ مگر وہ بچپن ی میں بیوہ ہوگئیں، اور باپ نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر اُن کی دوسری شادی پریم چند صاحب سے کردی جو اس بارے میں خود بھی مصیبت زدہ تھے اور دوسری شادی بیوہ سے کرنا چاہتے تھے۔ اس شادی ے وقت شریمتی شیورانی جی بہت ہی معمولی ہندی جانتی تھیں۔ مگر اپنے نامور شوہر کے فیض صحبت سے ب وہ ہندی کی ایک مشہور افسانہ نگار ہوگئی ہیں۔ انتظام خانہ داری میں بھی اُن کو خاص ملکہ حاصل ہے انچہ شادی کے بعد ہی انھوں نے گھرستی کا کل بار اپنے سر پر اُٹھالیا جس کی بدولت پریم چند جی تمام دنیوی

جھگڑوں سے آزاد ہو کر تصنیف و تالیف کی طرف ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس دوران میں مسز ممدوحہ اپنی علمی لیاقت بڑھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ بہو باس میں اُنھوں نے کئی قصّے لکھ ڈالے لیکن پریم چند کو دکھانے کی ہمت نہ ہوئی اس لئے اُن کو پھاڑ کر پھینکتی رہیں اور ان سے اُن کا ذکر بھی نہ کیا۔

۱۹۳۱ء میں اُنھوں نے "ساہس" نامی ایک چھوٹا سا قصہ لکھا جس کو اُن کے چھوٹے بھائی نے کسی طرح دیکھ لیا اور زبردستی ایڈیٹر صاحب "چاند" الہ آباد کے پاس بھیج دیا یہ قصہ ایڈیٹر کے پسند آیا اور رسالہ مذکور میں چھپ گیا تو پریم چند صاحب کو بھی اس کا حال معلوم ہوا۔ اب کیا تھا، اُن کا دل کھل گیا اور انھوں نے تیس چالیس قصّے لکھ ڈالے۔ چنانچہ اُن کی ۱۶ سولہ کہانیوں کا مجموعہ "ناری ہردے" (عورت کا دل) کے نام سے سرسوتی پریس بنارس سے شایع ہو چکا ہے اور دوسرا مجموعہ سیندور کی رکھشا" کے نام سے زیر طبع ہے آپ کی چند کہانیاں اُردو میں بھی ترجمہ ہو کر بعض رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

آپ نے تصنیف و تالیف ہی میں پریم چند کی تقلید نہیں کی بلکہ اُن کے پولیٹیکل جذبات میں بھی برابر کی شریک و ہمدرد رہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ میں بائیکاٹ کے متعلق دھرنا رکھنے کے سلسلہ میں ڈیڑھ ماہ کے لئے جیل بھی ہو آئی ہیں پریم چند صاحب وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۶ء میں آپ نے "ہنس" کی ایڈیٹری کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی اور جون ۱۹۳۷ء تک یہ اہم خدمات انجام دیتی رہیں۔ اس وقت بھی جب شریمت ستندر کمار جی نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لیا ہے آپ کو یہی دھن ہے کہ جس طرح سے ہو سکے آپ کے شوہر نامدار کا جاری کردہ رسالہ ترقی کے ساتھ قائم رہے۔

ایشور اس اولو العزم خاتون کی ہمت بلند کرے اور اس کے نیک ارادوں میں برکت دے۔

پریم چند صاحب کی بعض تصانیف کا حال

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا پریم چند جی کا سب سے پہلا ناول "ہم خرما و ہم ثواب" کے نام سے بابو مہادیو پرشاد ورما لکھنوی کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ بابو صاحب اخبار "ہندوستانی" و "ایڈوکیٹ" کے نامور ایڈیٹر مرحوم بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کے عزیز اور سستے اُردو ناولوں کے مشہور پبلشر تھے جنھیں وہ مختلف کتب فروشوں کے ہاتھ پیسے یا پون پیسے فی جز کے حساب سے فروخت کیا کرتے تھے۔ "ہم خرما و ہم ثواب" نواب رائے کے نام سے بہت ہلکے کاغذ پر معمولی لکھائی چھپائی میں شائع ہوا تھا۔ مصنف کی پہلی تصنیف ہونے کی حیثیت سے اسمیں نو مشقی کی اکثر خامیاں موجود تھیں۔ اس کے بعد وہ نواب رائے کے نام سے مضامین لکھتے رہے

سلہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کا کارڈ ہے کہ ۱۱ نومبر کو مسز دھنپت رائے گرفتار ہو گئیں [illegible]

ور ۱۹۰۸ء میں "سوزِ وطن" کے نام سے ان کے پانچ قصوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ زمانہ پریس سے شائع ہوا
د اُنھیں دنوں نیا نیا قائم ہوا تھا۔

ہندی میں ان کا سب سے پہلا ناول "پرتگیا" نامی ہے جو غالباً ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا تھا اور جس
اُردو ترجمہ "بیوہ" کے نام سے ہوا ہے۔ اُردو میں تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری سے اُنھیں کوئی مالی منفعت
یں ہوئی۔ مگر جب اُنھوں نے اپنا دوسرا ہندی ناول "سیوا سدن" لکھا تو کلکتہ پستک ایجنسی
ے اس کے پہلے ایڈیشن کے لئے یکمشت ساڑھے چار سو روپئے دیے۔ غالباً یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ مگر پریم چند
احب کو اپنی ادبی زندگی میں اتنی رقم اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اس ناول سے اُن کو یہ بھی فائدہ ہوا
۔ ہندی داں جماعت میں اُن کی ڈھاک بیٹھ گئی۔ چنانچہ اسی پبلشنگ ایجنسی نے ان کے دوسرے
ندی ناول "پریم آشرم" کے لئے تین ہزار روپیہ بطور معاوضہ پیش کئے۔ اس ناول کے ہندی میں اب تک
ٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا ترجمہ اُردو میں "گوشہٴ عافیت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس کے
وسرے ایڈیشن کی نوبت شاید ابھی تک نہیں آئی۔

تیسرا ناول "نرملا" چاند پریس الہ آباد نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا، اس کا ترجمہ بھی لاہور میں ہو چکا ہے۔
غالباً ۱۹۲۵ء میں آپ نے اپنا چوتھا ناول "رنگ بھومی" لکھا، جو گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ کے اہتمام
ے شائع ہوا اور جس کے صلہ میں گنگا پستک مالا کے مالکوں نے دو ہزار روپئے نذر کئے۔ ابتک آپ
بچہ لکھتے تھے آسے پہلے اُردو رسم الخط ہی میں لکھتے تھے بعد کو ناگری حروف میں اس کی نقل ہو جاتی تھی
ن "رنگ بھوم" ہندی ہی میں لکھا گیا۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ منشی اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی کی
د سے اُردو میں ہوا۔ رنگ بھومی نے آپ کی ادبی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ
بھی اس ناول کو اس سال کی بہترین تصنیف قرار دے کر مصنف کو پانچسو روپیہ کا انعام دیا۔

اس کے بعد پریم چند نے "کایا کلپ" نام سے ایک اور ہندی ناول لکھا، اور اسے سرسوتی
یس بنارس سے شائع کیا۔ ابتک اس کی چار ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ناگری پرچارنی
بھا بنارس نے اس کے صلہ میں آپ کو دو سو روپیہ کا انعام دیا۔ ابتک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں
ہزار کاپیاں بکنے کے بعد اب تیسرے ایڈیشن کی تیاری ہے۔

۱۹۳۱ء میں آپ نے اپنے ہی پریس سے "غبن" نامی ایک اور ہندی ناول شائع کیا، اس کا ترجمہ
لاہور میں چھپا ہے۔ ہندی کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے، اب دوسرا زیر طبع ہے۔
۱۹۳۲ء میں آپ نے "کرم بھومی" ناول لکھا اور اپنے ہی پریس سے شائع کیا، اس کی بھی دو ہزار جلدیں

فروخت ہو چکی ہیں، اس کا اردو ترجمہ "میدان عمل" کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔

۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول "گئو دان" بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں اور پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہو گا۔

مستقل ناولوں کے علاوہ آپ کی متفرق کہانیوں کے اردو ہندی میں بہت سے مجموعے شائع ہوئے ہیں سوز وطن کے بعد سب سے پہلے زمانہ پریس کے اہتمام سے پچیس قصوں کا مجموعہ پریم پچیسی کے نام سے نکلا۔ اس کے بعد بتیس قصوں کا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ فردوسِ خیال انڈین پریس الہ آباد سے نکلا۔ "مان سرور" کے نام سے پچاس کہانیوں کا مجموعہ سرسوتی پریس بنارس سے نکلا اور بھی کئی دلچسپ مجموعے شائع ہوئے جن کی مفصل فہرست کسی دوسری جگہ درج کر دی گئی ہے۔ آپ کی کہانیاں سب سے پہلے "زمانہ" میں چھپیں، بعدہٗ بہت سے ہندی اردو رسالوں نے آپ کے زورِ قلم سے فائدہ اٹھایا اور ملک کے سبھی بڑے بڑے پرچوں نے حتی الوسع آپ کی قدردانی کی۔ "زمانہ" کے ساتھ آپ کی مراعات ہمیشہ خاص رہیں۔ چنانچہ اس کی قلیل البضاعتی کا ہمیشہ لحاظ کرتے رہے۔ اور جو کچھ اس نے پیش کیا اس کو ہنسی خوشی قبول کر لیتے تھے واقعی اس کے ساتھ ان کا تعلق ہمیشہ مخلصانہ و برادرانہ رہا۔ ہندی میں ان کو دو روپیہ فی صفحہ سے لیکر چار یا پانچ روپیہ فی صفحہ تک ملا، اردو میں مسٹر محمد علی نے اپنے روزانہ اخبار "ہمدرد" کے لئے ان سے کئی افسانے تیس روپیہ فی افسانہ کے حساب سے لکھائے تھے۔ دو ایک اور پرچوں نے بھی یہی معاوضہ دیا مگر اردو قصوں کے لئے شاید اس سے زیادہ معاوضہ کبھی نہیں ملا۔

ناولوں کے علاوہ انھوں نے ہندی میں سرشار کے فسانۂ آزاد کے خاص خاص حصوں کا ہندی ترجمہ بھی "آزاد کتھا" کے نام سے کیا یہ کتاب مطبع نولکشور میں چھپی ہے۔

"رام چرچا" کے نام سے بچوں کے لئے رامائن کا تذکرہ نہایت سلیس زبان میں تصنیف کیا، کئی درسی کتابیں لکھیں، "باکمالوں کے درشن" کے نام سے کئی مضامین کا ایک مجموعہ الہ آباد کے مشہور پبلشر لالہ رام نراین لال نے شائع کیا جو کئی سال تک صوبہ کے مدرسوں میں رائج رہا۔ ابتدائی درجوں کے لئے ہندستانی زبان کی سلیس ریڈریں مرتب کیں جو مطبع نولکشور میں طبع ہوئیں۔ اس طرح وہ آخر دم تک ہندوستانی ادب کی بہترین خدمت انجام دیتے رہے۔ اُن کی بلند پایہ تصانیف ملک کے ہر طبقہ میں ان کا نام ابد تک روشن رکھیں گی۔

پریم چند کے خیالات

اوائل عمر کے واقعات وتجربات کی بناء پر پریم چند نے زندگی کے مسائل وضروریات کے متعلق کچھ خاص نظریے قائم کر لیئے تھے مگر اُن کی طبعی خوش اخلاقی اور فطری زندہ دلی نے ان کو خواہ مخواہ زاہد خشک یا ناصح مشفق بننے نہیں دیا۔ شاید اسی وجہ سے عرصے تک ان کے اکثر دوستوں کو اُن کی اخلاقی عظمت کا پتہ نہ چلا۔ شروع میں ان کے اُصول اتنے نمایاں نہ تھے۔ لیکن عمر کے ساتھ یہ نظریے اُن کی تحریر و تقریر اور بیوہار برتاؤ میں دخل پانے لگے۔ پریم چند کے مزاج کی افتاد کچھ ایسی پڑی تھی کہ خوشحال بزرگوں کی تنگدست اولاد کو رسمی تکلفات کی پابندی کی کوشش بیجا میں آئے دن جس پریشانی سے سامنا رہتا ہے اُس سے انکو کوئی نہ ہمدردی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بعض خطوں میں لکھا ہے کہ میں کوئی رئیس زادہ نہیں جو مجھے اپنی جھوٹی تمکنت قائم رکھنے کی خواہ مخواہ فکر ہو۔

عملی اور ذہنی دونوں حیثیت سے اُن کی طبیعت بہت ہی سلیس واقع ہوئی تھی۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر اہل ملک جس دھوم دھام کے عادی ہیں، پُرانی مرجاد اور بزرگوں کا نام قایم رکھنے کے غلط خیال سے اکثر لوگ جو اپنی اوقات سے زیادہ خرچ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اُن کا وہ ہمیشہ خوب مضحکہ اُڑایا کرتے اور فقرے کسا کرتے تھے۔

خود بھی وہ دھوم دھام اور طمطراق سے ہمیشہ دُور رہتے تھے، اور احباب کے یہاں تقریبات میں بھی کم ہی شریک ہوتے تھے۔

میرے یہاں ایک مرتبہ لڑکی کی شادی کے موقعہ پر دیگر احباب کے ساتھ چند انگریز حکام کی بھی دعوت ہوئی تھی مگر پریم چند نے اسکو پسند نہ کیا، اور ایک خط میں لکھا کہ آپ نے انگریز حکام کی دعوت ناحق کی۔ آخر اس سے کیا فائدہ سمجھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ خیال اُن کے ذہن نشین ہو گیا تھا کہ جب انگریز ہم ہندستانیوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں تو ہم لوگوں کو بھی اُن سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔ قومی خودداری کے وہ بڑے حامی تھے۔ اور ادبی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں سرکاری افسران نے اُنکے ساتھ جو نامنصفانہ برتاؤ کیا اُس کا اثر اُن کے دل سے کبھی زائل نہیں ہوا۔ نان کوآپریشن کے زمانہ میں سرکاری تشددات نے انھیں اور بھی برگشتہ کر دیا۔ واقعی "سوز وطن" کے متعلق حکام کی کارروائی سراسر بیجا تھی کیونکہ اس کا کوئی قصہ ایسا نہ تھا جس پر اُن کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کیجا سکتی۔

پریم چند شروع میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے، اور یہ نام انھیں بہت عزیز تھا، کیونکہ اُن کے والد اُنھیں پیار سے "نواب" کے نام سے پکارا کرتے تھے، اور یہ نام ہندو مسلمانوں کے معاشرتی اتحاد کی یاد بھی تازہ رکھنے والا تھا۔ مگر جب "سوزِ وطن" کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد اُن کے افسران نے انھیں تصنیف و تالیف کی ممانعت کردی تو انکو اُس نام کو خیر باد کہنا پڑا۔ اِن تنگ خیال افسران کا بس چلتا تو آج ہندوستانی ادب میں پریم چند کا وجود ہی نہ ہوتا۔ مگر دریا کا بہاؤ کس نے روکا ہے اور ہوا کا رُخ کون بدل سکا ہے؟ "نواب رائے" کی روح نے "پریم چند" کے قالب میں جنم لیا۔ یہ نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا اور عرصہ تک مرحوم اس نام سے صرف "زمانہ" ہی میں لکھتے رہے۔ یہ پابندی خود اُن کی محبت نے اُن پر عائد کی تھی، ورنہ اس کا کوئی مطالبہ یا معاہدہ نہ تھا، لیکن جب تصنیف و تالیف ہی پر بسر اوقات منحصر ہوگئی تو یہ آن باقی نہ رہ سکی۔ "زمانہ" سے انھیں ہمیشہ دلی محبت رہی اور اس طرف سے بھی اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مروّت و دوستی میں پریم چند صاحب خواہ مخواہ خسارہ میں نہ رہیں۔ "زمانہ" کی مالی حالت قابلِ اطمینان ہوتی تو انھیں کسی دوسری جگہ کوئی معاملہ کرنے کی حاجت ہی نہ ہوتی۔ وہ بھی اس بات کو بخوبی جانتے تھے، اور اسی لئے ہم لوگوں میں آخر تک وہی خلوص رہا۔

پریم چند اس کے قائل نہ تھے کہ گورنمنٹ ہر قسم کی زیادتی کرے اور وہ اُسکے ساتھ انتہائی ایمانداری برتتے رہیں چنانچہ "سوزِ وطن" کی جس قدر کاپیاں اُن کے پاس تھیں وہ اُنھوں نے حکام کے حوالہ کردیں، مگر میرے پاس جو اسٹاک باقی رہ گیا تھا اُس کی کسی نے خبر نہ لی اور یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں، اور آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں۔ پریم چند تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کے متعلق اپنے افسروں کا حکم ناجائز سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کی علانیہ خلاف ورزی نہ کرسکنے پر بھی وہ "پریم چند" کا نام اختیار کر کے پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے لکھنے لگے۔ پریم چند کے نام کے متعلق یہاں پر ان کے ایک خط کا اقتباس بیجا نہ ہوگا جو اُنھیں دنوں انھوں نے راقم الحروف کو لکھا تھا:۔

"برادرم، ایک کارڈ لکھ چکا ہوں، اب مفصل خط لکھ رہا ہوں، میں نے ''وکرما دت کا تیغہ'' ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے، بارہ تیرہ صفحے ہو چکے ہیں شائد پانچ چھ صفحہ اور چلے، جلد ہی ختم کر کے بھیجوں گا۔

"پریم چند" اچھا نام ہے، مجھے بھی پسند ہے، افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں "نواب رائے" کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہوگئی، یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے۔ یہ قصہ (وکرما دت کا تیغہ) میرے خیال میں کئی حیثیت سے تھا، میں نے اپنے خیال میں رابندر ناتھ کے

طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے مگر بُری نقل نہیں ہے، پلاٹ بالکل اوریجنل ہے، میں نے تو کئی قلم توڑ دیے ہیں اور دس پانچ ورق بھی کالے کر ڈالے۔ معلوم نہیں آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔ یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکالنے کا کافی مسالہ جمع ہو جائے گا...... اس مجموعے کا نام میں نے "برگِ سبز" سوچا ہے۔ شاید آنجناب کو پسند آئے۔ اس لئے کہ میں ناموں کے بارے میں آپ کی پسند کا قائل ہوں[1]"

اس کے بعد وہ ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد میں مضامین لکھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، اور انھیں دوسرے نام سے بھیجنا تجویز کرتے ہیں، کیونکہ وہ لکھتے ہیں:۔

"میرے لئے کلکٹر کو ہر ایک مضمون دکھانے کی ایسی پخ لگی ہے کہ ایک مضمون مہینوں میں لوٹ کر آتا ہے.......... ایجوکیشنل گزٹ میں "پریم چند" کا نام نہیں دینا چاہتا۔ معلوم نہیں یہ حضرت ہاتھ پیر سنبھالنے پر کیا لکھیں پڑھیں، انھیں قصہ گو ہی رہنے دیجئے۔ بیٹھے بیٹھے پریم اور بیر رس کے قصے لکھا کریں"

اس سے پہلے کُل پہاڑ ضلع ہمیر پور سے ایک خط میں لکھا کہ:۔

"نواب رائے" تو کچھ دنوں کے لئے اس جہان سے گئے، دوبارہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدہ میں گو اخبار مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں خواہ کسی عنوان پر لکھوں، خواہ وہ ہاتھی دانت ہی پر کیوں نہ ہو مجھے پہلے سے جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑیگا۔ اور مجھے چھٹے چھ ماہے لکھنا نہیں، یہ تو میرا روز کا دھندھا ٹھہرا، ہر ماہ ایک مضمون صاحب بہادر کی خدمت میں پہونچے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام سر پہ تھوپا جائے گا۔ اس لئے نواب رائے مرحوم ہوئے۔ ان کے جانشین کوئی اور صاحب ہونگے۔"

افسروں کی بیجا خوشامد اُن سے نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک ڈپٹی انسپکٹر مدارس سے اُن کی اسی بات پر بگڑ گئی کہ اُنھوں نے دورہ میں اُن سے کئی چارپائیاں طلب کیں جسکا یہ کوئی انتظام نہ کر سکے۔ مگر پریم چند خود بھی اپنے ماتحتوں سے نہ کوئی فرمایش کرتے تھے اور نہ خاطر و مدارات کے عادی تھے واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ افسری ماتحتی کے زیادہ قائل نہ تھے، اور تملق و خوشامد سے انھیں دلی نفرت تھی، دوسروں کے ساتھ شرافت کا برتاؤ ضروری سمجھتے تھے، اور سب کے درد دکھ میں شریک ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بعض گندم نما جو فروش دوستوں نے اُن

[1] ۱۹۲۳ء میں بھی جب بنارس میں اپنا پریس قائم کیا تو اس کے نام کے متعلق راقم سے مشورہ کیا۔ ایک خط میں تحریر ہے کہ "ناموں کے انتخاب میں آپ کو کمال ہے۔"

سے بیجا فائدہ بھی اُٹھایا۔ بہرحال دیہاتی مدرسوں کو ڈپٹی و سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی جو خدمت و خوشامد کرنا پڑتی ہے وہ انھیں دل سے بہت ناپسند تھی، اور انھوں نے اپنے ماتحت مدرسوں سے کبھی کوئی خدمت لینا پسند نہ کیا۔

اس طرح وہ ابتدا سے آخر تک خواہ مخواہ کی سرپرستی اور ہر وقت کی نیازمندی دونوں سے دُور رہے، نجی بیوہار میں وہ مساوات اور بے تکلفی کے قائل تھے۔ ایک خط میں وہ بالکل صحیح لکھتے ہیں کہ "میں ادنیٰ و اعلیٰ دونوں کی حماقتوں سے دُور رہنا چاہتا ہوں"۔

پریم چند آپس کی اُلجھن اور جھنجھٹ سے بھی دُور رہتے تھے، اور اپنی زندگی امن و سکون کے ساتھ بسر کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود کسی کے ساتھ سختی کرنا پسند کرتے اور نہ کسی کی کوئی کڑی بات برداشت کر سکتے تھے، نجی معاملات میں وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہنا چاہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی آزمایش دوسری شادی کے موقعہ پر ہوئی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اُن کی پہلی بیوی بہت بدسلیقہ تھیں جس کی وجہ سے اُن کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ آئے دن کے جھگڑوں کے علاوہ کچھ اور واقعات بھی پیش آئے جن کے سبب سے مصالحت کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا۔ جب مجھے اُنھوں نے مفصل حالات بتلائے تو مَیں بھی انھیں الزام نہ دے سکا۔ اتفاق سے اس بارے میں اُن کا ایک خط محفوظ رہ گیا ہے۔ جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن یقیناً یہ ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے

"برادرم، اپنی بیتی کس سے کہوں، ضبط کئے کئے کوفت ہو رہی ہے۔ جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تردداّت کا تانتا بندھا ...... بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہونگی، میکے جاؤنگی، میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کمیت کا سنا فع وصول کیا، اُن کی رخصتی کی تیاری کی، وہ رو دھو کر چلی گئیں، میں نے پہونچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج اُن کو گئے ہوئے آٹھ روز ہو گئے، نہ خط نہ پتر، میں اُن سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار ہوں۔ غالباً ابکی اُن کی جدائی دائمی ثابت ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو، مَیں بلا بیوی کے رہونگا۔

ادھر ننہال سے اور والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں مفلس ہوں ...... تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضامندی دیدو، تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائیگی ...... بہرحال ابکی تو گلا چھڑا ہی لونگا، آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔ جیسی آپ کی صلاح ہوگی ویسا کرونگا۔ اس بارے میں ابھی پھر مشورہ کرنے کی ضرورت باقی ہے"۔

اُس کے بعد بھی وہ اپنے اوقات کے مطابق پہلی بیوی کو گذارہ کے طور پر کچھ ماہوار بھیجتے

[illegible]

رہے۔ شادی کے متعلق بڑے غور و خوض اور بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد اُنھوں نے طے کیا کہ دوسری شادی کی جائے تو کسی بیوہ ہی سے کی جائے۔

پریم چند کا اس وقت عالم شباب تھا اور وہ ایک ہنس مکھ، زندہ دل، خوش رو و تندرست اور کھاتے کماتے نوجوان تھے۔ سری واستو فرقہ میں جس سے اُن کا تعلق تھا قرار داد کی رسم عام ہے، اور ہزار دو ہزار روپیہ نقد تو اُن کو آسانی سے مل سکتا تھا۔ اور یہ رقم اُس وقت اُن کے لئے ایک بڑی رقم تھی۔ اُن کے اہل خاندان بیوہ بیاہ کے خلاف تھے مگر وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے، اور ضلع فتحپور میں موضع سلیم پور (کنفار) میں شریمتی شیورانی دیوی کے ساتھ اُن کی دوسری شادی ہوگئی، یہ شادی مبارک ثابت ہوئی۔ اس وقت اس شادی سے ایک لڑکی[۵] اور دو لڑکے دھنو (سری پت رائے) اور بنو (امرت رائے) موجود ہیں۔ ایک اور لڑکا منو نامی ہوا تھا لیکن وہ ۵ جولائی ۱۹۲۰ء کو گورکھپور میں چیچک کی نذر ہوگیا۔ اس بچے کی افسوسناک موت کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تقدیر نے تو اپنی دانست میں مجھے سزا دی ہوگی، لیکن یہاں فکروں کا آدھا بوجھ سر سے دُور ہوگیا، مجھے بھی مرنے دیجئے، اسی گوشہ میں۔"

یہ دل جلے الفاظ رنج و غم کی حالت میں لکھے گئے تھے، تاہم یہ سچ ہے کہ وہ کثرت اولاد سے گھبراتے تھے، اور ابتدا میں تو اولاد کے خیال ہی سے انھیں اُلجھن سی ہوتی تھی، گو بچے انھیں دل سے پسند تھے۔ میں نے ایک دفعہ اُن سے پوچھا کہ "کسی نئی آمد کی امید ہے؟" تو جواب میں لکھا کہ "اس کی نہ کوئی صورت ہے اور نہ تمنا، آپ سے بطیب خاطر کہتا ہوں۔" ننھے بچوں سے انھیں کس قدر دلچسپی تھی اس کے لئے ان کا خط ملاحظہ فرمائیے جو ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں میرے چھوٹے بھائی مسٹر رام سرن کے پہلے بچے کی ولادت پر اُنھوں نے لکھا تھا

"خوشی کی بات ہے۔ ایشور اسے زندہ رکھے، میری نہ پوچھیے احباب پھلیں پھولیں، میری خوشی کیلئے اتنا ہی کافی ہے زیادہ کی ضرورت نہیں، انھیں کے بچوں کو پیار کر کے اپنی خوشی منالوں گا۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ پریم چند نے اپنے ننھے بچے کی موت کا کن فلسفیانہ انداز میں ذکر کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اس قسم کے حادثوں کو بڑے صبر و سکون سے برداشت کرتے تھے اور موت کو فلسفۂ نقطۂ خیال سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۹۳۳ء میں راقم الحروف کو بھی ایک دو سال بچے کی موت کا غم اُٹھانا پڑا تو پریم چند نے ایک تعزیتی خط لکھا جس سے موت کے متعلق ان کا نظریہ بخوبی واضح ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"بھائی جان! تسلیم، کل صبح ایک خط لکھا، شام کو آپ کا کارڈ ملا، پڑھ کر نہایت صدمہ ہوا، بیماریاں اور

---

[۵] اس لڑکی کا بیاہ ہوچکا ہے اور اب یہ بھی دو بچوں کی ماں ہے۔

پریشانیاں تو زندگی کا خلاصہ ہیں، لیکن بچے کی حسرتناک موت ایک دلشکن حادثہ ہے، اور اُسے برداشت کرنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی کہ دنیا کو ایک تماشا گاہ یا کھیل کا میدان سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے میدان میں وہی شخص تعریف کا مستحق ہوتا ہے جو جیت سے پھولتا نہیں، ہار سے روتا نہیں، جیتے تب بھی کھیلتا ہے ہارے تب بھی کھیلتا ہے جیت کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہاریں نہیں۔ ہار کے بعد جیت کی آرزو ہوتی ہے۔ ہم سب کے سب کھلاڑی ہیں، مگر کھیلنا نہیں جانتے۔ ایک بازی جیتی، ایک گول جیتا تو ہپ ہپ ہرے کے نعروں سے آسمان گونج اُٹھا۔ ٹوپیاں آسمان میں اُچھلنے لگیں، بھول گئے کہ یہ جیت دائمی فتح کی گارنٹی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری بازی میں ہار ہو۔ علیٰ ہٰذا ہارے تو پست ہمتی پر کمر باندھ لی، روئے، کسی کو دھکے دیئے، فاؤل کھیلا اور ایسے پست ہوگئے گویا پھر جیت کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ ایسے اوچھے تنگ ظرف آدمی کو کھیل کے وسیع میدان میں کھڑے ہونے کا بھی مجاز نہیں۔ اس کے لئے گوشۂ تاریک ہے اور فکر غم۔ بس یہی اس کی زندگی کی کائنات ہے۔ ہم کیوں خیال کریں کہ ہم سے تقدیر نے بے وفائی کی! خدا کا شکوہ کیوں کریں! کیوں اس خیال سے ملول ہوں کہ دنیا ہماری نعمتوں سے بھری تھالی کو ہمارے سامنے سے کھینچ لیتی ہے، کیوں اس فکر سے متوحش ہوں کہ قزاق ہمارے اوپر چھاپہ مارنے کی تاک میں ہے۔ زندگی کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اپنے اطمینان قلب سے ہاتھ دھونا ہے۔ بات دونوں ایک ہی ہے، قزاق نے چھاپہ مارا تو کیا؟ ہار میں سارے گھر کی دولت کو کھو بیٹھے تو کیا؟ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جبر ہے دوسرا اختیار۔ یہ قزاق زبردستی جان اور مال پر ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن ہار زبردستی نہیں آتی۔ کھیل میں شریک ہوکر ہم خود ہار اور جیت کو بلاتے ہیں، قزاق کے ہاتھوں لُٹا جانا زندگی کا معمولی واقعہ نہیں، حادثہ ہے لیکن کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی واقعے ہیں۔ جو کھیل میں شریک ہوتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی۔ اس لئے اُسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت سے پھولا نہیں سماتا۔ ہمارا کام تو صرف کھیلنا ہے، خوب دل لگا کر کھیلنا، خوب جی توڑ کر کھیلنا، اپنے کو ہار سے اس طرح بچانا گویا ہم کونین کی دولت کھو بیٹھیں گے لیکن ہارنے کے بعد، پٹخنی کھانے کے بعد گرد جھاڑ کر کھڑے ہوجانا چاہیئے اور پھر خم ٹھونک کر حریف سے کہنا چاہیئے کہ ایک بار اور!

کھلاڑی بن کر آپ کو واقعی بڑا اطمینان ہوگا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ میں اس معیار پر پورا اُتروں گا یا نہیں، مگر کم سے کم اب مجھے کسی نقصان پر اتنا رنج نہ ہوگا جتنا آج سے چند سال قبل ہوسکتا تھا۔ میں اب شاید نہ کہوں گا کہ ہائے زندگی اکارت گئی، کچھ نہ کیا، زندگی کھیلنے کے لئے ملی تھی کھیلنے میں کوتاہی نہیں کی۔ آپ مجھ سے زیادہ کھیلے ہیں، ہار اور جیت دونوں دیکھی ہیں۔ آپ جیسے کھلاڑی کے لئے شکوہ

تقدیر کی ضرورت نہیں۔ کوئی گولف اور پولو کھیلتا ہے۔ کوئی کبڈی کھیلتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ ہار اور جیت دونوں ہی میدانوں میں ہیں۔ کبڈی کھیلنے والے کو جیت کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس ہار کا غم نہ کیجئے، آپ نے خود ہی نہ کیا ہوگا، آپ مجھ سے مشتاق ہیں۔ میں ۵ یا ۶۔ ستمبر تک کانپور آ ئیوالا ہوں یہاں کی کوئی چیز درکار ہو تو بے تکلف لکھئے گا۔ دیگر حالات میرے پہلے خط سے معلوم ہوئے ہونگے۔"

پریم چند کو ضعف معدہ کی پرانی شکایت تھی، جس سے بعض اوقات انھیں زندگی سے مایوسی ہوجاتی تھی۔ انیس سال کا ذکر ہے کہ اپریل ۱۹۱۵ء میں ایک خط میں لکھا تھا کہ:۔

"آپ کیا کہتے ہیں، زندگی کی امید یہاں بھی کم ہے مگر چاہتا ہوں کہ یا تو ساتھ چلیں یا خفیف تقدیم و تاخیر ہو۔ میں آپ کا پیشرو بننا چاہتا ہوں، مگر موت کی فکر مارے ڈالتی ہے، کتنا چاہتا ہوں پرماتما پر بھروسہ رکھوں مگر دل موذی ہے سمجھتا نہیں، کسی مہاتما کی صحبت ملے تو شاید راستہ پر آئے۔ یہی فکر ہے کہ آج مرجاؤں تو ان بال بچوں کا کون پرسان حال ہوگا، گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے.... دوستوں میں اگر ہیں تو آپ اور نہیں ہیں تو آپ، اور نہ ہوگا تو میرے بعد سال دو سال ان کی خبر تو لے سکتے ہیں"

اس سے پہلے جون ۱۹۱۵ء کا ایک کارڈ ہے جسمیں لکھتے ہیں کہ "میرے لئے بڑھاپے کا ذکر فضول ہے میں کس بوڑھے سے کم ہوں"۔ ان دنوں ضعف معدہ کے باعث اُن کی تندرستی خراب ہو چکی تھی اور اب ان کی صورت پہلے سے آدھی بھی نہ رہ گئی تھی۔ آخر اسی مرض نے برسوں کے بعد مرض الموت کی شکل اختیار کی۔

گو پریم چند کو عرصہ تک سرکاری ملازمت کی بندشوں کو برداشت کرنا پڑا۔ لیکن ملازمت سے انھیں دلی نفرت تھی۔ بستی سے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میں جو عاجز ہوں وہ ماتحتی سے، کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آوے تو رات دن کام کرتا رہوں، اور جی چاہے تو فوراً کردوں مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہوسکتا ہے"

جنگ یوروپ کے زمانہ میں جب صوبہ کی گورنمنٹ نے وار جنرل (جنگی اخبار) جاری کیا اور راقم بھی اس کی کمیٹی کا ایک ممبر نامزد ہوا تو میں نے اس خیال سے کہ پریم چند کو ایک وسیع ترحلقے میں اظہار لیاقت کا موقعہ مل جائے ان سے دریافت کیا کہ اگر وہ جنگی اخبار کے اُردو ایڈیشن کی ذمہ داری لینے پر رضامند ہوں تو ان کے لئے کوشش کی جائے مگر انھوں نے لکھا کہ "مجھے اس کام سے معاف رکھئے۔ میں

اُسے قومی کام نہیں سمجھتا اور مترجمی امیدواروں کا کام ہے جو اخبار نویسی سے بالکل الگ ہے۔

درحقیقت ان کی طبیعت کو کسی فرمائشی پروپیگنڈے یا غرضمندی کی وکالت سے لگاؤ نہ تھا اور اس لئے سرکاری اخبار کے نام ہی سے بدظن تھے۔ چنانچہ ایک دوسرے خط مورخہ ۶ جولائی ۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں:۔

"اب میں سرکاری اخبار نویس کیا ہونگا، جنگ کے متعلق مضامین لکھنے کی بھی اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے، بس اسی اپنی رفتار قدیم پر رہونگا...... کسی پرائیویٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری، اور ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری اور کچھ پبلک کام، یہی میرا معراج زندگی ہے۔ اخبار بھی کسانوں کا حامی اور مددگار ہو......

اخبار کی ایڈیٹری کا بھی وقت آیا لیکن یہ ایڈیٹری کیسی مہنگی پڑی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

پریم چند کی طبیعت پر کبھی مذہبی عقیدتمندی کا رنگ غالب نہیں ہوا۔ وہ فطرتاً معقول پسند و آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ تمدنی معاملات میں بھی وہ وقتی ضروریات کے مطابق اصلاحات کے حامی تھے لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں کے جذبات کا ہمیشہ بہت احترام کرتے تھے، اور مذہبی عقائد کے معاملے میں کسی کا دل دکھانا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن مناسب احتیاط برتنے کے بعد وہ نیک نیتی سے اظہار رائے سے گھبراتے بھی نہ تھے اور نہ کبھی نامعقول اعتراضوں سے مرعوب ہو کر اپنی رائے بیان کرنے میں پس و پیش کرتے تھے

کربلا کا ڈرامہ اُنھوں نے بڑی چھان بین اور غور و فکر کے بعد لکھا تھا۔ اشاعت سے پہلے دفتر زمانہ میں بھی اس پر مزید غور و خوض کیا گیا، اور چند مسلم دوستوں کے علاوہ بعض شیعہ احباب سے بھی اس کے بارے میں مشورہ کیا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں عرصہ تک خط و کتابت ہوئی۔ ڈرامہ پر ہر ممکن پہلو سے نظر ڈالی گئی اور بعض تاریخوں کی بھی ورق گردانی کی گئی۔ شروع ہی میں، میں نے انھیں لکھا تھا کہ کہیں کوئی بات ایسی نہ لکھ جائیں جو شیعہ احباب کو ناگوار ہو اسکا جواب مورخہ ۱۷ فروری ۲۴ء یہ ملا کہ:۔

آپ یقین رکھیں میں نے احترام کہیں نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے ایک ایک لفظ پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہونچے، اس کا مقصد پولیٹیکل ہے، باہمی اتحاد کو بڑھانا اور کچھ نہیں"

دو ایک دوستوں نے اس کے متعلق تنقیدی نوٹ لکھے تھے حضرت احسن سمبھی نے بھی جو اُن دنوں دفتر میں مستقل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے ایک نوٹ لکھا تھا اور میں نے اسے بجنسہ پریم چند کے پاس بھیجدیا تھا مگر دوسری تنقیدوں کا صرف خلاصہ بھیجا۔ ان تنقیدوں میں بعض رسمی اعتراضات کئے گئے تھے جو انھیں قدرتاً ناپسند ہوئے اور چونکہ میں نے ان اعتراضات کو بلا کاٹ چھانٹ اُن کے پاس بھیجدیا تھا اس سے انھیں میرے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی۔ اور مجھ سے بھی وہ کچھ دل برداشتہ سے ہوگئے چنانچہ

۲۲ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء کو ان کا ایک طولانی خط آیا جس میں انھوں نے بعض اعتراضات کا بہت مفصل جواب دیا۔ چونکہ یہ خط ایک دلچسپ علمی موضوع کے متعلق ہے اس لئے یہاں پر اس کا تمام و کمال اقتباس بیجا نہ ہوگا۔ خط مذکور یہ ہے :۔

"بھائی جان تسلیم، بہتر ہے کربلا نہ نکالئے، میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ نہ میں مفت کا خلجان سر پہ لینے کو تیار ہوں۔ میں نے حضرت حسین کا حال پڑھا، اُن سے عقیدت ہوئی، اُن کے ذوق شہادت نے مفتون کر لیا اس کا نتیجہ یہ ڈراما تھا، اگر مسلمانوں کو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ کسی ہندو کے زبان و قلم سے اُن کے کسی مذہبی پیشوا یا امام کی مدح سرائی ہو تو میں اس کے لئے مصر نہیں ہوں۔ اس کارڈ[1] کا جواب دینا تو فضول ہے۔ ہاں حضرت احسن کے نوٹ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

آپ فرماتے ہیں کہ شیعہ حضرات یہ نہیں پسند کر سکتے کہ اُن کے کسی مذہبی پیشوا کا ڈراما تیار کیا جائے۔ اگر شیعہ حضرات اپنے مذہبی پیشوا کی مثنوی پڑھتے ہیں، افسانے پڑھتے ہیں، مرثیے سُنتے اور پڑھتے ہیں تو اُنھیں ڈراما سے کیوں اعتراض ہو۔ کیا اس لئے کہ ایک ہندو نے لکھا ہے؟

تاریخ اور تاریخی ڈراما میں فرق ہے جیسا آپ خود تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخی ڈراما کے خاص کیرکٹروں میں تو کوئی تغیر نہیں کر سکتا۔ مگر ثانوی کیرکٹروں کے تبدیل اور ترمیم یہاں تک کہ تخلیق میں بھی اُسے آزادی ہے۔ حضرت اصغر کی عمر چھ ماہ کی تھی لیکن بعض روایتوں میں چھ سال کی بھی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے وہی روایت اختیار کی جو میرے موافق حال تھی۔ اگر بالفرض ایسی روایت نہ بھی ہو تو حضرت اصغر اس ڈراما کے کوئی خاص کیرکٹر نہیں ہیں۔

یزید کی اخلاقی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ پست مورخین نے دکھلائی ہے۔ میں مجبور تھا میں نے تو صرف اس کی شراب خواری اور عیش پسندی کا ذکر کیا ہے، شراب خوار تھا بھی، خلفاء راشدین کے بعد اور جتنے خلفا ہوئے سب پیتے تھے اور دھڑلے سے پیتے تھے، دیکھو یزید کے متعلق سید امیر علی کیا فرماتے ہیں

"Yezid was both cruel and treacherous; His depraved nature knew no pity or justice. His pleasures were as degarding as his Compa-nions were low and vicious. He insulted the ministers of religion by dressing up a monkey

---

[1] ایک دوست کا کارڈ تھا جس میں انھوں نے ڈرامہ کی اشاعت کی مخالفت کی تھی۔

as a learned divine and carrying the animal mounted on a beautifully caparisoned Syrian donkey. Drunken riotousness prevailed at court ......"

امیر علی کو تو آپ مستند مانتے ہی ہونگے، کیا میں نے یزید کو اس سے بھی زیادہ پست کر دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں حالانکہ وہ مسلمان تھا۔ خوب دلیل ہے۔ نواب . . . بھی تو مسلمان تھا۔

تاریخی حیثیت سے آپ نے ساہس راؤ کے تداخل پر اعتراض کیا ہے۔ بیشک قدیم روایات میں اس کا کوئی ذکر نہیں، مگر ایک روایت ہے جو میں نے رسالہ آئینہ الہ آباد سے لی ہے، ممکن ہے وہ روایت غلط ہو۔ لیکن اگر مان لیجئے زیب داستان ہی کے لئے لی گئی ہو تو کیا ہٹڈراما تاریخ تو نہیں ہے۔ اس سے کسی تاریخی کیرکٹر پر اثر نہیں پڑتا۔ ان کیرکٹروں کا منشا ہے ہندوؤں کا حضرت حسین پر فدا ہو جانا، ان کا وجود ہی اسی لئے ہوا ہے۔ یہ ڈراما تاریخی ہونے کے ساتھ پولیٹیکل ہے۔

ادبی حیثیت کے متعلق آپکے اعتراض کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی انشا پرداز اور سحر نگار اور آتم قلم لکھدیا کرتے ہیں۔ میں بات کو سیدھی طرح سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں، رنگ آمیزی اور انشا پردازی میں قاصر ہوں۔ اور جب ڈراما اس لئے تیار کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام اسے پڑھے تو زبان آرائی اور بھی بے موقع ہو جاتی۔ بہرحال میں ڈراما کی اشاعت کے لئے مصر نہیں ہوں۔ اس لئے یہ بحث ملتوی اور ختم ہو گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے کرشن بیتی لکھی، ایک ہندو نقاد نے اس کی تعریف کی، صرف اس لئے کہ مولانا نے کرشن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا، میرا بھی یہی منشا تھا۔ اگر حسن نظامی کو وہ آزادی حاصل ہے اور مجھے نہیں ہے تو مجھے اس کا افسوس نہیں۔

براہ کرم اس مسودہ کو واپس فرما دیجئے۔

ہاں میں یہ عرض کرنا بھول گیا، ڈراما دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک قرأت کے لئے، ایک اسٹیج کے لئے، یہ ڈراما محض پڑھنے کے لئے لکھا گیا تھا، کھیلنے کے لئے نہیں۔ زیادہ والسلام۔"

اس کے بعد مزید خط و کتابت ہوئی اور ڈراما کی غزلوں کے بارے میں لکھا گیا جس کا جواب یہ ملا:۔ غزلیں حذف کرنیکی ضرورت نہیں میں نے حضرت حسین کی زبان سے کوئی عاشقانہ غزل کہیں نہیں ادا کرائی ہے۔ یزید کی مجلس میں غزلیں گائی گئی ہیں اور بے موقع نہیں ہیں۔ غزلوں کا انتخاب اچھا نہیں ہوا ہے تو آپ کو اختیار ہے

اچھی غزلیں چن کر شامل کر لیجئے ......

غرض اس طولانی بحث و مباحثہ کے بعد یہ ڈراما جولائی ۱۹۲۶ء سے "زمانہ" میں شائع ہونا شروع ہوا اور اپریل ۱۹۲۷ء تک مسلسل چھپتا رہا۔ اس دوران میں بھی بعض لوگوں نے اعتراضات کئے اور اخباروں میں بھی لے دے ہوئی، مگر چونکہ کسی نے کوئی ایسی بات نہ کہی جس پر پہلے ہی غور نہ کر لیا گیا تھا، اس لئے ان تحریروں کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر عموماً معترضین کا ولی منشا کچھ اور ہوتا ہے، اور مذہب کی آڑ میں یا تو دلی عناد نکالا جاتا ہے یا خواہ مخواہ مرعوب کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ مگر ان باتوں کا "زمانہ" نے کبھی کوئی اثر نہیں لیا۔ پریم چند کو بھی اظہار رائے میں باک نہ تھا مثلاً شدھی کی تحریک جس طرح چلائی گئی انھیں پسند نہ تھی، اس لئے گو اُن دنوں اُنھوں نے اُردو میں مضامین لکھنا بند کر رکھا تھا، لیکن اس تحریک کی مخالفت میں اُنھوں نے ایک پُرزور مضمون لکھکر "زمانہ" میں شائع کرایا۔ اس بارے میں ۲۳۔ اپریل ۱۹۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ادھر میں نے اُردو لکھنا بند سا کر رکھا ہے، فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ لیکن ملکانہ شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں، مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین چار دن میں بھیجونگا آریہ سماج والے جھنائیں گے، لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ اس مضمون کو "زمانہ" میں جگہ دیں گے۔"

آخر یہ مضمون "زمانہ" میں چھپا اور اس کے چھپتے ہی ملک میں آگ سی لگ گئی، مسلمانوں نے اس کے آزاد خیالی کی تعریف کی، اور آریہ سماجی حلقوں میں تہلکہ پڑ گیا لیکن پریم چند آخر تک اپنی رائے پر ڈٹے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ جاری ہے، میں نے پہلے ہی پیشین گوئی کی تھی۔ وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہے۔"

پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمان دونوں کے مخالف اور دونوں سے نالاں رہتے تھے۔ اور تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ اپنے افسانہ "دیر و حرم" میں انھوں نے ان دونوں کی خوب قلعی کھولی ہے۔ یہ افسانہ سب سے پہلے ہندی میں شائع ہوا، پھر اس کا اُردو ترجمہ کئی جگہ چھپا اور دفتر زمانہ کے ہفتہ وار اخبار "آزاد" میں بھی نقل ہوا۔ اس پر ایک مقامی مسلم پرچے نے بڑا واویلا مچایا، میں نے پریم چند کو اس مخالفت کی اطلاع دی تو انھوں نے ۲۵۔ جون ۱۹۳۲ء کو اس کا جواب یہ دیا کہ:۔

"اس مضمون میں کسی کو شکایت کا کیا موقعہ ہے۔ فرقہ پرستوں کی ذہنیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے، بلا کسی رو رعایت کے ایک طرف ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کی مذہب پروری کا نظارہ ہے، دوسری جانب مولویوں کی مذہب پروری کا دونوں مذہب کے پردے میں اپنی اپنی نفس پروری کے شکار ہو رہے ہیں۔ اگر کچھ لوگوں کو برا لگتا ہے تو میرا کیا اختیار ہے۔"

پریم چند پارٹی بندی سے بھی کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے اور نہ کسی خاص سیاسی پارٹی سے منسلک ہو جانا پسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو ملکی ترقی ہو۔ نان کو آپریشن کے آخری زمانے میں جب سوراجیہ پارٹی قائم ہوئی تو میں نے پریم چند سے پوچھا کہ آپ کی ہمدردی کس طرف ہے، اس کے جواب میں ۱۷۔ فروری ۲۳ء کو لکھتے ہیں کہ:-

"آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کس کس پارٹی میں ہوں، میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں۔ اس لئے کہ اس وقت دونوں میں کوئی پارٹی کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے۔ میں اسی آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔ سوراجیہ خلافت پارٹی کی جانب سے جو کانسٹی ٹیوشن نکلا ہے اس سے البتہ مجھے کلی اتفاق ہے، مگر تعجب یہی ہے کہ یہ ایک پارٹی سے کیوں نکلا۔ میرے خیال میں دونوں ہی پارٹیاں اس معاملے میں متفق ہیں۔"

واقعی اُن کی یہی خواہش تھی کہ ملک کے عوام اُبھریں اور خوشحالی و فارغ البالی کا دور دورہ ہو۔ اسی نقطۂ نظر سے وہ مذہب۔ سیاست اور علم ادب کو دیکھتے اور پرکھتے تھے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا زاویۂ نگاہ اور اُن کے خیالات بہترین سیاسی فلاسفروں کے موافق اور موجودہ ملکی ضروریات کے مطابق نہ تھے؟

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی صدارتی تقریر میں انھوں نے ادب کے متعلق اپنے دلی خیالات تفصیل و تشریح سے بیان کر دیے ہیں۔ لٹریچر کا صحیح مقصد کیا ہے اور مصنفین و مؤلفین کو تصنیف و تالیف میں کن باتوں کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے ان کی توضیح اُردو میں سب سے پہلے مرتبہ اسی تقریر میں ہوئی چنانچہ ہم اسے بجا طور پر ہندستانی ادب کا فرمان اعلیٰ قرار دے سکتے ہیں۔ جسے ہندستانی ادیبوں کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اسی خیال سے پریم چند ادب و معاشرت دونوں کی اصلاح کے زبردست حامی تھے اور جب کبھی ان کو موقعہ ملا انھوں نے عملی حیثیت سے اپنے خیالات کی پیروی میں دریغ

نہیں کیا۔ لیکن عقائد کی تائید میں وہ کسی طبقے کے ساتھ اعلان جنگ کے قائل نہ تھے اور نہ اصلاح کی دھن میں کسی کی دل آزاری پسند کرتے تھے۔ وہ دوسروں کے جذبات کا پورا احترام کرتے تھے۔ البتہ اُن کا دلی رُجحان اصلاح معاشرت ہی کی طرف تھا۔ مگر اسمیں بھی تشدد و ناانصافی سے انھیں نفرت تھی

پریم چند کا سیاسی میلان طبع گرم دل کی طرف تھا۔ احمد آباد کانگریس دیکھنے ہم لوگ ساتھ ہی ساتھ گئے اور ایک ہی جگہ ٹھہرے لیکن وہ مسٹر تلک کے طرفدار تھے اور میں مسٹر گوکھلے اور سر فیروز شاہ کا حامی تھا۔ ہر وقت بحث رہتی تھی مگر دونوں اپنی جگہ قائم رہے

جزوی اصلاحات کو وہ کافی نہ سمجھتے تھے اور منٹو مارلی اور مانٹیگو چیمسفورڈ کی اسکیم سے مطمئن نہ تھے۔

آئینی اصلاحات کے متعلق اُن کا نقطۂ خیال ان کے خط مورخہ ۲۱۔ دسمبر ۱۹۱۹ء سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر چنتامنی وغیرہم سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے، حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ اسامیاں زیادہ مل جائیں گی۔ اور جس طرح یہ جماعت وکیل بنکر رعایا کا خون پی رہی ہے، اُسی طرح آئندہ یہ حاکم بنکر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس کے سوائے اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ جو اختیارات دیئے گئے ہیں اُن میں بھی اتنی شرطیں لگا دی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہوگیا۔۔۔۔۔۔"

لبرل پارٹی نے مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے متعلق جس ضد اور اصرار سے کام لیا اور کانگریس کی مجوزہ ترمیمات میں سے کسی سے اتفاق رائے نہ کیا۔ اس سے مجھے بھی سخت اختلاف تھا۔ لیکن دنیوی معاملات میں میلان رجحان باہمی سمجھوتہ ہی کی طرف رہتا ہے۔ پریم چند برابر کی لڑائی میں سمجھوتہ کے خیال سے مشتبہ رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ اس کے لئے عوام کو جلد سے جلد تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت سے سخت ٹکر لئے بغیر کام نہ چلے گا اور وہ اس کے لئے نقصانات برداشت کرنے کے واسطے بھی تیار تھے۔ انگریز حکام سے انھیں عام طور سے بدظنی تھی اور بالآخر وہ سرکاری ملازمت ترک کر کے باضابطہ نان کوآپریٹر ہوگئے۔ ایک خط کا جس میں مہاتما جی کی تحریک نمک کو قبل از وقت کہا گیا تھا، وہ نہایت گرمجوشی سے جواب دیتے ہیں:۔

"جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے، ساہوکار کا تقاضا ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے اُسی طرح ایسے سارے کام جن میں ہمیں مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہو قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں اس تحریک کی قبولیت ہی بتلا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے۔

اس موقع پر صاف ظاہر ہوا کہ اگر دو فیصدی انگریزی خواں اصحاب تحریک کے ساتھ ہیں تو ۹۸ فیصدی اس کے مخالف ہیں۔ قومی اعتبار سے یونیورسٹیوں اور اسکولوں پر جتنا روپیہ صرف ہوا وہ قریباً ضائع ہوگیا۔ یہ لوگ سرکار کے آدمی ہوئے۔ قوم کے نہیں ہیں۔ غیر انگریزی داں۔ کاروباری اور پیشہ ور طبقوں ہی نے اس تحریک میں جان ڈالی ہے۔ اگر تعلیم یافتہ آدمیوں کے بھروسے ملک بیٹھا رہے تو شاید قیامت تک اُسے آزادی نصیب نہ ہوگی۔

جب معلوم ہے اور اس کے لئے ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں کہ سرکار کوئی رفارم اس وقت تک نہیں دیتی جب تک اُسے یہ یقین نہ ہوجائے کہ اس تحریک کے پیچھے کتنی طاقت ہے تو تعلیم یافتہ جماعت کا اس سے کنارہ کش رہنا کتنا دلشکن ہے! قانون پیشہ، طبابت پیشہ۔ پروفیسر اور سرکاری ملازمان ان سب نے جتنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اس کی مجھے اُمید نہ تھی۔ یہ طبقہ اپنی خیریت گورنمنٹ کا اقتدار قائم رہنے میں سمجھتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی آسائش اور دنیا طلبی کو فراموش نہیں کر سکتا یہی اس کا دین و ایمان ہے۔ وہ یا تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لئے قیمت نہ دے کر دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے۔ یا وہ اس خیال میں مگن ہے کہ آپ ہی آپ آزادی مل جائے گی۔ کانگریس کے دورِ اول میں وہ اس سے خائف رہا، کانگریس کے دورِ ثانی میں بھی اس کی یہی حالت رہی۔ وہ صریح دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ اُسے ملا اور جسے اب وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ دوسروں کے ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے۔ یہی Bourgeowe فضا ہے۔ جو نادار فرقہ کو دار فرقہ کا دشمن بنا دیتی ہے۔......

اس خط سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند ان دنوں سرکاری تشددات سے کس قدر متاثر ہوگئے تھے انھیں دنوں ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ

"گورنمنٹ کی زیادتیاں ناقابلِ برداشت ہو رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بدعتیں کی گئیں۔ اب باہر رہنے میں مجھے بھی بیحیائی معلوم ہو رہی ہے۔"

چند ہی روز بعد ۷۔ جون (غالباً سنہ ۱۹۳۰ء) کے خط میں لکھنؤ سے لکھتے ہیں:۔

"یہاں کی حالت تو آپ کو معلوم ہی ہے شہر فوجی کیمپ بنا ہوا ہے بالکل بے ضرورت........

ایک بات اور عرض کروں، اگر کہیں گرفتار ہوجاؤں یا ڈنڈے پڑجائیں اور روح قالب عنصری سے پرواز کرجائے تو میرے پسماندگان کی تھوڑی بہت خبر لیتے رہیئے گا۔ مجھے غریق رحمت کرکے اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا فرماکر خاموش نہ ہوجائیے گا۔ کیونکہ اس زمانہ میں سب کچھ ممکن ہے۔ آج محرم کا دن ہے، دیکھیں خیریت سے گذرتی ہے یا کل مارشل لا جاری ہوتا ہے۔ نفیر دھنپت رائے۔

ت یہ ہے کہ ظاہری بے پروائی کے باوجود پریم چند بڑے ذکی الحس اور خوددار واقع ہوئے تھے اور وقتی ش سے متاثر ہوجاتے تھے۔ مشترکہ ملکی معاملات میں باہمی منافقت انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جو ر ملک میں یگانگت پیدا کرنے میں گرمجوشی دکھاتے اُن پر فدا ہوجانے کو تیار ہوجاتے تھے۔ چنانچہ بنوری ۱۹۲۲ء کے خط میں بنارس سے لکھتے ہیں:۔

...... مجھے تو اس وقت علی برادران کی صلح کل پالیسی فریفتہ کررہی ہے۔ اُن کے خیالات میں جو حیرت انگیز انقلاب ہوا ہے میں اُس کو اصلی شدھی سمجھتا ہوں، اور ایسی ہی شدھی دیرپا ہوسکتی ہے۔"

پریم چند اس عمل و اثیار کے زمانہ میں لفظی اُلٹ پھیر کی شاعری کی کوئی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے بس اُردو شاعری سے بھی چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اور جیسا کہ فراق صاحب نے لکھا ہے رسمی غزل گو شعرا رہ دل سے ہیچ سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ جب "زمانہ" کا ایک پورا پرچہ آتش کی شاعری کے نذر کردیا گیا تو انھوں ایک نجی خط میں اس کے خلاف بڑے زور شور سے پروٹسٹ کیا۔ یہاں پر اس خط کا اقتباس خالی از دلچسپی ہوگا۔ لکھتے ہیں:۔

"زمانہ ماہ نومبر کا پرچہ دیکھکر میرے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے انھیں عرض کردینا اپنا فرض سمجھتا ہوں امید کہ آپ کو ناگوار نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں جبکہ گوناگوں اخلاقی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہماری تمامتر توجہ کے مستحق ہیں۔ مجھے یہ دیکھکر افسوس ہوا کہ "زمانہ" کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرہ کے نذر ہوگیا۔ میں آتش کی اُستادی کا قائل ہوں۔ لکھنؤ کی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلۃً کم ہے پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ یہ استادان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور سبھی طبائع کو موجودہ معیار اور ذوق صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع تہذیب اخلاق۔ مشاہدہ جذبات، انکشاف حقایق اور واردات و کیفیات قلب کا اظہار ہے جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانہ۔ خنجر و محشر۔ سبزہ و خط اور دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں جن کی افتاد طبیعت اس رنگ کی ہے۔

انھیں اختیار ہے آتش یا ناسخ رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں۔ لیکن زمانہ کے مختلف الطبائع ناظرین کو اس ورد وظیفہ میں شریک ہونے کے لئے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اس تبصرہ میں آتش کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے مگر اس انتخاب میں بیشتر ایسے اشعار ہیں جنھیں ذوق لطیف ہرگز قابل ستایش نہ سمجھے گا، ملاحظہ ہو:۔

بھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے　　آنکھ اٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا

آنکھ کی رعایت سے نرگس کو لاکر دامن نظارہ کو گل نرگس سے بھر دینا اس میں کیا ندرت خیال ہے، کیا حقیقت ہے، سمجھ میں نہیں آتا؛

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مرے　　خط دیا لیکن نہ بتلایا نشان کوئے دوست

نشاں کیوں نہیں بتلایا، تھی آپ کی حماقت یا نہیں۔ آپ کو خوف ہوا کہیں معشوق عاشق کا دم نہ بھرنے لگے، واہ رے معشوق اور واہ رے عاشق، دونوں زندہ درگور۔ ایسے اشعار ایک نہیں سیکڑوں ہیں، بہت چھان بین کرنے سے سو دو سو اشعار سارے دیوان میں ایسے نکلیں گے جو پاکیزہ کہے جا سکیں جن میں واقعی جذبہ، سچا درد، حسرت، چونکا دینے والی جدّت، رعشہ براندام کر دینے والی نازک خیالی، جنون انگیز مستی ہو۔ "زمانہ" میں اگر میرا اندازہ غلطی نہیں کرتا تو ایک درجن مرتبہ آتش کی مرثیہ کہی جا چکی ہے۔ یقیناً مشاغل ادب میں شعرائے سلف کی مرثیہ خوانی کے سوا اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں اور خاصکر ان شعرا کی جن کے دیوان کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رسالہ کے ایڈیٹر کو ذاتی رجحانات اور دوستانہ تعلقات سے بالاتر رہنا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ ہر رنگ اور ہر مذاق کے ناظرین کا لحاظ رکھے یہ نہیں کہ

غیرت مہر رشک ماہ ہو تم　　خوبصورت ہو بادشاہ ہو تم
جس نے دیکھا تمھیں وہ مر ہی گیا　　حسن کے تیغ بے پناہ ہو تم

(تیغ دیکھکر کون مر جاتا ہے)

فوق ہے سارے خوش جمالوں پر　　وہ ستارے جو ہیں تو ماہ ہو تم

جیسے طفلانہ جذبات کے اشعار سے پرچہ کا پرچہ بھر دیں

غزل کے بارے میں اُن کا اصلی خیال کیا تھا۔ اس پر انھوں نے اپنے ایک خط میں کچھ روشنی ...
حسر ... موڑا ما کر ملا کا رنا۔ لون کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وہ خیالات کی نزاکت نہ دیکھئے، یہ دیکھئے کہ غزل سلیس، عام فہم اور سلجھی ہوئی ہے یا نہیں۔ غزلیات میں اضافتیں اور بعید از فہم استعارے انھیں پسند نہ تھے۔

مکرمی عبداللہ یوسف علی صاحب نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا کہ پریم چند سے میری طرف سے کہہ دیجئے کہ میں اُن کی طرزِ تحریر کا مداح ہوں۔ لیکن انھیں ایسے ناول اور قصے لکھنا چاہئیے جن سے قومی جذبات کی نشوونما میں مدد ملے اور جو فوق العادت واقعات سے پاک ہوں۔ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ مسٹر عبداللہ کی رائے پر عمل کرونگا حالانکہ super natural Element انسان کی زندگی میں داخل ہے۔"

اسی طرح ایک دفعہ میرے قدیم محب و معاون مرحوم پنڈت مادھو رام صاحب وکیل انبالہ نے یہ شکایت کی تھی کہ پریم چند جی نے اصلاحی کہانیاں نہیں لکھیں، اس کا جواب دیتے ہیں کہ:-

" پنڈت مادھو رام صاحب کو شکایت ہے کہ میں نے اصلاحی کہانیاں نہیں لکھیں، اور اکثر احباب کو شکایت ہے کہ اصلاحی مقاصد میرے قصوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ میرے نصف سے زائد قصے کسی نہ کسی تمدنی معاملے سے متعلق ہیں۔ بازارِ حسن، پریم آشرم۔ رنگ بھوم کوئی بھی اصلاح سے خالی نہیں۔"

اسی خط میں ایک معزز لکھنوی دوست کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہیں جو ان کے مختصر افسانہ "شطرنج کی بازی" سے متعلق تھی، جس میں لکھنؤ والوں کی بے فکری کا مذاق آمیز پیرایہ میں خاکہ کھینچا گیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ:-

"اُن کے اعتراض بالکل ٹھیک ہیں لیکن انھوں نے قصے کا اصلی منشا نہ سمجھا۔ اُن جزئیات سے بحث کی ہے جن پر روشنی ڈالنے کا میرا ارادہ نہ تھا۔ دیکھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اُس وقت لکھنوی رؤسا کی یہ Mentality تھی یا نہیں جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ بس۔۔۔۔۔

۱۹۱۴ء تک وہ اپنے طرزِ تحریر کے متعلق ڈبدھے میں تھے۔ چنانچہ ۴ مارچ ۱۹۱۴ء کا خط اُن کے دلی حالات کا آئینہ ہے، لکھتے ہیں:-

".... مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کونسا طرزِ تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم[۱] کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد[۲] کے پیچھے چلتا ہوں، آجکل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں، تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت

ذہنیت [۱] بنکم چندر چٹرجی مشہور افسانہ نگار بنگال۔ [۲] شمس العلما آزاد دہلوی۔

مائل ہے، یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا۔ یہ قصہ جو میں روانہ کر رہا ہوں اس میں لطفِ تحریر کی مطلق کوشش نہیں کی گئی سیدھی سادی باتیں لکھی ہیں، معلوم نہیں آپ پسند کریں گے یا نہیں۔

ناول نویسی کا انھیں شروع ہی سے ارمان تھا چنانچہ ۲۴ جنوری ۱۹۱۶ء کا خط ہے:۔

"آجکل ایک قصہ لکھتے لکھتے ناول لکھ چلا، کوئی سو صفحوں تک پہونچ چکا ہے، اسی وجہ سے چھوٹا قصہ نہ لکھ سکا اب اس ناول میں ایسا جی لگ گیا ہے کہ کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر مارچ (نمبر زمانہ) کے لئے دو تین دن میں ضرور کچھ نہ کچھ بھیجوں گا، فروری کے لئے مجبوری ہے۔ اگر آپ اس ناول کو مسلسل دیں تو کیسا ہو؟ رسالہ کی موجودہ ضخامت اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکتی۔ قصہ دلچسپ ہے اور مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ میں اب کی بار ناول نویسی میں کامیاب ہو سکونگا۔۔۔۔۔۔"

"ابکی جو قصہ آپ کے پاس دو تین دن میں جائے گا اُسے عرصہ ہوا لکھا تھا مگر خوف کے مارے نہیں بھیجا، اس میں واعظ بن گیا ہوں حالانکہ کجا میں اور کجا پیر فرتوت۔ اگر پسند آئے تو چھاپ دیجئے ورنہ ہندی میں چھپ جائیگا۔۔۔"

ہندی کی طرف دو تین سال پہلے ہی سے مائل ہو رہے تھے، واقعی امر یہ ہے کہ اُردو کی کس مپرسی اور اُردو داں جماعت کی عام بے قدری نے اُن کا دل کھٹا کر دیا تھا۔ ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا بستی سے آیا ہوا ایک کارڈ ہے:۔

"زمانہ" کے لئے ایک قصہ لکھا ہے، اب میں ہندی میں بھی لکھ رہا ہوں، "سرسوتی" کو ایک مضمون دیا، "پرتاپ" کے لئے لکھا، اس سے زیادہ کام کرنے سے معذور ہوں"

۱۹۱۵ء ہی کا بستی سے لکھا ہوا ایک دوسرا خط ہے، جس میں لکھتے ہیں:۔

"پریم پچیسی کا ہندی ترجمے کے لئے کئی جگہ سے اصرار ہو رہے ہیں، میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لونگا۔ اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں، اُردو میں اب گذر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دونگا۔ اُردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا جو مجھے ہو جائے گا؟"

یہ خیال ترقی کرتا گیا، چنانچہ بنارس سے ۱۷۔ فروری ۱۹۲۳ء کا خط ہے:۔

"۔۔۔۔۔۔ میں از حد نادم ہوں کہ زمانہ کے لئے عرصے سے کچھ نہ لکھ سکا، بار بار ارادہ کرتا ہوں لیکن کبھی وقت نہیں ملتا اور کبھی مضمون نہیں سوجھتا۔ ہندی رسالوں میں لکھنے کے باعث وقت ہی نہیں ملتا۔ پھر اپنا ناول بھی لکھتے جاتا ہوں۔"

---

[1] ان دنوں میں انکے چھوٹے افسانوں کا قائل تھا اور لمبے قصوں میں انکا پڑھنا نہیں پسند کرتا تھا [2] الہ آباد کا مشہور ہندی رسالہ۔ [3] کانپور کا مشہور

"زمانہ کو پھر نقصان کا سامنا کرنا پڑا، افسوس ہے اُردو میں شاید اچھے رسالوں کا قائم رہنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کا باعث کیا ہے۔ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ لیکن غالباً سب مفت کے پڑھنے والے ہیں۔ سب کو دعویٰ نامہ نگاری ہے، سبھی اہل قلم ہیں، پڑھنے والا کوئی نہیں۔ اب ..... سے ایک نیا رسالہ ..... نکلنے والا ہے۔ دیکھوں کتنے دنوں چلتا ہے۔"

سرسوتی پریس بنارس سے ۳۱۔ مارچ ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا کارڈ ہے:-

"..... زمانہ کے لئے کچھ نہیں لکھ سکا۔ اس کی معافی چاہتا ہوں، اُردو میں کوئی پرسان حال تو ہے ہی نہیں۔ دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت پنجاب کو دیئے، ابھی کچھ طے نہیں ہوا ہے اور منشی ..... صاحب مارے تقاضوں کے ناک میں دم کئے ہیں۔ حالانکہ ۱۵۰ دے چکا ہوں، لیکن ابھی آنا ہی اور دینا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت ہی پر یہ خرچہ وصول ہوگا۔"

اُردو پبلشروں کی بے بضاعتی اور عام پست ہمتی سے دوسرے مصنفین و مؤلفین کی طرح پریم چند کو بھی ہر وقت کوفت رہتا تھا۔ زمانہ کے راستہ میں مالی مجبوریاں نہ ہوتیں تو دوسرے پبلشروں کا پریم چند کو خیال ہی نہ آتا۔ گورکھپور سے ایک خط میں اس بات پر بہت افسوس کیا کہ "مجھے اپنی کتابیں دوسروں کو دینا پڑتی ہیں ......"

اُنھوں نے خود بھی ایک دفعہ ایک لیتھو پریس قائم کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ خیال پورا نہ ہو سکا۔ ۲۲۔ اپریل ۲۳ء کا خط ہے:-

"میرا ارادہ ایک لیتھو پریس رکھنے کا ہے ..... لوگ کہتے ہیں بنارس میں لیتھو پریس نہیں چل سکتا۔ لیکن ایک بار کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں، میری کئی کتابیں نکلنے کے لئے تیار ہو رہی ہیں، پریم پچیسی ختم ہو گئی گوشۂ عافیت محض اس لئے ناتمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں ہے۔ نیا ڈراما سنگرام بھی اُردو میں نکالنا چاہتا ہوں جب تک یہ کتابیں تیار ہوں گی غالباً میرا نیا ناول تیار ہو جائیگا۔"

۳۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "لٹریری کام میں احباب کی قدر دانی کے سوا اور کیا رکھا ہے۔" پبلشروں نے اُن کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا، اس کا کچھ حال ان کے بعض خطوط سے واضح ہوتا ہے ایک خط مورخہ ۲۵۔ فروری ۳۲ء میں اس کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو:-

"پردۂ مجاز" ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا، کئی خطوط لکھ چکا، نہ روپئے بھیجتا ہے نہ کتابیں، نہ جواب دیتا ہے، معلوم نہیں۔ بیمار ہے یا کیا؟ ادھر غبن کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا ہے۔ مگر سرد بازاری بلائے جان ہو رہی ہے ..... کتابوں کی کافی بکری نہیں ..... میں اپریل میں بنارس

چلا جاؤنگا اور دیہات میں بیٹھکر لٹریری کام کرتا ہونگا، اگر ریڈریں منظور ہوگئیں تو تین سال تک کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ آئندہ کیا ہوگا ایشور جانے .... بڑی بہت تنگی حالت ہے اور سب خیریت ہے۔"

گورکھپور سے ایک خط مورخہ ۲۴ اپریل (سنہ ندارد) میں بھی اُردو کی کساد بازاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"کیا حوصلہ اخبار نویسی اور لٹریری کام کا ہو، پریم پچیسی حصہ اول کو چھپے ہوئے چار سال ہوئے، مگر ابھی تک نصف پڑی ہوئی ہے۔ حصہ دوم کی مشکل سے ۱۵۰ جلدیں بکیں۔ میں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا اور بہتر کامیابی کی اُمید نہیں رکھتا۔ آپ یہ سنکر خوش ہونگے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ بازار حسن کا ترجمہ ہے۔ "بازار حسن" اب صاف کر رہا ہوں"

انھیں حالات سے پریشان ہو کر اُنھوں نے دیسی کرگھوں کا کام شروع کرنا چاہا۔ اس پر جب میں نے لکھا کہ ہم لوگوں کی یہ لائن نہیں ہے، اس سے مالی فائدہ کی اُمید رکھنا فضول ہے، اس کے متعلق ان کے جواب سے بھی اُنکی دلی انتشار کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں :-

"آپ فرماتے ہیں تمہاری لائن یہ نہیں ہے، میں تسلیم کرتا ہوں مگر چارہ کیا ہے ؟ میں قربانی کو اپنی ذات تک رکھنا چاہتا ہوں، عیال کو اس چکی میں پیسنا نہیں چاہتا۔ فی الحال روٹیاں مل جاتی ہیں، کچھ لٹریری کام کر لیتا ہوں، یہ قربانی ہے۔ خدا اور دنیائے دوں، قوم اور ذات دونوں کو ساتھ لئے ہوں، میں لٹریری کام کو تھوڑی قربانی نہیں سمجھتا۔ جو شخص اپنی فالتو آمدنی کا ایک حصہ کسی مدرسہ کے لئے خیرات کر دیتا ہے وہ ہماری قربانی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، جو اپنے لئے سونا تک حرام کر لیتی ہے۔ آپ نے میرے لئے کوئی ایسی تجویز نہیں نکالی جس میں فکر معاش سے آزاد ہو کر میں زندگی کاٹتا۔ میں عرض کر چکا کہ اس سے زیادہ نفس کشی میرے امکان سے باہر ہے اور آپ نے جب کبھی کوئی تجویز کی تو وہی ہوائی۔ آکاشی معاش سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ضروریات کے لئے مستقل صورت چاہیئے۔ تکلفات کے لئے آکاشی صورت ہو تو مضائقہ نہیں .... اخباری زندگی میں کس قدر فکر اور جھنجھٹ ہے ...... ابھی ہمارے یہاں وہ زمانہ نہیں آیا کہ جرنلزم کو Career (وجہ معاش) بنایا جا سکے"

سرجیت اوپندر ناتھ اشک لاہوری نے ایک خط کا اقتباس شائع کیا ہے، اس میں بھی پریم چند نے کتب فروشوں کی سخت شکایت کی ہے، لکھتے ہیں :-

---

۱ یہ ریڈریں ابتدائی درجوں کے لئے تیار کی گئی تھیں۔

۲ غالباً ہزار بارہ سو کاپیاں چھپی تھیں۔

۳ پہلے اُردو میں لکھا گیا تھا مگر جب اُردو میں کوئی پبلشر نہ مل سکا تو اس کا ہندی ایڈیشن مرتب کیا گیا جو اُردو سے پہلے چھپا۔

"بک سیلروں کا تجربہ آپ سے زیادہ تلخ مجھے ہوا ہے .... میرے ڈیڑھ سو روپئے دبائے بیٹھا ہے لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلیشر میرے سات سو روپیے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے، بک سیلروں کا یہ، بیچارہ مصنف کیا کرے....."

اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ بیسوں اصحاب بے تکلف خوشہ چینی ہی نہیں بلکہ ادبی سرقے کے مرتکب ہوتے ہیں چنانچہ ایک خط میں اس کی شکایت کرتے ہیں کہ:-

"میرے قصّوں کے آجکل بہت چوری ہو رہے ہیں، ممکن ہے آپ کو زیادہ نظر آتے ہوں۔ مجھے ....[1] دیکھنے کا موقعہ ملا .... نکالتے ہیں، حضرت نے میری عبارت کے پورے پورے پیراگراف نقل کر ئیے ہیں۔ جنوری۔ فروری۔ مارچ۔ تینوں نمبروں میں یہی حال ہے۔ اوٹ پٹانگ قصہ لکھکر اُسے سرقہ کے لباس سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ فروری کے "ذخیرہ"[2] میں "ظریف الطبع" ایک قصہ ہے لکھنؤ کے ایک صاحب نے لکھا ہے، اُسے پڑھیئے اور امیرا قصہ "مناؤں" پڑھیئے، صاف چربہ معلوم ہوگا، صرف جزئیات میں ردّ و بدل کر دیا گیا ہے۔ دماغ پر زور نہ ڈالا چاہیں اور مضمون نگار بننے کا خبط یا جنون سوار، .... کہئے تو ان چوریوں پر ایک چھوٹا سا شگوفہ چھوڑ دوں، یہ حضرات جز بز ہونگے ہوا کریں.......... مگر اردو میں یہ باتیں معمولات میں ہیں۔" این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر"

میں نے اُنھیں پریس کے جھنجھٹ میں پڑنے سے بھی روکا تھا۔ میری رائے تھی کہ وہ ترکِ ملازمت کے بعد صرف تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری سے واسطہ رکھیں اور اسی میں استقلال کے ساتھ مصروف رہیں لیکن وہ ایک مستقل کارخانہ قائم کرکے بندھی ہوئی آمدنی کی سبیل نکالنا چاہتے تھے۔ پریس کے کام میں جیسا کہ اُنھیں بعد میں محسوس ہوا بلا سمجھے بوجھے کود پڑے اور نقصان کثیر اُٹھایا۔ جب پریس و اخبارات کی بدولت کافی زیر بار ہو گئے اور بعض کارپردازوں نے بدمعاملگی سے بھی مزید نقصان پہونچایا۔ تو اُنھیں کسی دوسرے ذریعہ سے روپیہ پیدا کرنے کی فکر ہوئی۔ ہندی تصانیف سے تھوڑا سا سرمایہ جمع ہو گیا تھا، مگر پریس کے نقصانات سے اس کے فنا ہونے کا اندیشہ ہو گیا جس کو وہ پسند نہ کرتے تھے کیونکہ اس رقم کو وہ بچوں کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس خیال سے کہ اس میں مزید کمی نہ ہو جائے اور پریس کی زیرباری بالا ہی بالا پوری ہو جائے۔ اُنھیں فلمی دنیا میں داخل ہونا پڑا۔ نقصان کے باوجود پریس بند کرنے کی طبیعت نہ ہوتی تھی۔ ان کی روز افزوں شہرت نے فلم کمپنیوں کو اُن کا

---

[1] لاہور کے ایک اُردو رسالہ کا نام تھا [2] ایک دوسرا اُردو رسالہ جو غالباً حیدر آباد دکن سے نکلتا تھا۔

طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ انھیں دنوں شریمتی جنیندر کمار جی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ۔

"بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے، تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکہ کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ پر میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب مجھکو اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں۔ ۔ ۔ ۔ کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے، میں جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کرونگا۔ یہیں (بنارس میں) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کرونگا اور چار پانچ ہزار روپیے مل جایا کریں گے جن سے "جاگرن" اور "ہنس" دونوں مزے میں چلیں گے۔ اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔"

اُس وقت اُنھیں منجملہ اور حسابات کے دو ہزار روپیے کے قریب کاغذ کی قیمت میں ادا کرنے کو تھے۔ مجھے بھی اس کے متعلق لکھا تھا۔ بمبئی سے ۱۰۔ جولائی ؁۳۴ء کا خط ہے: ۔

"میں یکم جون کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ سال بھر میں چھ قصّے اُسے دینا ہونگے۔ رسالوں سے متواتر نقصانات ہو رہے تھے۔ بک سیلروں سے روپیے وصول نہ ہوتے تھے، کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر میں نے یہ معاہدہ کر لیا۔ چھ قصّے لکھنا مشکل نہیں ہاں ڈائرکٹروں کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے۔ کیا چیز فلم کے لئے موزوں ہوگی، اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر سال بھر بھی پُورا نہ ہونے پایا کہ وہ فلم ڈائرکٹروں سے اُکتا گئے، اور وہاں کی واقعی دنیا نے اُن کی آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ ۲۰۔ اپریل ؁۳۴ء کو جنیندر کمار جی کو پھر لکھتے ہیں کہ

"میں جن ارادوں سے یہاں آیا تھا اُن میں سے ایک بھی پُورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہے ہیں اُس لیک سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتے۔ رکیک مذاق کو یہ لوگ تماشے کی جان سمجھتے ہیں، اُن کا عقیدہ انوکھا ہے۔ راجہ رانی وزیروں کی سازشیں، نقلی لڑائیاں بوسہ بازی یہی اُن کے مقصد ہیں۔ میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنھیں تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن ان کو فلم کرتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ چلیں یا نہ چلیں۔ یہ سال تو پُورا کرنا ہی ہے قرضدار ہو گیا تھا قرض پٹ جائیگا، مگر اور کوئی فائدہ نہ ہوا ناول گئو دان کے آخری صفحات لکھنے کو باقی ہیں، ادھر طبیعت ہی نہیں جاتی، اپنے پُرانے اڈّے پر جا بیٹھوں، وہاں دولت نہیں ہے مگر سکونِ قلب ضرور ہے، یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں۔"

۱۴۔ جنوری ؁۳۵ء کو مسٹر اوپیندر ناتھ کو لکھتے ہیں: ۔

"بمبئی میں تو اب زندگی سے تنگ آگیا ہوں، یہاں ڈائرکٹروں کی ذہنیت ہی انوکھی ہے۔ بازارِ حسن کی مٹی پلید کردی...... رِل البتہ کچھ اچھی ہے......... لیکن سچ پوچھو تو مجھے وہ اپنا کنجِ عافیت ہی زیادہ پسند ہے، جلد ہی بنارس چلا جاؤنگا۔"

مکرمی ضیاء الدین برنی صاحب کے نام اُنھوں نے بمبئی سے ایک خط بھیجا تھا جسمیں لکھا ہے کہ "بمبئی میں مجھے ہم مذاق آدمی نہیں ملتا، اِس لیئے آپ سے ملنے کا مجھے کتنا شوق ہوسکتا ہے وہ آپ سمجھ سکتے ہیں"۔

پریم چند ایک ہی وقت میں مختلف قسم کے ادبی کام کے مشکلات پر ۲۸۔ نومبر ۲۸ و ۲۹ء ۱۹ء کے خط میں گورکھپور سے لکھتے ہیں:-

"...... بازارِ حسن عدیم الفرصتی کا شکار ہو رہا ہے۔ اِسی اثنا میں "بانگِ سحر" ہوگیا اور دو صفحے ہو بھی چکے اب کچھ دنوں سے چھوٹے قصّے لکھنا بند کر کے علمی مضامین لکھنے کی کوشش کرونگا۔ دماغ ایک ساتھ دو مختلف پلاٹ نہیں سنبھال سکتا۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے، یا تو ناول لکھوں یا کہانیاں، ناول میں ایک ہی پلاٹ کافی ہے اور اس کا لکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ہر ماہ دو تین کہانیوں کا......

پریم چند کی زندگی جن خرخشوں میں کٹی اس کا بہت کافی ذکر ہو چکا ہے۔ اپنی زندہ دلی کے باوجود آخر میں وہ بچوں کی کم سنی کے خیال سے متردد ہوجاتے تھے۔ ۹۔ جنوری ۳۲ء کے خط کے آخر میں اپنے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"آپ لڑکیوں کے اعتبار سے پدریت کے جس درجے میں ہیں، لڑکوں کے اعتبار سے اُسی درجے میں میں ہوں۔ اس وقت مجھے اِن خرخشوں سے نجات مل جانی چاہیئے تھی تاکہ کسی گوشہ میں بہ اطمینان پڑا ہوا کچھ لکھا پڑھا کرتا۔ مگر یہاں ابھی بچے پال رہا ہوں، جو کام چالیس کی عمر میں ہونا چاہیئے وہ اب پچپن سالے میں ہو رہا ہے۔ جب آدمی بہ تنزہ ہو جاتا ہے۔......

۲۱۔ ستمبر ۳۵ء کے خط سے بھی مایوسی کا اظہار ہوتا ہے:-

پیسے کے اعتبار سے ہم دونوں گھاٹے میں رہے، آپ نے بھی خون پسینہ ایک کیا، میں نے شاید آپ سے زیادہ۔ آنسو پونچھنے کو کچھ نام ملا، مگر ہم دونوں نے ایسی علت پال لی کہ اس سے تا دمِ آخر گلو خلاصی ہونے کی اُمید نہیں۔ زمانہ نے آپ کو پامال کیا۔ پریس نے مجھکو...... اگر بیچ میں بمبئی نہ چلا جاتا تو شاید اب تک پریس بند ہوگیا ہوتا۔ بہت اچھا ہوتا۔ لیکن انسان ہوس کا پُتلا ہے۔ نقصان اور پریشانی

اُٹھا رہا ہوں، پھر بھی پریس چلائے جاتا ہوں۔"

۱۵۔ جون ۱۹۳۵ء کا خط ہے:۔

"پریس کے جنجال سے کسی طرح رہائی نہیں ہوتی...... ابتک پندرہ ہزار کا نقصان ہو چکا ہے، مگر کیا کروں۔ گلے میں جو ڈھول پڑ گئی ہے اُسے بجائے جاتا ہوں"

واقعہ یہ ہے کہ پریم چند تصنیف و تالیف ہی کے کام کے تھے، وہ پریس کیا کوئی تجارتی کاروبار کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے تھے، انھیں اِس قضیے میں پڑنا ہی نہ تھا۔ میں نے بھی پریس جاری کیا تھا لیکن دو ہی تین سال میں جی بھر گیا۔ اور جب گھر کا کوئی آدمی اس کام میں نہ لگ سکا تو آخر اُسے بند ہی کرنا پڑا۔ پریم چند کی مصیبت یہ تھی کہ ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرنا چاہتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ:۔

"جس توجہ سے (پریس میں) کام کرنا چاہیئے وہ نہ دے سکا۔ گھر پر لٹریری کام کرتا ہی ہوں۔ اس کام کو تفریح کے طور پر کرتا رہا۔ مگر تفریح خرچ کی چیز ہے۔ تجارت دل و جان دونوں چاہتی ہے۔"

ان کی دوسری دقت یہ تھی کہ دوستوں سے مسلوک ہونا چاہتے تھے اور جہانتک ہو سکتا تھا لوگوں کی حاجت روائی بھی کرتے تھے، گو اس میں کبھی کبھی تکلیف ہو جاتی تھی جیسا کہ معمولی ذرائع رکھنے والے ہر دوست نواز اور ہمدرد انسان شخص کو بارہا تجربہ ہوا ہو گا۔ انھیں بھی خلاف توقع نقصانات پیش آ جاتے تھے۔ اور وہ بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھی دل ہی دل میں پچھتانے لگتے تھے اور خود اپنی نکتہ چینی کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسے موقع بھی آئے ہیں جب مجھے دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے ہیں لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو اُن پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متموّل آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں لیکن تموّل کا اظہار مجھے پنپنے نہیں دیتا۔"

دراصل یہ تموّل کا اظہار نہ تھا بلکہ انسانی غیرت اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ کا تقاضا تھا کہ کوئی خاص سرمایہ نہ رکھنے کے باوجود اور اپنی آیندہ ضرورتوں کو نظر انداز کر کے بھی وہ ضرورتمند دوست آشناؤں کی کاربرآری کو تیار ہو جاتے تھے۔

ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ اسی طرح کی کشمکش میں کٹا بقدر ہمت وسعت نہ رکھنے والوں کا یہی حال ہے۔ لیکن ایسے لوگ ان لوگوں سے کہیں زیادہ دلبشاش رہتے ہیں جو اپنے بہت ہی قریبی عزیز کے سوائے اور کسی کو دھیان ہی میں نہیں لاتے ہیں۔ اور یہ تو پرانی بات ہے۔

کریماں را بہ دست اندر درم نیست   خداوندانِ نعمت را کرم نیست

بہرحال اس مزاج کے آدمی کو دنیا سے کوئی شکایت نہیں ہوتی اور بخت نارسا کا رونا کبھی نہیں روتا ہے۔ پریم چند بھی شاکر و صابر تھے اور مصائب و مشکلات کے اخلاقی پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ ایک دوست کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"مصائب کا اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔ آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں اور انھیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔"

یہ فلسفانہ نقطۂ خیال کتنا تسکین بخش ہے اس میں شک ہی کیا ہے کہ پے در پے تجربات انسان کو مشکلات کا خوگر بنا کر طبیعت میں استحکام پیدا کر دیتے ہیں جس کے سامنے دولت کی چنداں حقیقت نہیں رہتی ہے۔ اور حالات پر قابو پانے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

پریم چند نے کبھی کسی کی خوشامد روا نہ سمجھی اور نہ کبھی کسی رئیس یا والی ملک کی مہمانداری و قدردانی کے خواہشمند ہوئے۔ اگر کبھی کسی سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو اس کی تعریف کے پل بھی کبھی نہیں باندھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ:-

علم و ذہانت، فہم و فراست، اور دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنا دینا چاہئے۔

وہ نہ مادہ پرستی کے قائل تھے اور نہ سرمایہ داری کے حامی۔ ہندو فلسفہ اُن کی زندگی کا سہارا اور خدمت خلق اور حق و صداقت اُن کی زندگی کا مقصد تھا۔

وہ ہر چیز کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اپنے روحانی مقاصد میں اس حد سے کامیاب رہے کہ انھیں آرام طلبی کی عادت نہ تھی، اور فضول تکلفات کو انھوں نے اپنی روزمرہ زندگی میں دخل نہیں ہونے دیا۔ اور نہ اپنے لئے کبھی کوئی خاص اہتمام کرنا پسند کیا۔ بیسوں دفعہ ایسا ہوا ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی ضروری چیز خرید لائے مگر کسی عزیز نے اُسے پسند کر لیا اور وہ دم بخود ہو گئے۔ جنھوں نے انھیں دھوکا بھی دیا، خودغرض احباب سے بھی انھیں سابقہ پڑا مگر وہ سب کو ہنسی خوشی نباہتے رہے بہت دنوں کی بات ہے جب پریم چند کانپور میں اسکول ماسٹر تھے اور قلیل تنخواہ پاتے تھے۔ وہ اپنے لئے ایک نیا کوٹ سلوا لائے اور ایک نیا جوتا خرید لائے۔ مگر دونوں چیزیں اُن کے ایک نادار عزیز نے جو ان دنوں اُن کے ساتھ رہتے تھے بے پوچھے استعمال کرنے لگے۔ پریم چند نے اس کا کوئی خیال نہ کیا، اور خوشی خاطر سے اپنا پرانا کوٹ اور پرانا جوتا پہنتے رہے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ

مسنر پریم چند صاحبہ نے بھی لکھا ہے
جب کبھی پہاڑ وغیرہ جانے کا ذکر ہوا تب بھی عزیزوں کا خیال سدراہ ہوجاتا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے ایک خط کا اقتباس ہے کہ

"جب کبھی اس قسم کا ارادہ کرتا ہوں تو مجھے فوراً گھر والوں کا خیال آجاتا ہے کہ میں تو وہاں تفریح کروں اور یہ بچارے یہاں سڑا کریں۔ بس اسی خیال سے رُک جاتا ہوں کتنے بھر کو لیجانا مشکل ہے۔ میرے لئے خس کا ایک پردہ اور دو تین پیسے کا روزانہ برف موسم کی تکلیف کے لئے کافی ہے۔"

پریم چند کھانے پینے میں پرہیز کے عادی نہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ضعف معدہ کی شکایت کا وہ کامیابی سے مقابلہ نہ کرسکے وہ غذا کے عادی نہ تھے، مگر اُن سے دیر تک غذا کے متعلق کوئی پابندی نہ ہوسکتی تھی۔ ادنیٰ سی تحریک پر وہ بد پرہیزی کر بیٹھتے تھے۔

مزاج بھی کبھی کبھی متلون ہوجاتا تھا۔ بعض اوقات ذراسی بات مرضی کے خلاف ہونے پر ملول خاطر ہوجاتے تھے لیکن اگر دوسرے شخص نے اپنی غلطی مان لی یا اُن کے رفع ملال کی ذراسی بھی کوشش کی تو پھر فوراً پانی ہوجاتے تھے۔ ہاں جب اُنھیں یہ خیال ہوتا کہ دوسرے کو ان کی کوئی پرواہ نہیں ہے تو اُن کے دل پر ضرور ٹھیس لگتی تھی۔ تاہم یہ کہنا سچ ہوگا کہ پریم چند دنیا میں آرام کرنے نہیں بلکہ دوسروں کو آرام پہونچانے اور کام لینے نہیں بلکہ کام کرنے آئے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی اُردو۔ ہندی ادب کو فروغ دینے میں صرف کردی، اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ ہندوستانی زبان کی ترقی کی کوشش میں اس لئے منہمک تھے کہ وہ اسے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ سچے محب وطن اور کامل ادیب تھے۔ اور فن کا کامل وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا دل وسیع، نگاہ بلند، طبیعت بے ریا اور نیت صالح ہو۔ جو زر پرست نہ ہو، بلکہ انسان دوست ہو، جاہ وحشم کا پرستار نہ ہو بلکہ ادنیٰ واعلےٰ ہر ایک کا ہمدرد ہو۔ اور ہر حال میں بے لوث رہ کر زندگی کے حقائق سے واقفیت پیدا کرتا رہے۔

مضمون طولانی ہوگیا، مگر میری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی، بقول شاعر:۔

لطیف بود حکایت دراز تر گفتیم

بہرنوع ناظرین رسالہ کے قیمتی وقت کا خیال ضروری ہے۔ اس لئے اس طوالت کی معذرت کرکے یہ مضمون یہیں پر ختم کیا جاتا ہے، ورنہ میرے لئے " ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے "۔

جی تو یہی چاہتا ہے کہ کوئی بات لکھنے سے باقی نہ رہ جائے۔ سچ ہے:۔
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!

دیا نرائن نگم

"زمانہ" اور پریم چند

۱۹۱۰ء کے پہلے تک پریم چند صاحب کے مضامین "نواب رائے" کے نام سے شائع ہوئے۔ اِس کے بعد پریم چند کا نام شروع ہوا۔ بعض نوٹ بلا نام بھی درج ہوئے مگر اِس وقت اُن کا چھانٹنا مشکل ہے۔ پریم چند صاحب نے بعض اہم تنقیدیں بھی زمانہ کے لئے لکھیں جو کبھی اُن کے نام سے اور کبھی بلا نام شائع ہوئیں۔ اُنھوں نے زمانہ کے لئے بہت سے اَدبی مضامین، سوانحعمریاں، افسانے اور ترجمے مستقل مضامین کی حیثیت سے لکھے۔ سرسری طور پر حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے ۹۶ مستقل مضامین خاص طور پر زمانہ کے لئے لکھے، جس میں ۶ چھ تنقیدیں، ۱۵ پندرہ سوانح عمریاں، ۱۵ پندرہ متفرق مضامین اور ۵۹ اُنسٹھ مختصر افسانے ہیں۔ مرحوم نے ڈنمارک کے نامور مصنف میٹرلنک کے ایک مشہور و معروف تمثیلی ڈرامے کا اُردو ترجمہ بھی "شبِ تار" کے نام سے ۱۹۱۹ء میں زمانہ کے لئے کیا، جو رسالہ کے تین نمبروں میں شائع ہوا۔ واقعاتِ کربلا کے متعلق اُن کا اوریجنل ڈرامہ جولائی ۱۹۲۶ء سے لیکر اپریل ۱۹۲۸ء تک زمانہ کے ۱۷ سترہ مختلف نمبروں میں ہدیۂ ناظرین ہوا۔

تنقیدی مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔ تنقید

(۱) ناول کرشن کنور مصنفۂ حکیم برہم مرحوم — مندرجۂ زمانہ فروری ۱۹۰۵ء

(۲) آئینِ قیصری اور محاربات شمس العلماء ذکاء اللہ — " " اپریل ۱۹۰۵ء

(۳) سوانح عمری ملکۂ وکٹوریہ (" ") " " اگست ۱۹۰۵ء

(۴) وِکرم اُروسی (ترجمہ مولوی عزیز مرزا صاحب " " فروری ۱۹۰۶ء

(۵) پیکِ ابر (ترجمہ میگھ دت) " " جولائی ۱۹۱۷ء

(۶) رسالہ اُردو " " اگست ۱۹۲۱ء

۲۔ سوانح عمریاں

(۱) راجہ مان سنگھ — مندرجۂ زمانہ اکتوبر ۱۹۰۵ء

(۲) آنریبل گوپال کرشن گوکھلے	مندرجہ زمانہ نومبر۔دسمبر ۱۹۰۵ء
(۳) گیری بالڈی	〃 〃 جولائی ۱۹۰۷ء
(۴) ٹامس کینس برو	〃 〃 ستمبر ۱۹۰۷ء
(۵) سوامی دیوکانند	〃 〃 مئی ۱۹۰۸ء
(۶) مصور رینالڈس	〃 〃 جنوری ۱۹۰۹ء
(۷) رنجیت سنگھ	〃 〃 مئی ۱۹۱۱ء
(۸) ڈاکٹر جنڈارکر	〃 〃 جون ۱۹۱۳ء
(۹) رانا جنگ بہادر	〃 〃 جولائی ۱۹۲۳ء
(۱۰) بھارتیندو بابو ہریشچندر	〃 〃 جنوری ۱۹۲۴ء
(۱۱) کالی داس کی شاعری	〃 〃 ۱۹۱۴ء
(۱۲) بہاری	〃 〃 ۱۹۱۷ء
(۱۳) کیشو	〃 〃 جولائی ۱۹۱۷ء
(۱۴) منشی گورکھ پرشاد عبرت	〃 〃 نومبر ۱۹۱۹ء
(۱۵) متن دوبے	〃 〃 دسمبر ۱۹۲۱ء

۳۔ اَدَبی مضامین :-

(۱) فنِ تصویر	مندرجہ زمانہ مارچ ۱۹۰۶ء
(۲) گالیاں	〃 〃 دسمبر ۱۹۰۷ء
(۳) ہندو تہذیب اور رفاہ عام	〃 〃 مارچ ۱۹۱۲ء
(۴) قیس	〃 〃 ۱۹۱۳ء
(۵) ہنسی	〃 〃 فروری ۱۹۱۶ء
(۶) دورِ جدید و قدیم	〃 〃 فروری ۱۹۱۹ء
(۷) کاؤنٹ ٹالسٹائی اور فنِ لطیف	〃 〃 مارچ ۱۹۲۷ء
(۸) اُردو۔ہندی۔ہندستانی	〃 〃 اپریل ۱۹۳۵ء
(۹) ادب کی غرض و غایت	〃 〃 اپریل ۱۹۳۷ء

۴۔ متفرق مضامین کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) دیسی اشیاء کو کیونکر فروغ ہو سکتا ہے؟ مندرجہ زمانہ جون ۱۹۰۵ء
(۲) صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم 〃 〃 مئی۔جون ۱۹۰۸ء
(۳) ترکی میں آئینی سلطنت 〃 〃 اگست ۱۹۰۸ء
(۴) ہندستانی ریلوں کی تاریخ 〃 〃 جنوری ۱۹۱۵ء
(۵) موجودہ تحریک کے راستہ میں رکاوٹیں 〃 〃 اکتوبر۔نومبر ۱۹۲۱ء

۵۔ مختصر افسانے جو خاص طور پر زمانہ کے لئے لکھے گئے یہ ہیں :-

(۱) روٹھی رانی مندرجہ زمانہ اپریل مئی و اگست ۱۹۰۷ء
(۲) عشق دنیا اور حب وطن مندرجہ زمانہ اپریل ۱۹۰۸ء
(۳) سیر درویش مندرجہ زمانہ اپریل مئی۔جون ۱۹۱۰ء
(۴) رانی سارندھا 〃 〃 اگست و ستمبر ۱۹۱۰ء
(۵) بڑے گھر کی بیٹی 〃 〃 دسمبر ۱۹۱۰ء
(۶) وکرمادیتہ کا تیغہ 〃 〃 جنوری ۱۹۱۱ء
(۷) کرشمۂ انتقام 〃 〃 فروری ۱۹۱۱ء
(۸) دونوں طرف سے 〃 〃 مارچ ۱۹۱۱ء
(۹) راجہ ہردول 〃 〃 اپریل ۱۹۱۱ء
(۱۰) منزلِ مقصود 〃 〃 اگست و ستمبر ۱۹۱۱ء
(۱۱) آہِ بیکس 〃 〃 اکتوبر ۱۹۱۱ء
(۱۲) آلہا 〃 〃 جنوری ۱۹۱۲ء
(۱۳) ماتما 〃 〃 فروری ۱۹۱۲ء
(۱۴) راج ہٹ 〃 〃 ستمبر ۱۹۱۲ء
(۱۵) عالمِ بے عمل 〃 مئی و جون ۱۹۱۲ء
(۱۶) تریا چرتر 〃 جنوری ۱۹۱۳ء
(۱۷) موت اور زندگی 〃 مارچ ۱۹۱۳ء
(۱۸) اماوس کی رات 〃 اپریل ۱۹۱۳ء
(۱۹) نگاہِ ناز 〃 مئی ۱۹۱۳ء
(۲۰) ملاپ مندرجہ زمانہ جون ۱۹۱۳ء
(۲۱) اندھیر 〃 〃 جولائی ۱۹۱۳ء
(۲۲) صرف ایک آواز 〃 اگست و ستمبر ۱۹۱۳ء
(۲۳) بانکا زمیندار 〃 〃 اکتوبر ۱۹۱۳ء
(۲۴) اناتھ لڑکی 〃 〃 جون ۱۹۱۴ء
(۲۵) خون سفید 〃 〃 جولائی ۱۹۱۴ء
(۲۶) شکاری اور راجکمار 〃 اگست ۱۹۱۴ء
(۲۷) شامتِ اعمال 〃 ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء
(۲۸) پچھتاوا 〃 نومبر ۱۹۱۴ء
(۲۹) مرہم 〃 جنوری و فروری ۱۹۱۵ء
(۳۰) غیرت کی کٹار 〃 جولائی ۱۹۱۵ء
(۳۱) بیٹی کا دھن 〃 نومبر ۱۹۱۵ء
(۳۲) دو بھائی 〃 جنوری ۱۹۱۶ء
(۳۳) پنچایت 〃 مئی و جون ۱۹۱۶ء
(۳۴) سر پُرغرور 〃 اگست ۱۹۱۶ء
(۳۵) جگنو کی چمک 〃 اکتوبر ۱۹۱۶ء
(۳۶) دھوکا 〃 نومبر ۱۹۱۶ء
(۳۷) راجپوت کی بیٹی 〃 جنوری ۱۹۱۷ء
(۳۸) شعلۂ حسن 〃 مارچ ۱۹۱۷ء

(۳۹) مشعلِ ہدایت	مندرجہ زمانہ مئی ۱۹۱۷ء	(۴۹) دستِ غیب	مندرجہ زمانہ اپریل ۱۹۲۱ء
(۴۰) فتح	〃 〃 اپریل ۱۹۱۸ء	(۵۰) لال فیتہ	〃 〃 جولائی ۲۱ء
(۴۱) راہِ خدمت	〃 〃 جون ۱۹۱۸ء	(۵۱) موٹھ	〃 〃 جنوری ۱۹۲۲ء
(۴۲) خنجرِ وفا	〃 〃 نومبر ۱۹۱۸ء	(۵۲) بزمِ پریشاں	〃 〃 جون ۱۹۲۲ء
(۴۳) قربانی	جنوری ۱۹۱۹ء	(۵۳) حسنِ ظن	〃 〃 اکتوبر ۱۹۲۲ء
(۴۴) آتمارام	جنوری ۱۹۲۰ء	(۵۴) شطرنج	〃 〃 دسمبر ۱۹۲۴ء
(۴۵) مہرِ پدر	جولائی ۱۹۲۰ء	(۵۵) مایۂ تفریح	〃 〃 فروری ۱۹۲۵ء
(۴۶) نوک جھونک	دسمبر ۱۹۲۰ء	(۵۶) منتر	〃 〃 فروری ۱۹۲۸ء
(۴۷) روحِ حیات	جنوری ۱۹۲۱ء	(۵۷) عفو	〃 〃 مئی ۱۹۲۹ء
(۴۸) معمہ	مارچ ۱۹۲۱ء	(۵۸) علیحدگی	〃 〃 فروری ۱۹۳۰ء

۶ - ڈرامے :-

(۱) شبِ تار	مندرجہ زمانہ اکتوبر نومبر ۱۹۱۹ء
(۲) کربلا	زمانہ جولائی ۱۹۲۶ء لغایت اپریل ۱۹۲۸ء کے مختلف نمبروں میں

ایڈیٹری کے فرائض پریم چند کی نظر میں

اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ کے قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے قومی وسیع النظری سے، اور جو کچھ سوچتا ہے اُس پر بھی قومیت کی مُہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اُس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر اور ناقابلِ توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین اقتضا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر وہ اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد عظیم۔ اور اُس کا معیار پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ اُن زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے، جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے۔ جنکا نام امر ہو گیا ہے جو مظلوم قوموں کے لئے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا۔ جس سے اُسکے پیشروؤں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگانے کا اندیشہ ہو۔

(فردوسِ خیال) — پریم چند

یادگارِ پریم چند

حصّہ دوم

پریم چند کی افسانہ نگاری

کچھ عرصہ ہوا ہمارے دوست ایڈیٹر صاحب "نیرنگ خیال" نے ملک کے مشہور افسانہ نگاروں سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ افسانہ کیونکر لکھتے ہیں؟ منشی پریم چند نے اس استفسار کا جو جواب دیا تھا ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ ایڈیٹر

"میرے قصّے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ انہیں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں، بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں، لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اوّل سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیریکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں، کہ اس افسانے کے حسبِ حال ہوں میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا، کہ افسانے کی بنیاد کسی پُرلطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمیکس موجود ہوں۔ تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو۔ میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے، مجھے اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمیکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدان جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی۔ یہ

عقدہ حل ہونے سے کلائمیکس نکل آتا تھا۔ تیور وجیہہ نہ تھا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اِس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں، اِسطرح وہ قصہ تیار ہوگیا۔

کبھی کبھی سُنے سُنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ اُن پر افسانہ کی بُنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے، لیکن کوئی واقعہ محض چٹپٹے دار اور چُست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بناپر افسانہ نہیں ہوتا۔ مَیں ان میں کلائمیکس لازمی چیز سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اِس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائمیکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے، جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو مَیں اِس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانہ کی روح ہے۔

مَیں سست رفتار بھی ہوں، مہینے بھر میں شاید مَیں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے، بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مِل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا، یہ ایک ذہنی امر ہے، سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں، لیکن شاعری کی طرح اِس کے لئے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لئے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے، نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد مَیں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اسمیں مجھے کچھ نُدرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے، تو میں اُسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں، ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہوجاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو مَیں نے فیل سمجھا تھا۔ اُسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اِس لئے مَیں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

پریم چند

شاعری

شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ درد کے ہوں یا مُسرت کے اُسی وقت دِل میں پیدا ہوتے ہیں، جب ہم درد یا مُسرت کا مزہ چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونیکے بعد اُنکا زبانِ قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔

(جلوۂ ایثار)

پریم چند

پریم چند افسانہ نگار کی حیثیت سے

از مولانا عبد الماجد دریا آبادی بی - اے

الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کے دورِ اقبال کا آفتاب جب غروب ہونے کو آیا، اور بوستانِ خیال اور طلسم ہوش ربا کے دفتر، جب زمانے کے ہاتھوں "داخل دفتر" ہونے لگے، تو "صاحب" کے قدموں کی برکت سے، ایک نئی دُنیا، دِلوں اور دماغوں کی، خیالات اور جذبات کی، سرزمین ہند پر آباد ہونے لگی، اور اِس دیس کے لوگ ایک نئی چیز اور نئے نام "ناول" سے آشنا ہونے لگے۔ "طلسمات" کی جگہ اب "سین" اور "سینری" "کوہ قاف" کی جگہ شہر کی گلیاں اور بالا خانے، "شہباز فکر" کی جگہ "پلاٹ"، "دیووں اور شہزادوں" کی جگہ "ہیرو" اور "پریوں اور شہزادیوں کی جگہ "ہیروین"!

شاگرد نے اُستاد کے مُنھ سے نکلے ہوئے اُنچھر گرہ میں باندھ لئے، اور خود بھی وہی بولنا اور وہی سوچنا، وہی لکھنا اور وہی پڑھنا شروع کردیا، جس کے سبق اِسکول اور کالج میں پڑھے تھے۔ اُردو میں ناول چھپنے لگے اور بکنے لگے، لکھے جانے لگے اور پڑھے جانے لگے۔ اور ناول بھی ہر ہر رنگ کے، ہر ہر ڈھنگ کے، کوئی تاریخی اور کوئی محض خیالی، کوئی معاشرتی اور کوئی اصلاحی۔ پیسہ اخبار اسٹریٹ کی طرف قدم اُٹھائیے، تو "جاسوسی" بھی اور "ادب لطیف" کے ضلع میں آجائیے تو "قاموسی" بھی!

شرر و سرشار، اپنے اپنے فن میں اُستاد، ناول نویسوں کے لشکر کے علمبردار۔ پیچھے پیچھے چلنے والوں کی تعداد بے شمار!

بات میں بات نکلتی ہے، اور شاخ سے شاخ۔ بڑے ناول تو کتابی صورت کے لئے مخصوص رہے، اُن کے ولیعہد "مختصر افسانے" پیدا ہوئے، اور وہ رسالوں اور ماہناموں میں نکلنے لگے۔ بازار میں اُن کی مانگ بھی خوب رہی۔ اور ناول اور مختصر افسانے، علم و ادب کی شاخ تو کسی ایک ہی آدھ کیلئے، باقی ایک پُر منفعت تجارت اور کامیاب کاروبار بہتوں کے لئے بن گئے، لیکن اِن سب میں ہوتا کیا تھا؟ ناول ہو یا شارٹ اسٹوری، عام ذہنوں کے سامنے اُن کا مفہوم تھا کیا؟ وہی حُسن و عشق کی پُرانی داستان، وہی لیلیٰ و مجنون، شیرین و فرہاد کی ہزار ہا مرتبہ کی

دُہرائی ہوئی کہانی، جو لاکھ پُرانی ہونے پر بھی اب تک پُرانی نہیں ہوئی ہے!

یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پُرانا ہرگز!

بس یہی کہ فلاں کی آنکھ فلاں سے لڑ گئی، فلاں، فلاں کے ساتھ نکل گئی۔ اُس کی عصمت یوں لُٹی، اِس کی آبرو یوں بچی، کسی لب پہ آہِ سوزاں، کسی کے جگر میں زخم پیکاں۔ یہ اُس پر مفتون، اور وہ اِس کے لئے مجنوں۔ ایک اپنی آرزوؤں میں کامیاب ہوگیا، دوسرا ناشاد، نامُراد دُنیا سے کوچ کرگیا — گویا ہر داستان حیات داستان نل دمن اور ہر افسانۂ زندگی، افسانہ شیریں و کوہکن! ناول کی دلکشی کا راز عشق و عاشقی کی گھاتوں میں اور ناول نویس کے قلم کا اعجاز جوانی کی راتوں میں! یہاں زندگی مترادف تھی، صرف ہجر و وصال کے۔ صرف رُخ و خال کے۔ گویا انسانی زندگی اپنی ساری زنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوجود کیا تھی؟ غزل کا ایک مضمون اور دنیائے عمل اپنی ساری وسعت و پہنائی کے باوجود کیا تھی؟ مشاعرہ کی ایک محفل!

یہ رنگ تھے اور یہ ڈھنگ کہ ایک گوشہ سے۔ چپکے سے پریم چند نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے، فضا کی کایا پلٹ کرگئے۔ دبے پاؤں خاموشی سے آتے وقت نہ شور پیدا ہوا نہ ہنگامہ۔ لیکن جب گئے تو یارانِ بزم کا انداز ہی کچھ سے کچھ اور! جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے، نہ کسی سے اُلجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ، بات چیت کرتے تو سادہ تر پاتے۔ بس یہی معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبہ کے، معمولی پڑھے لکھے سے آدمی ہیں، اور زیادہ کُرید اگر آپ نہ کرتے، تو یہ بھی نہ پتہ چلتا کہ ہیں کس مذہب کے۔ رہے جب تک تو یوں رہے، اور گئے، تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھ کر، صاحب طرز ہوکر یا "صاحب" کے محاورہ میں اپنا ایک مستقل "اسکول" چھوڑ کر! — یہ نہیں کہ پریم چند سے پہلے کسی کو عام ڈھترے سے ہٹنے کا خیال ہی نہ آیا ہو۔ مستثنیات کس کلیہ میں نہیں ہوتے؟ اُردو میں بھی بعض باکمال یقیناً ایسے گزر چکے تھے، جن کا قلم ان بے اعتدالیوں اور عُریانیوں سے بالکل بچ بچ کر چلا، اور جو زندگی کو زندگی سمجھے شاعری کا مترادف نہیں سمجھے، لیکن اُن کی کوششیں اور کاوشیں بس اُنھیں کی ذات تک محدود رہیں۔ دریا میں پتھر آکر گرا، چکر بنا — تلاطم ہوا — لیکن آناً فاناً سب غائب، اور تھوڑی دیر میں سطح برابر! دھارے کا رُخ پھیرنا، وہ جتنا بھی سہی، پریم چند ہی کے نصیب میں آیا۔

پریم چند خود تو اپنی اُردو کتابوں میں بازارِ حسن کو نمبر اوّل پر رکھتے تھے، لیکن اِس کم سواد، بے استعداد کا خیال ہے، کہ سب سے بڑھ چڑھ کر، اُن کی ضخیم کتاب دو جلدوں، اور ایک ہزار صفحہ والی چوگانِ ہستی ہے۔ کہیں سے بھی کھول لیجئے، یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے

ختم کئے بغیر ہی ماننے کا نہیں۔ آورد اور تصنع،
اُلٹ کر دیکھئے، سادگی، بیساختگی، آمد کے لحاظ سے ہر
دلکشی، دلآویزی، اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونۂ بہار۔
ولیمی "صاحب" عیسائی مذہب شخص ہیں، پکے دُنیا دار، اُن کی توجہ
مذہب کی جانب ہوجاتا ہے، ایک موقع پر ماں بیٹی سے دو بدو گفتگو
لڑکی کے بوڑھے دادا، اور جہاں تک ظاہری احکام کا تعلق ہے بڑے
آجاتے ہیں، سب کے قلمی چہرے اِس آئینہ میں ملاحظ ہوں:۔

"صوفیہ۔ میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات نہیں مانتی۔

مسز سیوک۔ میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ کہہ کر وہ صوفیہ کے کمرہ میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی نئی کتابیں اُٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینکدیں، اُسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جا کر ایشور سیوک سے بولیں "پاپا۔ آپ صوفی کو ناحق بُلا رہے ہیں، وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے"۔

مسٹر ایشور سیوک ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے۔ "کیا کہا۔ صوفی حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ صوفی؟"

مسز سیوک۔ ہاں، ہاں! صوفی! کہتی ہے۔ مجھے اُن کے معجزوں، اُن کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے۔

ایشور سیوک۔ (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسُوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا! کہاں ہے صوفی! مجھے اُس کے پاس لے چلو! میرے ہاتھ پکڑ کر اُٹھاؤ۔ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر! میں اس کے پیروں پر گر دوں گا۔ اُس سے منتیں کروں گا۔ اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا۔ مجھے اُس کے پاس لے چلو!۔

مسز سیوک۔ میں سب کچھ کر کے ہار گئی۔ اُس پر خدا کا قہر ہے۔ میں اُس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک۔ بیٹی ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون۔ میری جان کی جان ہے! میں اُسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسُوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا!

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اُٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ کے دروازہ پر آکر بولے۔ "بیٹی صوفی! کہاں ہے؟ ادھر آ بیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں۔ ہمارا یسوع خدا کا

ط، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا، گنہگاروں

یا ایسا کون سا نبی ہے، جس کا دامن اتنا وسیع ہو۔

ں، ساری برائیوں کے لئے جگہ ہو؛ وہی ایک ایسا ہی ہے جس

ہگاروں کو نجات کا مژدہ سُنایا نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کیلئے

، والا کون تھا؟"

ں نے صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔" (چوگان ہستی جلد اول۔ ص ۴۶-۴۸)

سے آخر تک کتنی سچی اور کیسی مطابق واقعہ ہے۔ صرف آخری ٹکڑے میں ذری سی ہے۔ جہاں حضرت مسیحؑ کو ایک مسیحی کی زبان سے خدا کا نبی کہا ہے، یہ عقیدہ اسلامی یا مسیحیوں کے نزدیک تو "خدا کے اکلوتے بیٹے" کو نبی کہنا اُس کی توہین کرنا ہے۔ لیکن ئ لغزشیں افسانہ میں، اور وہ بھی محض ضمناً قابل اعتنا نہیں۔

ںھیں مس صوفیہ پر، ضلع کے انگریز نوجوان کلکٹر مسٹر کلارک کا دل آجاتا ہے اور محبت شروع اتی ہے۔ صاحب بہادر، مع صوفیہ کے ایک بڑی ریاست جسونت نگر میں مہمان ہیں۔ یہیں جیل میں ر محبّ وطن اور رئیس زادہ ونے سنگھ، صوفیہ کا دل سے چاہنے والا قید ہے، صوفیہ بھی حقیقتاً سے اُسی کی طرف مائل ہے، کلکٹر کے ساتھ محض مصلحتاً نباہ کر رہی ہے۔ دیوان ریاست سردار نیلکنٹھ ن داری کی خدمات کے لئے وقف ہیں، صوفیہ جیل میں ونے سنگھ کو دیکھ کر اپنا اشتیاق کرنا چاہتی ہے، اور اِس لئے جسونت نگر میں ابھی اور ٹھہرنا ضروری ہے۔ اُس کے بعد اصل لواب خود سُنئے۔

"شہر کا گشت کر کے صوفیہ، مسٹر کلارک، سردار نیلکنٹھ اور دو ایک اعلیٰ ملازمین سرکاری توشاہی محل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہوگئے۔ میز پر چاء لائی گئی۔ مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنھیں شراب کی بُو سے نفرت تھی۔ کھسک کر صوفیہ کے پاس جا بیٹھے اور بولے

—— جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

صوفیہ۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ پہاڑیوں کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی سے جی خوش ہوگیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں۔
نیلکنٹھ ڈر گئے۔ ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُر امن رکھا جا سکتا ہے مگر مہینے دو مہینے تک کسی طرح بھی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ کہیں یہاں ٹھہر گئیں تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی

روشن ہوجائیگی۔ نہ جانے اُس کا کیا انجام ہو۔ بولے "یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آئیے آب وہوا بہت خراب ہے۔ آگے جاکر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے۔"

صوفیہ۔ کچھ ہی ہو۔ میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی۔ کیوں ولیم۔ تمہیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک۔ تم یہاں رہو تو میں دفن ہوجانے کو تیار ہوں۔

صوفیہ۔ لیجئے سردار صاحب ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

صوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

نیلکنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کرونگا۔ کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب وہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہوگئی ہیں۔

صوفیہ۔ جب تو ہمارا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے۔ میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سُنی۔ گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو ونما پانے کا موقع دیا جائے۔ اس کی ذمہ داری ریاست کے حُکام پر ہے اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لئے اُن سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ صوفیہ سے اُنھوں نے یہ بات بیخوف ہوکر کہہ دی تھی۔ اس کی منکسر مزاجی سے اُنھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میری نذر ونیاز نے اپنا کام کر دکھایا ہے۔ وہ کچھ بے تکلف سے ہوگئے تھے۔ یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چوندھیا گئیں۔ التجا کے لہجہ میں بولے "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتی الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ زہر کے قطرے سنہری برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے والنٹیروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جاسکتی ہے مگر سادھوؤں سے نہیں۔ رضا کا[روں] نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بیوقوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اُتارنے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا تو نہایت شریر طبیعت کا آدمی ہے......

... ... ہم لوگوں کی نیند حرام ہوگئی ہر لحہ بغاوت کی

آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی۔ ونے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہوگیا مگر اس کے دیگر رفقا ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے۔ کئی بار دستے کو جیل سے نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی جا چکی ہے اور ملازمین کو ہمیشہ اپنی جانوں کا خوف بنا رہتا ہے۔ مجھے مجبور ہوکر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز نہ دوں گا۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے!

صوفیہ نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ "واقعی حالت اس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائم مقام ہوکر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لئے نہیں۔ کیوں ولیم تمہیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔

مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کر سکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا وہ تمہارا کام ہے۔"

نیلکنٹھ۔ میری آپ سے مودبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لئے کچھ اور وقت دیجئے آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لئے مضر ہوگا۔" (چوگان ہستی، جلد ا، صفحہ ۔۔۔)

اقتباس طویل ذرا زائد ہوگیا۔ لیکن بائینر مصور کی ہنرمندی کے نمونے دکھانے میں بخل بھی کہاں تک روا رکھا جائے؟ ریاستوں کی بے بسی، میم صاحب کی ذہانت و ذکاوت، اور سب سے بڑھکر صاحب بہادر کے بے پناہ اختیارات کی ہمہ گیری، ہر شے ان میں سے اپنے اپنے موقع پر کیسی جڑی اور کیسی جڑی ہوئی ہے! اس کا نام ہے قلم کی مرصع کاری!

بات ذرا الگ ہوئی جاتی ہے، لیکن کلکٹر صاحب کی اس خدائی پر اکبر کا ایک شعر بیساختہ یاد آگیا۔ اپنے ہم مذہبوں کے سامنے خدا تعالی کی قدرت کا وعظ فرماتے فرماتے کہتے ہیں، کہ موضوع تو طول کہاں تک دوں، بس یہ سمجھ لو، کہ خدا تعالی کو وہ اختیارات حاصل نہیں، جو صاحب کلکٹر بہادر کو ہوتے ہیں! (معاذ اللہ)

اس کی قدرت کا کہاں تک میں کروں تم سے بیاں
میں تو اللہ تعالی کو کلکٹر سمجھا!

"کہاں تک" کی بلاغت ملاحظہ ہو! شاعر بیان کرتے کرتے تھک گیا ہے، آخر میں عاجز آکر

ایک بے مثال سب سے بڑی، جامع و مانع دے رہا ہے!

شہری زندگی کی نقاشی بہتوں نے کی ہے۔ اسکول میں اور کالج میں، پارک میں اور چمن میں، کچہری اور اسٹیشن پر سب ہی گھومے پھرے ہیں۔ کھیت کی مینڈوں پر کوئی کم ہی چلا ہے۔ دیہات کے چوپالوں میں، اہیروں اور بھڑبھوں کی جھونپڑیوں میں کم ہی کسی کے قدم گئے ہیں۔ پریم چند کے قلم کا اصلی جولانگاہ یہی ہے۔ فن کے دوسرے لوازم میں تو اُن کے نظیر مل بھی جائیں گے لیکن جہاں تک دیہاتی زندگی کی مصوری کا تعلق ہے۔ اب تک پریم چند کے جوڑ پر کوئی نظر نہیں پڑا دیہات کے جس جس منظر کا سماں دکھلاتے ہیں، دور سے تبلاتے نہیں، گویا اُٹھا کر وہیں پہونچا دیتے ہیں۔ ایک گاؤں ہے، اور برسات کا موسم، کہ اتنے میں موضع کے زمیندار ٹھاکر صاحب دورہ فرماتے ہیں، گاؤں کی لہلہاہٹ اور ٹھاکر صاحب کی قہرمانی دونوں ملاحظہ ہوں:-

"اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی نبیاتن نویلی دولہن بنی ہوئی تھی۔ اور ناتہ کش کمہار بارات کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں اُن کے نگاہِ کرم کے منتظر۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت اُن کے دستِ شفقت کے محتاج۔ جسے چاہتے تھے بسلاتے تھے، جسے چاہتے تھے اُجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز، منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پُرمزہ شغل تھا۔ نالا پُرشور۔ ندیاں اتھاہ۔ چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت کا حسنِ بسیط۔ اُنھیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی بارات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور ساز وسامان۔ لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ! گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کرد فر دیکھا تو رہے سہے ہوش اُڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور غنڈے گلیوں میں۔" (پریم پچیسی جلد ۲۔ ص ۶۳-۶۲)

دوسرا منظر:-

"دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رشکِ گلزار بنا ہوا تھا۔ بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے۔ مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سُنائی دیئے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر۔ زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گزرا۔ جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اُگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں، کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے اور داروغہ جی کی مسّرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آیند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک و احتشام، وہی لٹھیتوں کا رسالہ، وہی غنڈوں کی فوج! گاؤں والوں نے اُن کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگائے، دودھ کے حوض بھر دیئے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے بینڈے پر پہونچے تو پورے ایک سو آدمی اُن کی پیشوائی کے لئے دست بستہ کھڑے تھے۔" (ایضاً ص ۶ تا ۶۸)

چوگانِ ہستی میں اگر کمال یہ تھا کہ پلاٹ کی بندش، اتنی طوالت اور اتنی ضخامت کے باوجود کہیں سے سُست نہیں ہونے پائی اور اتنے پھیلاؤ کے باوجود دلآویزی میں خلل پڑنے کا کوئی لمحہ نہیں آنے پایا، تو یہ چھوٹے چھوٹے افسانے بھی جن کے مجموعہ کا نام "پریم پچیسی" ہے۔ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ دو جلدیں اس کی بھی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں عجب دلکشی، سادے اور میٹھے بولوں میں غضب کی موہنی، ہر ہر فقرہ گویا موتیوں کی لڑی!—— فریب نظر کی حد یہ ہے کہ دھوکا خود اپنے متعلق ہونے لگے۔ پریم چند کے افسانہ خوانوں کو یہ کب یاد رہ جاتا ہے، کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے، اور وہ سرگزشت کسی اور کی پڑھ رہے ہیں؟ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خود ہمارے اوپر گزرتی چلی جا رہی ہے۔ بچے بھی ہیں، بوڑھے ہیں۔ ہمیں ظالم، ہمیں مظلوم۔ ابھی ہنس بھی ہم ہی رہے تھے۔ ابھی رونے بھی ہم ہی لگے!—— تماشہ سے لطف اُٹھایا کیسا، بازیگر کی داد دینا کجا، ہم خود تماشہ بن گئے۔

شرافت، پریم چند کے قلم کی جان، اور رُوحِ انسانیت کی بیداری اُن کے ہر افسانہ کا عنوان ہے۔ اُن کے افسانے اس کام کے نہیں کہ نوجوانوں کے نفسانی خیالات کو بھڑکائیں، اُکسائیں۔ وہ اِس غرض کے لئے ہیں کہ رُوح کی پاکیزگی کو جگائیں، گرمائیں۔ منظر کیسا ہی گندہ ہو، اُن کی نظرِ انتخاب ہمیشہ اُنھیں عنصروں کو چُن لیتی ہے، جو نفس کو نہیں، روح کو تڑپائیں، جذبات کے سفلی نہیں، علوی حصّے کو گرمائیں، اور بدی کی نہیں نیکی کی قوت کو حرکت میں لائیں۔

سمن، ایک شریف ہندو، گجادھر پرشاد کی بیوی ہے، پڑوس میں ایک بازاری عورت آکر رہتی ہے۔ بچپن کی بات سمن کے کان میں پڑی ہوئی ہے کہ بیسواؤں کا پیشہ بھی ذلیل ہے، اور کوئی بھلا آدمی اُن کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔ اب اپنی آنکھ سے جو کچھ دیکھتی ہے اُس پر اُسے اچنبھا ہوکر رہ جاتا ہے، اور نفس کی نظروں میں اگر بدی سر تا سر خوشنما نہیں آنے لگتی ہے، تو کم از کم پیشتر کی سی بدنما اور گھناونی تو یقیناً نہیں باقی رہتی ہے۔

سمن کے مکان کے سامنے بھولی نام کی ایک طوائف کا مکان تھا۔ بھولی نت نئے سنگار کرکے اپنے بالاخانہ کے چھجہ کے پر بیٹھا کرتی۔ پہر رات تک اُس کے کمرہ سے نغمۂ خوش آیند کی صدائیں آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ فٹن پر سوار ہوکر ہوا کھانے جایا کرتی۔ سمن اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

سمن نے سن رکھا تھا کہ طوائفیں بہت ہی ذلیل اور بدکار ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ناز و انداز سے نوجوانوں کو اپنے دام میں پھنسا لیا کرتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی اُن سے بات چیت نہیں کرتا۔ بعض شوقین لوگ رات کو چھپ کر اُن کے یہاں جایا کرتے ہیں۔ بھولی نے کئی بار اُسے چق کی آڑ میں کھڑے دیکھ کر اشارہ سے بلایا تھا۔ پر سمن اُس سے بولنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ میں غریب سہی مگر اپنی عصمت پر تو قائم ہوں کسی شریف آدمی کے گھر میں میری روک تو نہیں۔ بھولی کتنا ہی عیش و آرام کرے پر اُس کی کہیں عزت تو نہیں ہوتی۔ بس اپنے کوٹھے پر بیٹھی اپنی بے شرمی اور اپنی بے حیائی کا سوانگ دکھایا کرے۔ لیکن سمن کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اُسے حقیر سمجھنا میری غلطی ہے۔

اساڑھ کے دن تھے۔ گرمی کے مارے سمن کا دم گھٹ رہا تھا۔ شام کے وقت اُس سے اندر نہ رہا گیا۔ اُس نے چق اُٹھا دی اور دروازہ پر بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ بھولی بائی کے دروازے پر کسی تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں بہشتی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ صحن میں ایک شامیانہ تانا جا رہا تھا۔ شیشہ آلات ٹھیلوں پر لدے چلے آتے تھے۔ فرش بچھایا جا رہا تھا۔ بیسوں آدمی اِدھر سے اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ اتنے میں بھولی کی نگاہ سمن کی طرف اُٹھی قریب آکر بولی "آج میرے یہاں مولود ہے دیکھنا چاہو تو پردہ کرا دوں۔ ؟"

سمن نے بے پروائی سے۔ "میں یہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لونگی"

بھولی۔ دیکھ تو لوگی پر سن نہ سکوگی۔ ہرج کیا ہے اوپر پردہ کرا دوں؟

سمن۔ مجھے سننے کی اتنی خواہش نہیں۔

بھولی نے اُس کی طرف ایک نگاہ ترحم سے دیکھا اور دل میں کہا یہ گنوارن شاید دیہات سے

آئی ہے۔ اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھے بیٹھی ہے۔ اچھا آج تو دیکھ لے کہ میں کون ہوں۔ اُس نے زیادہ اصرار نہ کیا۔

رات ہو رہی تھی۔ چولھے کی صورت دیکھ کر سُمن کی رُوح کانپ رہی تھی، پر طوعاً و کرہاً اُٹھی چولھا جلایا۔ کھچڑی ڈالی اور پھر دروازہ پر آکر تماشہ دیکھنے لگی۔ آٹھ بجتے بجتے شامیانہ گیس کی روشنی سے گنبد نور بن گیا۔ پھول پتّوں کی آرائش ہونے پر سُہاگ کی تھی۔ تماشائی چاروں طرف سے آنے لگے۔ کوئی بائیسکل پر آتا تھا۔ کوئی ٹمٹم پر، کوئی پیدل، تھوڑی دیر میں دو تین فٹنیں بھی آ پہونچیں ایک گھنٹہ میں سارا صحن بھر گیا۔

اس کے بعد مولانا صاحب تشریف لائے۔ ان کے چہرے سے اک جلال برستا تھا اور وہ آراستہ تخت پر مسند لگا کر آ بیٹھے اور مولود شروع ہوگیا۔ کئی آدمی مہمانوں کی تواضع و تکریم کرنے لگے۔ کوئی گلاب چھڑکتا تھا کوئی خاصدان پیش کرتا تھا۔ سُمن نے شرفا کی ایسی مجلس آج تک کبھی نہ دیکھی تھی۔

نو بجے گجادھر پرشاد آئے۔ سُمن نے اُنھیں کھانا کھلایا۔ گجادھر بھی کھانا کھا کر اسی مجلس میں شریک ہوگئے، اور سُمن کو تو کھانے کی سُدھ ہی نہ تھی۔ گیارہ بجے رات تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ پھر شیرینی تقسیم ہوئی اور بارہ بجے مجلس ختم ہو گئی

گجادھر گھر میں آئے تو سُمن نے کہا "یہ سب کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے" ؟

گجادھر۔ میں سب کو پہچانتا تھوڑے ہی ہوں۔ بھلے بُرے سبھی ہوں گے۔ شہر کے کئی رئیس بھی تھے۔

سُمن۔ کیا یہ لوگ ایک طوائف کے گھر آنے میں اپنی توہین نہیں سمجھتے۔ ؟

گجادھر۔ توہین سمجھتے تو آتے ہی کیوں۔

سُمن۔ تمھیں تو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی ہوگی۔

گجادھر۔ جب اتنے شرفا بیٹھے ہوئے تھے تو مجھے کیوں شرم آنے لگی ؛ وہ سیٹھ جی بھی آئے تھے جن کے یہاں میں شام کو کام کرنے جایا کرتا ہوں۔

سُمن نے پُر خیال انداز سے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ ان عورتوں کو لوگ بہت ذلیل سمجھتے ہیں" !

گجادھر۔ ہاں ایسے لوگ بھی ہیں پر گنے گنائے۔ انگریزی تعلیم نے لوگوں کو آزاد بنا دیا ہے۔ بھولی بائی کی شہر میں بڑی عزت ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، ہوا بالکل بند تھی۔ گجادھر پرشاد دن بھر کے تھکے ہوئے

چار پائی پر جاتے ہی سو گئے۔ پر سُمن کو نیند نہ آئی۔

دوسرے دن شام کے وقت جب وہ پھر چِق اوٹھا کر بیٹھی تو اُس نے بھولی کو چھجّے پر بیٹھے دیکھا۔ وہ برآمدے میں نکل کر خود بھولی سے بولی۔ "رات تو آپ کے یہاں بڑی دھوم تھی"

بھولی سمجھ گئی کہ میری فتح ہوئی۔ مُسکرا کر بولی "تمھارے لئے شیرینی بھیج دوں۔ حلوائی کی بنائی ہوئی ہے اور برہمن لایا ہے۔"

سُمن نے شرماتے ہوئے کہا "بھجوا دیجئے گا۔"

ہماری معاشرت جس طرح شیطان کی اعزازی ایجنٹ بنی ہوئی ہے، اُس کی تصویر اس سے مکمل لطیف بھی، اور پُر درد بھی اور کیا ہو گی؟ ——— لوگ قصہ کہانیوں کو محض لطف و تفریح لئے پڑھتے ہیں، لیکن اس لطف کے ساتھ ہی ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو، بدی کی مخفی راہوں کا شیطنت کی خفیہ چالوں کا احساس، وطنیت کا صحیح جذبہ، اور ایثار، اخلاص اور خدمت کسی تربیت بھی اگر مدِ نظر ہو، تو ایسی شیریں، خوش گوار کونین[51]، پریم چند ہی کے دواخانہ دستیاب ہو گی۔ اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ، مورخ کا قلم جب آج سو پچاس برس کے بعد لکھیگا تو اس کے تینتیس[۳۳] پینتیس[۳۵] برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں بھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری اور ابو الکلام کی تقریریں اور یں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔

علم و ذہانت

علم اور ذہانت، فہم اور فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنانا چاہئیے۔ کا کام ہے تہذیبِ اخلاق، اور تہذیبِ اخلاق کا نتیجہ فیاضی، فراخدلی، ایثار، بے نفسی، ہمدردی، غریب دوستی اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت و جاہ کا غلام بنائے، جو ہمیں زیر دست آزاری پر مائل کرے، جو ہمیں نفسانیت کا مطیع بنائے، جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک کرے، تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلا ہوس و طمع کے بس میں ہو جائیں تو قابلِ معافی ہیں، مگر مدعیانِ علم و تہذیب کیلئے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے

پریم چند

(Quinine)

"منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر"

(از ایچ-ایل- گاندھی، بی-اے جرنلسٹ)

منشی پریم چند کی وفات ایک قومی حادثہ ہے۔ جس کا ملال عرصہ دراز تک اہل ملک کے دلوں میں باقی رہیگا۔ اُردو ہندی ادب میں جو پوزیشن منشی پریم چند کو حاصل تھی، وہ کسی موجودہ مصنف کو نصیب نہیں اور نہ مستقبل قریب میں ہمیں ان کا کوئی جانشین پیدا ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں میں ڈاکٹر ٹیگور کے بعد پریم چند ہی کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی موت کو اب ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے لیکن ان کے ادبی کارنامے ہندوستانی مصنفین کے لئے قیامت تک چراغ ہدایت کا کام دیتے رہیں گے۔

اُردو ہندی میں منشی پریم چند مختصر افسانہ نگاری کے بانی ہوئے ہیں، اُن سے قبل اس صنف سے ہمارا ادب بالکل ناآشنا تھا۔ اُنھوں نے نفسیات کے لطیف ترین جذبات کو مجلسی، معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کی رنگت دے کر افسانوں اور ناولوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

فنی حیثیت سے منشی پریم چند کے آرٹ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی

(۱) کردار نگاری (۲) پلاٹ (۳) طرز نگارش (۴) بیک گراؤنڈ (پس نظر) اور (۵) پیغام۔

اِس مختصر سے مضمون میں ان سب باتوں پر سرسری روشنی ڈالی جائے گی۔

کردار نگاری منشی پریم چند فطرت نگار تھے، ان کے کمال افسانہ نگاری کی اہمیت اُن کے کرداروں میں ہے اُن کے کارناموں میں سب طرح کے جیتے جاگتے کردار ہیں، کٹ پتلیاں یا مٹی کے کھلونے نہیں ہیں، بلکہ گوشت پوست کے مکمل انسان ہیں، نہ دیوتا ہیں اور نہ راکھشس، اُن میں خوبیاں اور بُرائیاں دونوں ہیں خاص خاص اوقات اور حالات میں اُن کے جذبات، خیالات اور احساسات میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں، انقلابات آتے ہیں اور عادات بنتی بدلتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔

"غبن" میں رما ایک کمزور نوجوان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، وہ حالات کے ہاتھوں بالکل کٹ پتلی بن گیا ہے، اس میں جرأت نہیں کہ ان کا مقابلہ کرسکے، رتن واقعی رتن ہے، دنیا کے مکروفریب سے بےنیاز! جالپا کا کردار فطرت انسانی کا دلکش مطالعہ ہے۔ شروع میں وہ فیشن پرست، لاپروا اور سوسائٹی میں امتیازی شان حاصل کرنا چاہتی ہے، لیکن اُس کے شوہر کا فرار اُس کے نظام زندگی کو یک لخت بدل دیتا ہے جس سے

ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ مصمم عزم کر کے شوہر کی تلاش میں نکلتی ہے اور اپنی بلند حوصلگی سے اس کو روحانی گراوٹ سے بچالیتی ہے۔ اگر جالپا کی جگہ کوئی اور کمزور دل عورت ہوتی تو رما بابو کی کشتی حیات سنگین واقعات کی چٹانوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتی۔

"بازارِ حسن" میں پدم سنگھ، وٹھل داس، سدن اور سمن قابل ذکر کردار ہیں۔ پدم سنگھ اور وٹھل داس شاہدانِ بازاری کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، لیکن دونوں کے نظریے میں اختلاف ہے۔ بھولی سمن کو بدی کی طرف لیجانے کے لئے جال پھیلاتی ہے۔ اس کی چکنی چپڑی باتیں معصوم اور مکر و فریب سے بے نیاز۔ سمن کے لئے زہر قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ اس کو ان گناہ آلود باتوں کی کتنی گراں قیمت دینا پڑتی ہے! وہ سوسائٹی کی نظروں میں گر جاتی ہے۔

"گوشۂ عافیت" میں بلراج ایک دیہاتی نوجوان کی بہترین تصویر ہے۔ غوث خاں اور قادر خاں دو متضاد اصولوں کی زندہ تصویریں ہیں، ایک کسانوں کے لئے تن من دھن قربان کر دینا چاہتا ہے، دوسرا اُن کی ذرا سی کوتاہی کو رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ پریم شنکر "ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا" کے اصول کا علمبردار ہے شردھا اور ودیا ہندوستانی عورتوں کی بہترین مثالیں ہیں۔

"پردۂ مجاز" میں چکردھر کو ایک نڈر بیدھڑک اور دلیر آدمی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ غریبوں کا سچا ہمدرد اور کسانوں و مزدوروں کا پکا خیر خواہ ہے، اور ہندو مسلم فساد کو سلجھانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے منورما سچ مچ دیوی ہے۔ اُس کا وجود کئی تاریک دلوں کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ وہ چکردھر سے محبت کرتی ہے، اپنے دل کی گہرائیوں سے، لیکن اُس کی محبت گناہ کی آلایشوں سے قطعی پاک ہے۔ اُس کی شادی ایک راجہ سے ہو جاتی ہے، وہ رانی بنتی ہے، لیکن اپنے عروج سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھاتی، بلکہ ہمیشہ غریبوں کسانوں اور دکھیوں کا ساتھ دیتی ہے۔

پلاٹ منشی پریم چند ایک زبردست داستان گو ہیں۔ اُن کے ناول دلآویز اور فنی خامیوں سے مبرا ہیں۔ اُن کا پلاٹ ہمیشہ نہایت دلکش اور چست ہوتا ہے، اُن کے ناول مجلسی، معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کا آئینہ ہیں۔ اُن کی بنیاد میں اظہارِ حقیقت کا خیال اور اصلاح کا جذبہ کارفرما رہتا ہے، در اصل اُن کے سب قصے ہماری روزمرہ زندگی کی عکسی تصویریں ہیں۔ اور اُن کو پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی ہی داستانِ حیات کے کسی واقعہ کو پڑھ رہے ہیں۔

طرزِ نگارش منشی پریم چند اُردو ہندی کے زبردست انشا پرداز تھے، اُن کا کوئی صفحہ لاپروائی سے لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ہر فقرہ فنی حیثیت سے جامع ہوتا ہے۔ اُن کی طرزِ نگارش سادہ، پاک و صاف

سلیس و دلکش ہے اُن کی تحریر عبادت آرائی کے لچھے دار اُلجھنوں سے قطعی پاک ہے۔ ان کے مکالمے بالکل قدرت کے مطابق اور ہر کردار کے حسبِ حال ہوتے ہیں۔

پس منظر | منشی پریم چند زندگی کو روحانی نقطۂ نگاہ سے نہ دیکھتے تھے، وہ ایک زبردست حقیقت نگار اور عملی فلاسفر تھے۔ انھوں نے فلسفۂ زندگی کو اپنے ناولوں میں اچھی طرح نبھایا ہے۔ انھوں نے زندگی کے تاریک پہلوؤں پر بھی بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے ناولوں کا ایک خاص موضوع افلاس و تنگدستی اور مظلوموں کی آہ و بکا ہے، وہ سچے وطن پرست تھے۔ اُن کی ہر تصنیف سے حب الوطنی کی بُو آتی ہے۔ سب سے بڑھکر وہ ایک سچے مصلح قوم تھے۔ انھوں نے ادب کے ذریعے سوسائٹی، قوم اور ملک کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیشہ غریب کسانوں اور افلاس زدہ مزدوروں اور سوسائٹی کی نظروں سے گرے ہوئے بدنصیبوں کے حق میں پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے منشی پریم چند، ڈکنز، تھیکرے، ٹالسٹائی کے ہم پلہ ہیں، بلکہ بعض مقامات پر اُن سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں "بازارِ حسن" میں انھوں نے رنڈیوں کے سُدھار کے لئے آواز بلند کی ہے۔ "پردۂ مجاز" "گوشۂ عافیت" "چوگانِ ہستی" میں کسانوں، زمینداروں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے متعلق پروپیگنڈا کیا ہے۔ گالزوردی بھی اپنے ناولوں میں اسی قسم کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔ لیکن غیر جانبدارانہ حیثیت سے منشی پریم چند جانبدار ہوکر کسانوں اور مزدوروں کے حق میں پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

پیغام | ادب کا سب سے بڑا فرض مجلسی اصلاح اور مسائل زندگی کا حل پیش کرنا ہے۔ منشی جی نے اپنے ناولوں میں نہایت خوش اسلوبی سے اس کے ہر پہلو کا تبصرہ کیا ہے۔ ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے "پردۂ مجاز" میں انھوں نے نکاح ثانی، ہندو مسلم فساد، کاشتکاروں پر کئے ہوئے ظلم اور مسئلہ تناسخ کا حل نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔

"بازارِ حسن" میں بازاری عورتوں کی اصلاح اور اُن کے متعلق ہندو مسلم نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

"گوشۂ عافیت" میں کاشتکاروں کی مشکلات، بیگار، وصولی مالیہ وغیرہ جیسے دشوار گزار مسائل حل کئے گئے ہیں۔

منشی پریم چند کا انتقال چھپن۵۶ برس کی عمر میں ہوا ہے اور گو اس وقت اُن کا آرٹ درجۂ کمال پر پہنچ چکا تھا، تاہم اگر وہ بیس۲۰ سال اور زندہ رہتے تو لازمی طور پر اُن کے نئے شاہکار نسبتاً کہیں زیادہ مؤثر و قیع اور قابلِ قدر ہوتے۔ اس وقت بہت سے ایسے مسائلِ زندگی ہیں جو بدقسمتی سے آجکل ہر ہندوستانی کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہے ہیں۔ چند سال کی بھی مہلت ملتی تو یقیناً وہ اپنے ریفارم مشن کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتے۔ مگر ناوقت موت نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پریم چند اور دیہات

از اوپیندر ناتھ اشک۔ بی اے۔ ایل ایل بی

"بھائی انسان کا بس ہو تو کہیں دیہات میں جا بسے۔ دو چار جانور پال لے اور زندگی کو دیہاتیوں کی خدمت میں گذار دے۔"
پریم چند (۹ جولائی ۱۹۳۶ء)

یہ عبارت اُس خط سے اقتباس کی گئی ہے جو منشی پریم چند نے اپنی طویل علالت کے شروع میں مجھے لکھا تھا یہ علالت آخر اُن کی جان ہی لے کر رہی۔ عمر کا بیشتر حصّہ شہروں میں بسر کرنے کے باوجود پریم چند کا دل ہمیشہ دیہات ہی میں رہا۔ اور وہ غریب دیہاتیوں کے دُکھ درد میں برابر شریک رہے۔ انکا دماغ ہمیشہ انھیں قعر مذلّت سے نکال کر بام ترقی پر پہونچانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔

پریم چند کی یاد آتے ہی میرے سامنے دیہات کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اور گو مجھے اُن کے نزدیک رہنے اور اس بات کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا کہ وہ اپنے طرز رہائش سے کس حد تک دیہاتی تھے۔ لیکن اُن کے خطوط کو پڑھ کر ان کے زندۂ جاوید ادبی کارناموں کو دیکھ کر۔ ان کا مطالعہ کر کے میں اس کے سوائے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا کہ دیہات کی روح ان کے رگ و ریشہ میں بسی ہوئی تھی وہ جانتے تھے کہ ہندوستان دیہات میں بستا ہے اور ملکی آزادی اور ترقی کا راز دیہات کی آزادی اور ترقی میں مضمر ہے۔ جب تک دیہاتی بے علمی۔ جہالت۔ کورانہ عقیدت۔ قرضہ اور دوسری بدعتوں میں جکڑے ہوئے رہیں گے ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

پریم چند نے دیہات کی زندگی کے متعلق بیسیوں کہانیاں لکھی ہیں۔ پنچ پرمیشور، بیٹی کا دھن، نمک کا داروغہ اور دوسری کہانیاں دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اسی پر آپ کے بیشتر ناولوں کی بنیاد قایم ہے یہیں وہ پیدا ہوئے پلے اور پروان چڑھے۔ اُن کے ناولوں میں چوگان ہستی، میدان عمل، گوشۂ عافیت، اور گئودان زیادہ تر دیہات کی رام کہانی ہیں۔

پریم چند کے گاؤں: "شمالی کوہستانی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے۔ سامنے گنگا دوشیزہ کی طرح ہنستی کھیلتی۔ ناچتی گاتی چلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک بوڑھا پہاڑ۔ کسی بوڑھے جوگی

کی طرح جنا بڑھائے۔ سیاہ۔ متین۔ خیال میں محو کھڑا ہے۔ یہ موضع گویا اسکی طفلی کی یاد ہے۔ خوشیوں اور دلچسپیوں سے پُر۔ یا کوئی عالم شباب کا سنہرا خواب۔ گاؤں میں مشکل سے بیس پچیس جھونپڑے ہونگے پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر دیواریں بنائی گئی ہیں۔ ان پر چھپّر ڈال دئے گئے ہیں۔ دروازوں پر ٹاٹ کی ٹٹیاں ہیں۔ انہی کابکوں میں اس گاؤں کی مخلوقات اپنے گائے بیل۔ بھیڑ اور بکریوں کو لئے خدا جانے کب سے آباد ہے"

شہری زندگی سے تنگ آئے ہوئے امر کانت کو یہ گاؤں خوبصورت لگا۔ امرت کانت کہتے بھی ہیں۔ "ایسا خوبصورت گاؤں میں نے نہیں دیکھا۔ ندی۔ پہاڑ جنگل اس کا تو سماں ہی نرالا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہیں رہ جاؤں اور کہیں جانے کا نام نہ لوں۔" امر کانت ہی کیوں کوئی بھی قدرت کا عاشق وہاں جاکر اپنی جلی ہوئی روح کو تسکین پہنچا سکتا ہے۔ ہندوستان کے دیہات قدرت کا روپ ہیں۔ قدرت کا ہی رنگ ہیں۔ جہاں پہاڑ ہے۔ ندی ہے۔ ہرے بھرے درخت ہیں کھیت ہیں۔ وہاں مٹی یا پتھر کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں کی تصویر خود بخود ذہن میں کھینچ جاتی ہے۔ شہر تو قدرت کے حسین جسم پر پھوڑے ہیں۔ اس کی خوبصورتی کے رہزن ہیں۔ اور اگر شہریوں کی شاطرانہ چالوں نے ان خوبصورت دیہات میں رہنے والوں کی زندگی کو تلخ نہ کر دیا ہوتا۔ تو وہاں جانیوالا سچ مچ ہی پھر آنے کا نام نہ لیتا۔

اپنے آخری ناول گئودان میں پریم چند نے ایک جگہ بیلاری میں پھاگن کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"پھاگن اپنی جھولی میں نئی جوانی کی دولت لیکر آپہنچا۔ آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی خوشبو بانٹ رہے تھے۔ اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی موسیقی کا گپت دان کر رہی تھی۔"

یہی خوبصورتی ہے جو پریم چند کو بار بار دیہات کی طرف کھینچتی رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوبصورتی کا نقشہ کھینچتے وقت پریم چند دیہات کی فضا میں کھو جاتے تھے۔ لیکن دیہات کی اصلی دلکشی دیہاتیوں کی فارغ البالی پر ہی منحصر ہے۔ فاقہ مست کورندوں کی خوبیوں کا تذکرہ کیا بھائے گا۔ امر کانت نے جو گاؤں دیکھا تھا۔ وہ گئودان کے بیلاری سے مختلف تھا۔ وہاں کے باشندے فاقہ مست نہیں ہیں۔ بیگار کی مزدوری کا وہاں نام نہ تھا۔ امر کانت چاہتے تھے۔ کوئی کام مل جائے تو گاؤں میں ہی ٹک جائیں۔ انکا ارادہ جاننے پر گودڑ کہتا ہے "کام کی یہاں کون کمی ہے۔ گھاس بھی کرو تو روپے روز کی مزدوری ہو جائے۔ نہیں جوتے کا کام ہے۔ تلیاں بناؤ۔ چرسے بناؤ۔ محنت کرنیوالا بھوکا نہیں مرتا۔ دھیلی کی مزدوری کہیں گئی نہیں۔"

لیکن بیلا رہی ہیں مزدوری ایسے آرام سے نہیں ملتی۔

دھنیا کہتی ہے۔ یہ کب تک پیال میں گھس کر رات کاٹیں گے۔ اور پیال میں گھس بھی لیں تو پیال کھا کر تو گذارہ نہ ہوگا۔ تمہاری خواہش ہو تو گھاس کھاؤ۔ لیکن گھاس کھا کر تو رہا نہ جائے گا"۔

ہوری کہتا ہے۔ "مزدوری تو ملے گی۔ مزدوری کر کے کھائیں گے"۔

دھنیا پوچھتی ہے۔ "کہاں ہے اس گاؤں میں مزدوری"؟

رائے صاحب وہاں مزدوری لیتے ہیں لیکن ایک آنہ روز دیتے ہیں۔ داتا دین سینت مینت (مفت) میں، میں یا تین آنے یومیہ پر مزدوری لیتے ہیں لیکن ایسی کڑی کہ کوئی مزدور ان کے ہاں ٹکتا نہیں اور ایک ٹھیکیدار بھی مزدوری لیتے ہیں۔ لیکن ایسی مزدوری جو ہوری کی جان ہی لے لیتی ہے۔

ایسے گاؤں کا نقشہ پریم چند کس طرح اپنے قلم کی جولانی سے خوبصورت بنا سکتے تھے۔ اور اسی لئے جب گوبر شہر کو لوٹتا ہے۔ تو وہی گاؤں جو فارغ البالی کی حالت میں دل کو راحت اور آنکھوں کو سرور بخشتا۔ اب اُجڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میدان عمل کے گاؤں کے بعد اب ذرا "گئو دان" کے اس گاؤں کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

"گوبر نے گھر پہنچ کر اُس کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت وہاں سے لوٹ جائے گھر کا ایک حصہ تو تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گرا۔ ابھی گرا۔ دروازے پر ایک بیل بندھا ہوا تھا وہ بھی نیم جان"۔

اور یہ حالت صرف ہوری کی ہی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر ہی یہی مصیبت نازل تھی۔ ایسا ایک بھی آدمی نہ تھا جس کی روتی صورت نہ ہو۔ گویا ان کی روح پر غم کا سکہ بیٹھا ہوا انہیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے۔ دروازوں پر منوں کوڑا جمع ہے۔ بدبو اُڑ رہی ہے۔ لیکن ان کی ناک میں نہ سونگھنے کی حس باقی ہے نہ آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت۔ سرِ شام ہی سے دروازوں پر گیدڑ رونے لگتے ہیں۔ لیکن اُنہیں کوئی غم نہیں"۔ (گئو دان صفحہ ۵۹۸)

کہاں ہے وہ خوبصورتی اور وہ دلکشی۔ جو شہر سے آنے والے کو موہ لے۔ میری ہریالی سے آنکھوں کی پیاس بجھاؤ۔ میری آزاد اور پاکیزہ فضا میں سانس لو۔ پریم چند حقیقت نگار تھے۔ اور اپنے ناولوں میں اُنھوں نے جہاں جہاں دیہات کا نقشہ کھینچا ہے دیہاتیوں کی زندگی کو بھی نہیں بھولے ہیں۔

دیہات کے موسم | پریم چند جس چیز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں کوئی گاؤں نہ دیکھا ہو۔ آپ کو کبھی دیہات کی سردیوں سے پالا نہ پڑا ہو آپ

نہ جانتے ہوں مفلس اور قلاش کسان موسم سرما کیسے گذارتے ہیں تو پریم چند کے جادو نگار قلم سے کھینچی ہوئی تصویر دیکھیئے۔ آپ سب کچھ جان جائیں گے۔ اور آپکے سامنے گاؤں کی سردی اور اس میں ٹھٹھرتے ہوئے کسان کی تصویر کھنچ جائے گی۔

"ماگھ کے دن تھے۔ مہاوٹ لگی ہوئی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک تو سردیوں کی رات اس پر ماگھ کی بارش۔ موت کا سا سناٹا تھا۔ اندھیرا تک نہ سوجھتا تھا۔ ہوری کھانا کھا کر منیا کے کھیت کی مینڈھ پر لیٹا ہوا تھا۔ چاہتا تھا سردی کو بھول جائے اور سو رہے۔ لیکن تار تار کمبل اور پھٹی ہوئی مرزئی اور سرد نمناک ہوا کے جھونکوں سے گیلی پیال۔ نیند اتنے دشمنوں کے سامنے آنے کا حوصلہ کیسے کر سکتی۔ آج تمباکو بھی نہ ملا تھا نہیں تو اس سے ہی من بہلاتا۔ اُپلا سلگا لایا تھا۔ لیکن سردی میں وہ بھی بجھ گیا۔ پھٹے ہوئے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر۔ اور کمبل سے منہ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے خود کو گرم رکھنے کی سعی لاحاصل میں مصروف تھا۔ لیکن کمبل کیا کرے۔ وہ بوڑھا کمبل اس کا ساتھی تو ہے۔ لیکن اب وہ کھانا چبانے والا دانت نہیں دُکھنے والا دانت ہے۔" (گئودان ۴ ۱۹ صفحہ)

کتنی دردناک تصویر ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں اگر بارش نہ ہو تو کیا حالت ہو جاتی ہے۔ ذرا اس کا حال بھی پڑھیئے

"ساون کا مہینہ آگیا تھا اور بگولے اٹھ رہے تھے۔ کنوؤں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا۔ اوکھ تپش سے جلی جاتی تھی۔ نہر سے تھوڑا تھوڑا پانی ملتا تھا۔ لیکن آئے دن اس کے پیچھے لاٹھیاں چلتی تھیں۔ یہاں تک کہ ندی نے بھی جواب دے دیا تھا۔ جگہ جگہ چوریاں ہونے لگیں۔ ڈاکے پڑنے لگے۔ سارے صوبہ میں واویلا مچ گیا۔"

اور اگر اس حالت میں بارش ہو جائے تو دہقانوں کے دل کے سوکھے کنول کس طرح ہرے ہو جاتے ہیں۔ کس طرح ان کے نیم مُردہ دلوں میں جان آجاتی ہے۔ اسکا خاکہ پریم چند نے اس طرح کھینچا ہے۔

"بارے خدا بارش ہوئی۔ کسانوں کے دل ہرے ہو گئے۔ کتنی خوشی۔ کتنی مسرت تھی اس دن مسرت کا جام گویا چھلکا پڑتا تھا۔ زمین کی جیسے پیاس ہی نہ بجھتی تھی۔ پیاسے کسان اس طرح اچھل رہے تھے جیسے بوندیں نہیں اشرفیاں برس رہی ہوں۔ بٹور لو جتنا بٹور سکو۔ کھیتوں میں جہاں بگولے چلتے تھے وہاں ہل چلنے لگے۔ لڑکے لڑکیاں نکل کر تالابوں پوکھروں اور چھپڑوں کا معائنہ کرنے لگے۔ "اوہو تالاب تو آدھا بھر گیا"۔ اور وہاں سے چھپڑ کی طرف بھاگے"۔ (گئودان صفحہ ۱۵۱)

کتنی زندہ تصویر ہے۔ برسات کے بعد کی حالت بھی دیکھیئے۔

"برسات کے دن تھے۔ کسانوں کو مکئی اور باجرے کی رکھوالی سے دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ جدھر دیکھو ہا۔ ہُو۔ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کوئی ڈھول بجاتا تھا۔ کوئی ٹین کے پیپے پیٹتا تھا۔ دن کو طوطوں

کے جھنڈ کے جھنڈ ٹوٹتے تھے۔ رات کو گیدڑوں کے غول۔ اس پر دھان کی کیاریوں میں پودے بٹھلانے پڑتے تھے۔ پہر رات سے کھیتوں میں جاتے تھے اور پہر رات گئے آتے تھے۔ کسی کا گھر گرتا تھا۔ کسی کے کھیت کی مینڈھیں کاٹی جاتی تھیں۔ کشمکش حیات کی دہائی مچی ہوئی تھی۔
(گوشۂ عافیت)

برسات کے خاتمہ کی ایک اور تصویر ملاحظہ ہو:۔

"برسات ختم ہو چکی تھی۔ سڑکوں میں جدھر نکل جائیے۔ سڑے ہوئے سن کی بدبو اڑتی تھی کبھی جیٹھ کو لجانے والی دھوپ ہوتی تھی۔ اور کبھی ساون کو شرمانے والے بادل گھر آتے تھے۔ مچھر اور ملیریا کا زور تھا۔ نیم کی چھال اور گلو کی چڑھ بنی ہوئی تھی۔ چراگاہ میں دور تک ہری ہری گھاس لہرا رہی تھی۔ ابھی کسی کو اس کے کاٹنے کی فرصت نہ تھی۔" (گوشۂ عافیت)

پریم چند کی نگاہ کتنی باریک بیں ہے اُن کے قلم میں کیا کمال حاصل ہے۔

یہاتی اور انکی زبوں حالی | پریم چند کے دیہاتی دیہات کے بھولے بھالے مفلس و قلاش۔ قرض کے بوجھ سے بے ہوئے رسم و رواج کے پابند۔ دھرم اور دین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔ آن کی خاطر مٹنے والے بے بس اور مظلوم دیہاتی ہیں۔ وہ گناہ کرتے ہیں لیکن اُنکا گناہ بھی مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ اور وہ گناہ ی تلخیوں سے پاک ہے۔ بلکہ اسمیں اُنکی سادہ لوحی ٹپکتی ہے۔ اسلئے ان کے گناہ دیکھ کر غصّہ کے بجائے رحم آتا ہے۔

منوہر غوث خاں کو قتل کر دیتا ہے۔ لیکن کیا وہ گناہ گار ہے؟ کیا اس قتل کی وجہ سے آپکے دل میں نس کے لئے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ وہ کمزور۔ غریب اور قلاش دیہاتی ہے۔ رات کو اسے ٹھیک طرح موجھائی بھی نہیں دیتا۔ ساٹھ سال کی عمر ہے۔ پھر کیا وجہ کہ جس کام کو اس کا نوجوان لڑکا مضبوط ور طاقتور ہوتے ہوئے بھی کرنے سے جھجکتا ہے۔ وہ بوڑھا اور کمزور ہو کر بھی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ہ اسی کی زبان سے سنئے۔ رات کے وقت جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہے اور سب لوگ سوئے ہیں۔ منوہر اپنے لڑکے بلراج کو جگا کر کہتا ہے:۔

"اچھا تو اب رام کا نام لے کر تیار ہو جاؤ۔ اپنی عزت اور ناموس کی حفاظت کرنا مردوں کا کام ہے ایسے مظالم کا ہم اور کیا جواب دے سکتے ہیں۔ بے عزت ہو کر جینے سے مرنا اچھا۔" (گوشۂ عافیت)

اور پھر یہی منوہر جب دیکھتا ہے کہ اس کام کے لئے جس کا وہ تنہا ذمہ دار ہے۔ سارے کا سارا گاؤں بندھا جا رہا ہے۔ تو وہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کی رسّی کاٹ دیتا ہے۔ کیا اس کا یہ اقدام اس کے کردار کو ہماری نظروں میں بلند نہیں کرتا۔ اور کون جانتا ہے آئے دن دیہات میں جو قتل و غارتگری ہوتی

ہے۔ ڈاکے پڑتے ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ان کی تہ میں کون سے مظالم کام کرتے ہیں۔

گئو دان میں ہوری لڑکی کو بیچنے کا گناہ کرتا ہے۔ دین دھرم اور مرجاد (خاندانی ناموس) کا پابند ہوری روپا جیسی کمسن نازنین کو رام سیوک جیسے ادھیڑ شخص سے بیاہ دینے کو تیار ہوجاتا ہے۔ اسلئے کہ

"زندگی کی تگ و دو میں اسے ہمیشہ شکست ہوئی۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ ہر شکست جیسے اُسے قسمت سے مقابلہ کرنے کی طاقت دے دیتی تھی۔ لیکن اب تو وہ اس آخری حالت کو پہنچ گیا تھا۔ جب اسمیں خود اعتمادی بھی نہ رہی تھی۔ کہ وہ اپنے ایمان پر مستحکم رہ سکے" (گئو دان صفحہ ۵۹۸)

ایک دوسری جگہ پریم چند دیہاتیوں کے تنزل کی دردناک تصویر کھینچتے ہیں:۔

"ایسا ایک بھی آدمی نہیں جس کی رونی صورت نہ ہو۔ چلتے پھرتے تھے۔ کام کرتے تھے۔ پستے تھے۔ گھُٹتے تھے۔ اسی لئے کہ پسنا اور گھُٹنا ان کی تقدیر میں لکھا ہے۔ زندگی میں کوئی اُمید ہے نہ کوئی اُمنگ جیسے ان کی زندگی کے چشمے سوکھ گئے ہوں۔ اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو"

"جیٹھ کے دن ہیں۔ ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ لیکن کسی کے چہرے پر خوشی نہیں بہت کچھ تو کھلیانوں ہی میں تُل کر مہاجنوں کے کارندوں کی بھینٹ ہوچکا ہے۔ اور جو کچھ بچا ہے وہ بھی دوسروں ہی کا ہے۔ مستقبل کی تاریکی اُن کے سامنے ہے۔ اسمیں انہیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ ان کے ہوش گم ہوچکے ہیں۔ سامنے جو کچھ موٹا جھوٹا آجاتا ہے نگل جاتے ہیں۔ اسی طرح جیسے انجن کوئلہ نگل جاتا ہے۔ ان کے بیل چونی چوکر کے بغیر ناند میں منہ نہیں ڈالتے۔ لیکن انہیں تو صرف پیٹ میں کچھ ڈالنے کو چاہیئے۔ مزے سے انہیں کوئی مطلب نہیں ان کی زبان کا رس ہی مرچکا ہے"

اسلئے۔

"چاہے اُن سے دھیلے دھیلے کے لئے بے ایمانی کروالو۔ مٹھی بھر اناج کے لئے لاٹھیاں چلوالو گراوٹ کی یہ انتہا ہے۔ جب آدمی شرم اور عزت کو بھول جاتا ہے" (گئو دان صفحہ ۵۹۸)

اس اندوہناک حالت میں۔ اُن پریشان حال دیہاتیوں پر جنکی بدحالی کا باعث شہر اور شہروں کی فیشن پرستی ہے۔ کیا نفرت کی بجائے رحم نہیں آتا۔ کیا ان سے ہمدردی نہیں پیدا ہوتی۔ اس حالت میں وہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کر دیں تو قابل معافی ہیں۔ سزا کے مستوجب وہ نہیں بلکہ وہ ہیں جو اُنھیں اپنی اور دوسروں کی ہستی کو بھول جانے کیلئے مجبور کرتے ہیں اور یہ بھی یہ بھول جانے کے لئے مجبور کرتے ہیں کہ وہ حیوان نہیں انسان ہیں۔ اور ان کے پہلو میں دل اور سر میں دماغ موجود ہے۔

دیہات کی جونکیں! دیہات کی اس نیم جاں لاش کو جو جونکیں چمٹی ہوئی اور اس کے خون کا آخری قطرہ

تک چوس جانا چاہتی ہیں پریم چند نے اُن کو بھی فراموش نہیں کیا۔ گئو دان کے "پنڈت داتا دین۔ جھنگری شاہ۔ منگرو شاہ۔ پٹواری پتیشوری اور کارندہ نوکھے رام۔ اور گوشۂ عافیت کے غوث خاں فیض اللہ۔ بشیشر شاہ۔ تھانیدار دیا شنکر وغیرہ انہی جونکوں کی مختلف اقسام ہیں۔ دیہاتیوں کے جسم میں خون کا نام تک نہیں رہا۔ بے جان سے ہو گئے ہیں۔ اس بات سے اُنھیں کوئی غرض نہیں۔ وہ تو جب تک خون کا قطرہ ہے۔ ان کے جسم سے چمٹے رہیں گے دیا دھرم۔ رحم و ہمدردی کا اُنکے ہاں نام نہیں

ہوری کی گائے کو اس کا سگا بھائی زہر دے کر خود روپوش ہو گیا ہے۔ پولیس خانہ تلاشی کرنا چاہتی ہے۔ ہوری مرجاد کا پابند ہے۔ وہ نہیں چاہتا اس کے بھائی کے گھر تلاشی ہو۔ وہ اس کا دشمن ہی سہی اس کی برسوں سے سینچی ہوئی آرزوؤں کو تباہ کرنے والا ہی سہی اس کی گائے کو زہر دینے والا ہی سہی لیکن بھائی تو اسی کا ہے۔ کیا اس کی تلاشی سے اس کے کل کو بٹّا نہ لگیگا۔ بھائی کی عزت کیا اس کی عزت نہیں؟

پٹواری پتیشوری ہوری کی ایسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ ہوری کے گھر کھانے کو اناج نہیں۔ اس کی فاقوں پر بسر ہوتی ہے۔ اس سے اُنھیں کیا وہ اس موقع سے اگر ہاتھ نہ رنگیں تو کیا کریں۔ تھانے دار سے کہتے ہیں۔ حضور تلاشی کی کیا ضرورت ہے اس کا بھائی آپکی خدمت کو حاضر

دونوں آدمی ذرا الگ جا کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

"کیسا آدمی ہے"

"بہت غریب حضور روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں؟

"سچ"

"ہاں حضور ایمان سے کہتا ہوں"۔

"ارے تو کیا ایک پچاسے کا بھی ڈول نہیں"۔

"کہاں کی بات حضور۔ دس بھی مل جائیں تو ہزار سمجھئے۔ پچاس تو پچاس جنم میں بھی ممکن نہیں۔ اور وہ بھی جب کوئی مہاجن کھڑا ہو جائے گا"۔

"داروغہ ذرا خدا ترس تھے۔ ایک منٹ تک سوچ کر بولے۔ تو پھر اسے ستانے سے کیا فائدہ میں ایسوں کو نہیں ستاتا۔ جو آپ ہی مر رہے ہوں"۔

پتیشوری نے دیکھا نشانہ اور آگے جا پڑا۔ بولے "نہیں حضور ایسا نہ کیجئے۔ نہیں پھر ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے پاس دوسری کونسی کھیتی ہے"۔

"تم علاقے کے پٹواری ہو جی کیسی باتیں کرتے ہو؟

"جب ایسا ہی کوئی موقع آجاتا ہے۔ تو حضور آپ کی بدولت ہم بھی کچھ پا جاتے ہیں۔ نہیں تو پٹواری کو کون پوچھتا ہے؟

"اچھا جاؤ تیس روپے دلوا دو بیس ہمارے دس تمہارے"

"چار مکھیا ہیں اس کا تو خیال کیجئے"

"اچھا آدھے آدھ پر رکھو۔ لیکن کرو جلدی مجھے دیر ہو رہی ہے"۔

"پٹیشوری نے جھنگری سے کہا۔ جھنگری نے ہوری کو اشارے سے بلوایا۔ اپنے گھر لے گئے۔ تیس روپے گن کر اس کے حوالے کئے اور احسان سے دبلتے ہوئے بولے۔" آج ہی کاغذ لکھ دینا تمہارا منہ دیکھکر روپے دے رہا ہوں۔ تمہاری شرافت کی وجہ سے"۔

(گئو دان صفحہ ۱۸۵)

اسے کہتے ہیں دوسرے کے گھر کو آگ لگا کر ہاتھ سینکنا۔ موت پر۔ غمی پر۔ نفع پر۔ نقصان پر۔ لڑائی پر۔ جھگڑے پر کوئی بھی موقع کیوں نہ ہو یہ دیہاتی جونکیں اُنکا خون چوستی ہی رہیں گی۔ اُنھیں کسی کے جذبات سے غرض نہیں۔ کسی کی زبوں حالی سے مطلب نہیں۔ اِس ظلم کے خلاف ذرا دھنیا کی چیخ و پکار بھی سنیے۔ جب ہوری روپے لئے جا رہا تھا تو اس نے بھانپ لیا۔ جھٹکا دیا۔ گانٹھ ہلکی تھی کھل گئی۔ جل کر بولی۔

"جس کے روپے ہیں اس کے جاکر دیدو۔ ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دونگی چاہے مجھے حاکم کے اجلاس تک چڑھنا پڑے۔ ہم لگان کی باقی چکانے کیلئے ۲۵ روپے مانگتے تھے تو کسی نے دئیے نہیں۔ آج مٹھی بھر روپے نکال کر ٹھنا ٹھن دے دئے میں سب جانتی ہوں یہاں تو بانٹ بخرہ ہونے والا ہے۔ سبھی کے منہ میٹھے ہوتے ہیں یہ ہتھیارے گاؤں کے مکھیا ہیں کہ غریبوں کا خون چوسنے والے۔ سود بیاج ڈیڑھی سوائی نذر نذرانہ۔ رشوت وشوت۔ جیسے بھی ہو غریبوں کو لوٹو"۔ (گئو دان صفحہ ۱۸۸)

اور ایسے ہی بیسیوں واقعات ہیں جن میں یہ لوگ پہلے اُنہیں پھنسا دیتے ہیں اور پھر اُنکو بے بسی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تیس کے سود ملا کر تین سو پانچ ہو جاتے ہیں اور دیہاتی ساری عمر اُن کی غلامی کرتے کرتے مر جاتا ہے۔ خدا جانے دیہات کی اِن جونکوں کا کب خاتمہ ہوگا؟

آدرش گاؤں، چوگان ہستی اور گئو دان میں پریم چند نے دیہاتوں کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے

صنعت و حرفت کی ترقی کے دور اور کارخانوں کے زمانہ میں جب ہندوستان میں بھی مشینوں کا شور و شغب سنائی دینے لگا ہے۔ پریم چند شہروں کے نواحی دیہات کی تباہی اور بربادی کا منظر دیکھتے ہیں۔ پانڈے پور بھی بنارس کے نواح میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہی سمجھئے۔ اس کی بربادی کا حال پڑھ کر مشہور انگریزی نظم (Deserted Village.) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

گئو دان میں دیہات کی جس تباہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسکی وجہ ہمارے موجودہ سسٹم کی خرابیاں زمینداروں اور ان کے کارندوں کے مظالم اور ساہوکاروں کی خون چوسنے والی سرگرمیاں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پریم چند کو ہمیشہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے آدرش گاؤں کے خواب بھی دیکھے ہیں جن کی تعبیر آپ کو گوشۂ عافیت کے لکھن پور میں نظر آئے گی۔

مایا شنکر کی اس تقریر نے جو اُس نے اپنے تعلقہ دار ہونے پر کی اِس آدرش کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پریم شنکر کے آشرم میں پلا ہوا نوجوان دیکھئے کیا آدرش پیش کرتا ہے۔

"میرا یقین ہے کہ مجھے کسانوں کی گردنوں پر اپنا جوا رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ میں آپ سب کے سامنے ان حقوق سے دستبردار ہوتا ہوں جو پُرانے اصولوں۔ رسم و رواج اور سوسائٹی نے مجھے دئے ہیں۔ میں اپنی رعایا کو اپنے حقوق کی ان زنجیروں سے آزاد کرتا ہوں۔ وہ نہ میرے آسامی ہیں نہ میں اُن کا تعلقدار۔ وہ سب میرے دوست ہیں۔ میرے بھائی ہیں۔ بس اُن کا کام ہر مہینے جاکر مختار کو اپنا لگان دے دینا ہے۔"

"اور مجھے اُمید ہے کہ میرے بھائی آپس میں محبّت سے رہیں گے اور بات بات میں عدالتوں کی طرف نہ دوڑیں گے۔"

اسی اعلان کے نتیجے کے طور پر ہم گوشۂ عافیت کے۔ آخری صفحات میں آزاد اور فارغ البال لکھن پور کی تصویر دیکھتے ہیں۔

"مایا شنکر اپنے دورے پر ہیں۔ اسی سلسلہ میں لکھن پور بھی آئے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہی لکھن پور جو تباہی اور بربادی کا مسکن تھا اب بہار آفریں اور بہشت زار بن گیا ہو وہاں خوب رونق اور صفائی ہے۔ سبھی گھروں کے دروازوں پر سائبان لگے ہوئے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے تخت بچھے ہیں۔ اکثر گھروں میں سفیدی ہو گئی ہے۔ پھوس کے جھونپڑے مفقود ہیں۔ اب سبھی گھروں پر کھپریل ہیں۔ دروازوں پر بیلوں کے لئے پکی چرنیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک دو کے دروازوں پر گھوڑے بندھے نظر آتے ہیں۔ پُرانے چوپال میں

اسکول ہے۔ اور اس کے سامنے ایک پکّا کنواں اور دھرم شالہ ہے۔ انہیں دیکھتے ہی سب اپنے کام چھوڑکر دوڑے۔ مایاشنکر سکھو چودھری کے مندر پر رُکتے ہیں۔ وہاں اسوقت بڑی بہار ہے۔ مندر کے سامنے سکھّو چودھری بیٹھے ہوئے رامائن پڑھ رہے ہیں۔ اور عورتیں بیٹھی ہوئی سُن رہی ہیں۔ مایاشنکر گھوڑے سے اُتر کر چبوترے پر جا بیٹھتے ہیں۔ اور گاؤں کے آدمی اُنہیں گھیر لیتے ہیں۔"

یہ سب کایا پلٹ صرف دو سال میں ہوئی ہے۔ اب دیہاتیوں کی حالت سنئے۔ قادر میاں جنہیں مایاشنکر چاچا کہکر پکارتے ہیں۔ اُنہیں اپنی حالت بتاتے ہیں۔

" بٹیا اور کیا دعا دیں۔ روم روم سے تو دعائیں نکل رہی ہیں۔ مجھ کو ہی دیکھو پہلے بیس بیگھے کا کاشتکار تھا سو روپے لگان دینا پڑتا تھا۔ دس بیس روپے سالانہ نذرانہ میں نکل جاتے تھے۔ اب کُل بیس لگان ہے۔ اور نذرانہ لگتا نہیں۔ پہلے اناج کھلیان سے گھر تک نہ آتا تھا۔ آپ کے چپراسی کارندے وہیں گلا دبا کر تُلوا لیتے تھے۔ اب اناج گھر میں بھرتے ہیں اور سہولت سے فروخت کرتے ہیں۔ دو سال میں کچھ نہیں تو تین چار سو روپے بچالئے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو کی ایک جوڑی بیل لایا گھر کی مرمّت کرائی۔ سائبان ڈالا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب کسی کی دھونس نہیں۔ مالگذاری داخل کر کے چپکے سے گھر آجاتے ہیں نہیں تو ہر وقت جان سولی پر چڑھی رہتی تھی۔ اب اللہ کی عبادت میں بھی جی لگتا ہے نماز بھی بوجھ معلوم نہیں ہوتی۔" (گوشۂ عافیت)

اور یہی حال درکھن بھگت۔ سکھّو چودھری و بلراج وغیرہ کا ہے۔ بلراج کے پاس تو ایک گھوڑا بھی ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا وہ ممبر ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کوئی اخبار کا نام بھی نہ جانتا تھا وہاں اب چھوٹی سی لائبریری بھی ہے۔ اچھے اچھے اخبار آتے ہیں۔ اخلاق بھی گاؤں والوں کا سُدھر گیا ہے اور بلراج کے قول کے مطابق۔ گاؤں میں اب رام راج ہے"

یہ ہے دیہاتیوں کی حیثیت جس کے وہ خواب دیکھتے تھے۔

پریم چند کا کُنجِ عافیت | آخیر میں اس کُنجِ عافیت کی تصویر بھی دیکھئے جس میں مرحوم جا کر بسنا چاہتے تھے۔ ان کے ناول گوشۂ عافیت میں آپکو اس کا بھی خاکہ دکھائی دیگا۔ اپنے اسی خط میں جس کا اقتباس میں نے مضمون کے شروع میں دیا ہے۔ منشی پریم چند نے لکھا تھا۔ "شہروں میں اور خاص کر بڑے شہروں میں تو صحت زندگی سب تباہ ہو جاتے ہیں" قدرتی طور پر ان کا میلان دیہات کی طرف

تھا۔ سکون کا متلاشی اُن کا دِل وہاں اُڑ کر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور یہ خواہش اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہی نہ تھی جیسا کہ شائد کچھ اصحاب بستر مرگ سے لکھے ہوئے ان کے ان الفاظ کو پڑھکر سمجھیں بلکہ جب اُنہوں نے گوشۂ عافیت لکھا تب بھی اُن کے دل کے کسی کونے میں یہ خواہش موجود تھی۔

دیہات کی۔ جیسا کہ میں نے بتایا۔ پریم چند نے دو تصاویر کھینچی ہیں۔ ایک حقیقی ہے دوسری آدرش۔ حقیقی تصویر گئو دان میں موجود ہے اور آدرش گوشۂ عافیت میں۔ دیہات کی اُسی آدرش تصویر میں اُنہوں نے اپنے لئے ایک کٹیا بھی بنا لی تھی۔ ورنا ندی کے کنارے۔ شہر اور اسکی چل پول سے دُور حاجی پور میں یہ کٹیا بنی ہوئی ہے۔ ذرا اس کے بیرونی ماحول کی دلفریبی دیکھئے۔

"پوس کا مہینہ ہے۔ کھیتوں میں چاروں طرف ہریالی چھائی ہوئی ہے۔ سرسوں۔ مٹر۔ کُسم۔ السی کے نیلے پیلے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ کہیں شوخ طوطوں کے جھنڈ ہیں۔ کہیں اُچکتے کوؤں کے غول۔ جگہ جگہ سارسوں کے جوڑ اہنسا (عدم تشدد) کی تصویر بنے اپنے خیال میں محو ہیں۔ دیہات کی حسین نازنین سروں پر گھڑے رکھے ندی سے پانی لا رہی ہیں۔ کوئی کھیت میں تھوئے کا ساگ توڑ رہی ہے۔ کوئی بیلوں کے لئے ہریالی کا گٹھا سر پر رکھے آ رہی ہے۔ پُر سکون۔ سادی زندگی کی پاکیزہ تصویر ہے۔ شہری چل پول۔ شور و شغب۔ دوڑ دھوپ کے سامنے یہ سکون۔ یہ شانتی بیحد مسرت زا اور دل کو ٹھنڈک پہنچانیوالی محسوس ہوتی ہے"

(گوشۂ عافیت)

اور دیہات کی ایسی ہی پُر سکون فضا میں ندی کے کنارے مرحوم پریم چند اپنی کٹیا بنانا چاہتے تھے۔ اپنے آخری خط میں بھی اُنہوں نے اسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ہم جو سوچتے ہیں۔ وہ کب ہوتا ہے؟ اور جو ہوتا ہے اُسے ہم کب چاہتے ہیں۔ اُن کا یہ آدرش بھی آدرش ہی رہا اور عملی جامہ نہ پہن سکا!

انسان کا دل

انسان کا دل ایک رازِ سربستہ ہے۔ کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے۔ کبھی صدہا بے گناہوں کے خون پر اُف تک نہیں کرتا اور کبھی بچے کو دیکھ کر رو دیتا ہے۔

جلوۂ ایثار — پریم چند

مِل مزدور فلم کیسے بنی؟

(سربجت للت کمار کا لکھا ہوا)

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ منشی پریم چند فلم کی دنیا میں ناکامیاب رہے۔ مگر جب تک پروڈیوسر سینیریو بناتے وقت افسانہ کی نزاکت اور افسانہ نویس کے دلی خیالات نہ سمجھ لے اُس کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ سرت چندر کو سمجھنے کے لئے برُوا جیسے ڈائرکٹر کی ضرورت ہے تبھی "دیوداس" ایک کامیاب فلم بن سکا۔ اس لئے جب تک پریم چند کی کہانیوں کو پسند کرنے والے ٹیکنیشین اور پروڈیوسر پیدا نہیں ہو جاتے فلمی دنیا میں اُن کے قصوں کا سراونچا نہیں ہو سکتا۔ جب پریم چند جی کا "سیوا سدن" بازارِ حسن بنا دیا گیا، اور یہ فلم پہلے پہل بمبئی کی امپیریل سینما ہاؤس میں چلائی گئی تو میں موجود تھا۔ بڑی اُمید ی ہوئی۔ پریم چند جی سے ملاقات ہونے پر میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ اُنھوں نے کہا "بھائی مجھ سے کتاب کا کاپی رائٹ مانگا گیا میں نے اُسے دے دیا۔ اب اگر فلم بنانے والے اُسے اچھی طرح کامیاب نہ بنا سکیں تو میرا کیا قصور؟ بات درست تھی۔ سُدرشن جی کے "دھوپ چھاؤں" کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی تھی۔

اپریل ۱۹۳۴ء میں پریم چند جی کو بمبئی کی اجنٹا سینے ٹون" نے بڑے چاؤ سے بلایا اور ایک برس کے لئے معاہدہ ہوا۔ شاید نو ہزار میں معاملہ طے ہوا تھا، آخر مئی کو میں بھی وہاں پہونچا اور اُن کی کرپا سے کمپنی کے ایکٹروں میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس لئے ہر روز اُن سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔

اُس وقت وہ اپنی پہلی کہانی "مِل مزدور" ختم کرنے میں مصروف تھے اور زیادہ تر اجنٹا ہی کے لئے لکھتے تھے۔ کہانی ختم ہوتے ہی اُنھیں اُس کا اُردو ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ کیونکہ کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر فلم ڈائرکٹر مسٹر بھوٹانی اور اُن کے ساتھی مسٹر خلیل آفتاب بی۔ اے ہندی نہ جانتے تھے۔ پھر سینریوں کی آسانی اور بھوٹانی صاحب کی رائے کے مطابق کہانی میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کچھ نئی باتیں جوڑیں اور کچھ ہٹائی گئیں۔ جو شکل پہلے تجویز کی گئی تھی، اُس کے تمام حصّے الگ کر دیئے گئے اور قصّہ کو نئی شکل دی گئی۔ اس سے پلاٹ میں صرف تبدیلی ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا لُطف بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی، تصویر تیار کی جانے لگی اور کئی جگہ پھر تبدیلیاں ہوئیں۔ خیر دن رات محنت کر کے تقریباً تین ساڑھے تین مہینے میں تصویر تیار ہوئی۔ اندازاً ساٹھ ستر ہزار روپے اس میں لگے ہونگے۔ اس فلم سے کمپنی کو بڑی بڑی امیدیں

تھیں، کیونکہ تمام تبدیلیوں کے باوجود بھی کہانی کے اصل مطلب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور اس میں ایک ایسے عام مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی جسمیں دولتمندوں یعنی مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش نمایاں تھی۔ پریم چند کی اس پرجوش تصنیف نے اس مسئلہ پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ مالکوں کا ظالمانہ رویہ اُن کی سختی، مالکوں کا من مانا برتاؤ مزدوروں کی خراب حالت، اُن کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت اور اُس کا نتیجہ۔ یہ سب باتیں بڑی صفائی اور قابلیت سے دکھائی گئی ہیں۔ ابھی تک ہندی میں اس موضوع پر کوئی فلم نہیں بنی تھی، اس کی زبان کے بارے میں لکھنا ہی فضول ہے کیونکہ اسکے لکھنے والے پریم چندجی تھے۔

اس فلم میں منشی پریم چند نے خود بھی پارٹ کیا ہے۔ کھیل کے ختم ہونے کے پہلے ایک نظارہ آتا ہے جس میں مزدوروں اور مل مالکوں کا جھگڑا نپٹانے کے لئے پنچایت بیٹھتی ہے۔ اس کے چودھری پریم چندجی ہی ہیں۔ دراصل "اجنٹا" کا منتخب اسٹاف ہی اس میں شامل کیا گیا تھا۔ پوری تیاری کے بعد جب اس کا پرائیویٹ مظاہرہ ہوا تو ہم لوگوں کو اُمید ہوگئی کہ یہ تماشہ ملک میں نہایت مقبول ہوگا۔ کانگریس کے اجلاس پر اس کی افتتاحی رسم کسی لیڈر سے ادا کرانیکا خیال تھا، لیکن افسوس سنسر کی قاتل قینچی نے ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک تو اتنی دیر ہوگئی کہ موقعہ ہی نکل گیا دوسرے اس بیرحمی سے کاٹ چھانٹ کی گئی کہ فلم کی دھجّیاں اُڑگئیں، کتنے ہی مؤثر نظارے کاٹ دیئے گئے۔ کتنے ہی اتنے مختصر کردیئے گئے کہ اُن کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔ غرض فلم کا چہرہ ہی خراب ہوگیا

اِسطرح سنسر کے بعد فلم بالکل برباد ہوگئی، آہ، بیچاری کمپنی کو نئے سرے سے دردسر مول لینا پڑا۔ کتنی ہی تصویریں دوبارہ لینی پڑیں۔ مگر سنسر کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے نام بدلنے پر بھی مجبور کیا اور "مل مزدور" کے بجائے "سیٹھ کی بیٹی" نام تجویز کیا۔ پھر حکم ہوا کہ اُن مقامات پر جہاں کارخانے نہ ہوں اس کو ریلز کیا جائے۔ چنانچہ شاید پہلے صوبۂ پنجاب کی طرف یہ بدقسمت فلم ریلز ہوئی۔ لیکن چند ہی مقامات پر چلنے کے بعد پھر قینچی چلی، اور چیر پھاڑ ہوئی، کچھ اور بھی جاندار رگیں نکال ڈالی گئیں۔ کئی حصوں کے خاص خاص حصوں کو گھٹا دیا گیا۔ کہیں کہیں اصلی ہڈی نکال کر کاٹھ کی نقلی ہڈی لگادی گئی۔ اب جو چیز سامنے ہے لوگ دیکھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں

اب ناظرین ہی فیصلہ کریں کہ پریم چندجی اس لائن میں خود ناکامیاب ہوئے یا ناکامیاب بنائے گئے "مل مزدور" کے علاوہ پریم چندجی نے اور بھی تین چار کہانیاں لکھیں جن کے فلم اجنٹا والوں نے بنائے ہیں لیکن وہ چمک کسی میں نہ آئی۔

پریم چند کی زندگی اور تصنیفات پر ایک نظر

از سید علی جواد زیدی

امارت اور آسودہ حالی، غربت پر خندۂ تحقیر کرتی ہے لیکن اِس کے باوجود امارت کو وہ فخر کہاں نصیب جو غربت کو حاصل ہے۔ غربت ہی کی زرخیز زمین سے ایسے ایسے جواہر بے بہا نکلے جو دُنیا میں آسمان کے درخشاں ستاروں سے بھی زیادہ چمکدار ثابت ہوئے۔ غربت ہی کے ماحول میں مُنشی دھنپت رائے معروف بہ "نواب رائے" و "پریم چند" پیدا ہوئے۔ اِس کی پست ذہنیت کے خلاف قولاً و فعلاً دونوں طرح سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش میں انھوں نے اپنی زندگی بسر کر دی۔ پریم چند اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور ہماری بدلی ہوئی ذہنیت ان کے بار احسان سے ہمیشہ جُھکی ہوئی رہے گی۔

مُنشی پریم چند ذات کے سریواستو کایستھ تھے اس صوبے کے دیہاتوں میں عموماً کایستھوں کی قوم اور خصوصاً سریواستو صاحبان مُسلمانوں سے میل جول رکھنے میں سب سے پیش پیش ہیں چنانچہ انھیں عموماً فارسی اور اُردو سے بہت محبت ہوتی ہے۔ پریم چند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ بنارس کے قریب ایک گاؤں میں ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جو موجودہ فرقہ پرستی کے دور سے بہت دُور تھا۔ ۱۸۸۰ء میں مُلک میں باہمی جنگ و جدال کا یہ جذبہ موجود نہ تھا جو آج موجود ہے۔ اپنے ہی پیدا کردہ کردار کی زبان سے جس کا نام بھی وہ اپنے افسانہ "چوری" میں ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں:-

"دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا.......... میری عمر آٹھ سال کی تھی...... ... علی الصباح جو کی روٹیاں کھاکر.......... روانہ ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے یہاں حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں...... پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑیوں کی بہار دیکھتے ...... کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے

ایسا بہانہ کر دیتے کہ اُن کی چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر جاتیں۔"

اس تصویر میں کچھ مبالغہ کی رنگ آمیزی اور مصنفانہ اضافے ہو سکتے ہیں لیکن یہ اُس بچے کی فطرت کی جیتی جاگتی تصویر ضرور ہے۔ جو اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے "مولوی صاحب" کے یہاں جاتا ہے۔ "کھیلنا" اور "پڑھنا" یہ دو کام اُس کے سامنے ہیں۔ دو متضاد جذبات میں جنگ ہوتی ہے۔ بالآخر طفلانہ فطرت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اور وہ کھیلنے میں مشغول ہوتا ہے۔

اس موقع پر ناظرین کے دلوں میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ اس بچہ کے ایام طفولیت کیونکر گذرے؟ کیا بتاؤں اُس وقت کے حالات تو وہی بتا سکتا ہے جس نے اُن کا بچپن دیکھا ہو۔ لیکن بھلا اُس وقت کون جانتا ہوگا کہ یہ بچہ آگے چل کر اتنی عظیم الشان شخصیت کا مالک ہوگا لیکن پریم چند کے حساس دل میں اُن دنوں کی یاد باقی تھی۔ وہ اُن کا تذکرہ کرتے ہیں اور دل پر ایک خاص اثر لیکر کرتے ہیں۔ اُسے اب اُنھیں کے الفاظ میں سُنئے:-

ہائے بچپن تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا ... گھر ... وہ برہنہ پا، برہنہ جسم کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں گھٹیلے جوتے پہن کر اُس وقت جو خوشی ہوتی تھی، اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی۔ گرم پنیلے رس میں جو لذت تھی وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں۔ چربن اور کچے بیروں میں جو ذائقہ ملتا تھا وہ اب شہیر برنج اور انگوروں میں بھی نہیں ملتا۔"

یہ ڈاکخانہ کے ملازم کا بیٹا ایک اور واقعہ کی طرف اپنے افسانہ "قزاقی" میں اشارہ کرتا ہے جس سے کیا عجب ہے اس کے بچپن کا ایک دھندلا سا خاکہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے "قزاقی ذات کا پاسی تھا ... ... روزانہ ڈاک کا تھیلہ لے کر آتا ... ... جب وہ دوڑتا تو اس کے بلم کے گھنگھرو بجنے لگتے۔" گھنگھرو بجنے کے بعد اس بچے کی کیا حالت ہوتی تھی؟:-

"میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اُچھلنے لگتا۔ خوشی کی اُمنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دُنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھوں پر لئے دوڑنے لگتا تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اُڑا چلا جا رہا ہوں۔"

نہیں بلکہ اس بچے میں محبت۔ ہمدردی، ایثار وغیرہ کے جو جذبات موجود ہیں وہ کھلے بندوں بتا رہے ہیں کہ فسانہ نویس دراصل اپنا ہی کردار پیش کر رہا ہے۔ صرف تخیل نے کہیں کہیں

اضافے کر دیئے ہیں۔ ایک غریب ہرکارے کو ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھکر اس کے جوشِ گریہ کا عالم دیدنی ہوتا ہے۔ ماں کے پاس باپ کی فریاد لیجانا فطرت کے مطابق ہے۔ اُسے قزاقی کے علیحدہ ہونے کا افسوس ہوا۔ پھر بھی وہ کہتا ہے کہ "کھانا تو میں نے کھا لیا، کیونکہ بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے اور خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو" وہ بیٹھے بیٹھے سوچتا ہے کہ ایک عالیشان محل بنوائے گا جس میں اپنے منّو (ہرن کے بچے) کے لئے ایک علیحدہ کمرہ اور پلنگ ہوگا۔ علیحدہ فٹن بھی۔ اسی طرح ہزاروں ہوائی قلعے بناتا اور بگاڑتا ہے"

پریم چند ابتدا ہی سے سخی واقع ہوئے بچپن ہی میں اُنھیں لوگوں کی تکلیفوں کا فوراً احساس ہوجاتا تھا۔ اور ان کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے تھے کہ "بیچارہ رُوکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟" اُن کے دل میں یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی کہ اُن کے پاس جو کچھ ہے (چاہے وہ چار ہی پیسے کیوں نہ ہوں) وہ مستحق کو دیدیں۔ مگر اُنھیں اپنی بے بضاعتی پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی عجیب و غریب ہے کہ پریم چند کو بچپن میں پیسے جمع کرنے کی عادت تھی۔ اور انھیں محفوظ رکھنے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ لیکن بچپن کے ساتھ ہی اِس نیک عادت نے بھی مُنھ موڑا۔ اس کا احساس پریم چند کو بھی تھا چنانچہ اسی افسانے میں وہ اپنے ننھّے کردار سے کہلواتے ہیں کہ:۔

"معلوم نہیں اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی۔ اب بھی وہی حالت رہتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا"

پریم چند جی اپنی طفلانہ مسرتوں کا اکثر مواقع پر اظہار کرتے ہیں۔ کہیں جب بوا آن نکلتا ہے تو رام چند رجی کے پیچھے بیٹھکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ "میں جنت میں بیٹھا ہوں"۔ کبھی وہ گلّی ڈنڈا کھیلنے میں مصروف ہوجاتے ہیں اور بوا آن نکلتا ہے۔ مگر وہ کھیلنا نہیں چھوڑتے کیونکہ اُنھیں اپنا داؤں لینا تھا اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ "اپنا داؤں چھوڑنے کے لئے اس سے کہیں زیادہ ایثار کی ضرورت تھی جتنا میں کرسکتا تھا۔" غرضیکہ اِس طرح کی سیکڑوں باتوں کا وہ جابجا اظہار کرتے ہیں۔ دیہاتی زندگی ایک بچے کے لئے جتنے مسرت کے سامان مہیا کرسکتی ہے وہ سب سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اُن کے دِل سے اِن باتوں کی یاد نہیں جاتی بلکہ وہ تنہائی کے لمحوں میں اِن گذرے ہوئے دنوں کی یاد سے اپنے دِل کو خوش کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ سطور بالا پر سرسری نگاہ دوڑانے والے یہ خیال کریں کہ یہ کیونکر مان لیا جائے کہ اِن افسانوں میں اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا تعلق اُن کی زندگی سے ہے؟ یہ سوال بادی النظر میں تو بہت اہم ہے لیکن وہ لوگ جو تصنیف اور مصنف کے گہرے تعلق سے واقف ہیں وہ غالباً اسے قابل

اعتنا بھی نہ سمجھیں گے۔ پریم چند کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے والے اِس امر میں میری تائید کریں گے کہ پریم چند کے افسانے اُن کے صریع الاثر اور ذکی الحس ہونے کی وجہ سے لکھے جا سکے ہیں۔ اُن کے افسانوں کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اُسے بے دھڑک الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ان کی کیفیت بالکل اس شاعر کی ہے جس نے کہا ہے کہ ؎

حرفے زدردِ دِل کشم و بر زبان زنم
نبود غرض بہ شعر ز اظہارِ فن مرا
(مولوی نجم مرحوم چریاکوٹی)

یا جیسا کہ نظیریؔ نے کہا ہے کہ ؎

ایں دفترِ بے ربط کہ دیوان فقیر است
مجموعۂ احوالِ پریشانِ فقیر است

ہر بڑے شاعر یا بڑے ادیب کی زندگی اُس کی تصنیفات کے پردہ میں صاف طور سے دکھائی دیتی ہے۔ خود شعرا اور ادبا کو بھی اس کا احساس رہتا ہے چنانچہ ایک بڑے ادیب کا قول ہے کہ "اگر مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو میرے تصنیفات کے پردے میں دیکھو" پریم چند بھی انھیں بڑے مصنفین میں ہیں۔ پھر وہ جس زور اور یقین اور تمام جزوی تفصیلات کے ساتھ واقعات بیان کرتے ہیں۔ اور بچوں کے خیالات کے تجزیہ میں جس احتیاط سے کام لیتے ہیں اُن کو حقیقی زندگی کا جو رنگ دیتے ہیں، اور دیہات کی جو مانوس فضا پیدا کرتے ہیں۔ اِن سب باتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ان واقعات میں اُنھیں کا بچپن عکس فگن ہے۔ صرف ایک بات رہ جاتی ہے کہ آیا یہ باتیں حرف بحرف صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے ہم کو ایک معیار قائم کرنا پڑے گا۔ ہم کو طفولیت کے واقعات تو زیادہ معلوم نہیں لیکن جوانی اور آخر عمر کے حالات معلوم ہیں۔ میں نے ان واقعات کا اپنی جگہ پر تطابق کیا ہے اور صرف انھیں واقعات یا عادات کا تذکرہ کیا ہے جو اُن کی بعد کی زندگی میں بھی اکثر و بیشتر پیش آئے۔ بہر حال اس مضمون میں میں نے اس بات کی امکانی کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھوں وہ صداقت کے راستے سے الگ نہ ہو۔ جہاں مجھے ذرا بھی شک تھا وہاں میں نے صاف لکھ دیا ہے کہ اِس میں صنّاعانہ اضافے ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ بھی اسی طرح اِن کا مطالعہ کریں گے تو لُطف بھی دوبالا ہو جائے گا اور وہ واقعات جو عموماً نگاہوں سے نہاں ہیں نظر کے سامنے آجائیں گے۔ کسی مصنّف کی تصنیف سے حقیقی مسرّت اور لذّت حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ گولڈ اسمتھ کا وکار آف ویکفیلڈ (VICAR OF WAKEFIELD) یا ڈزرٹڈ ولیج (DESERTED VILLAGAE) دیکھئے، ڈکنس کے

مشہور کیرکٹر (DAVID COPPER FIELD) کا مطالعہ کیجئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلس کے ناولوں اور افسانوں پر نظر دوڑائیے ہر جگہ مصنّفین کی شخصیت اپنے اصلی لباسوں میں نظر آجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ فن کی نزاکت قائم رکھنے کے خیال میں کچھ کمی بیشی کر دی گئی ہو۔ تھیکرے نے گولڈ اسمتھ یا جوناتھن سوفٹ (GOLD SMITH یا JONATHAN SWIFT) کی سوانح عمری کے متعلق اپنے لکچر میں اس بات کو نمایاں طور پر ظاہر کیا ہے کہ مصنّف کی زندگی اس کے تصانیف پر بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مصنّف کے احساسات شدید ہوں اور اس میں بیان کی پوری قوّت بھی ہو۔

منشی پریم چند نے آٹھ سال تک فارسی اور اردو ادبیات کی تعلیم حاصل کر کے دونوں زبانوں میں اچھی خاصی مہارت بہم پہنچا لی تھی۔ انھیں ابتدائے عمر ہی سے ادبیات سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے چوہ۱۴ برس کے سن میں اُردو کا ڈرامہ لکھا تھا جس کا نام بھی لُطف سے خالی نہیں ہے۔ غالباً یہ تائیدِ غیبی تھی کہ اس کا نام "ہونہار برِوا کے چکنے چکنے پات" رکھا گیا تھا۔ چار سال بعد ناول "اسرار محبّت" اخبار "آوازِ خلق" میں شائع ہوا جو بنارس سے نکلتا تھا۔ اس طرح اُردو اور فارسی میں کافی مہارت بہم پہنچانے کے بعد پریم چند انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے مگر مدرسہ میں داخل ہوتے ہی اُن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہیں ہوتی "باپ" کی حکومت گھر کے باہر رہتی ہے مگر گھر کے اندر جو کچھ ہے "ماں" کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی "ماں" محبّت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ پریم چند کو اس کا بہت زیادہ احساس ہے۔ چنانچہ وہ اپنے افسانہ "مندر" میں ایک جذباتی پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مہرِ مادری، تجھے آفرین ہے! دُنیا میں اور جو کچھ ہے، باطل ہے، ہیچ ہے۔ مہرِ مادری ہی حق ہے، غیر فانی ہے، لازوال ہے"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پریم چند کو اپنی والدہ کی دائمی مفارقت کس قدر شاق گذری ہو گی۔ ماں کی جو عظمت اُن کے دِل میں تھی اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ پریم چند کے دِل پر اس حادثہ کا زبردست اثر پڑے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص "ماں" کے متعلق اس قسم کے خیالات رکھتا ہو کہ:۔

"ماں، تو دھنیہ ہے! تیری سی عقیدت، تیری سی وفا کا دیوتاؤں میں بھی ہونا امرِ محال ہے!"

وہ اپنی ماں سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو کر کس قدر پژمُردہ اور بےچین نہ ہوا ہو گا۔ مگر "بدنصیبی کبھی تنہا نہیں آتی"۔

ابھی پریم چند نویں دسویں درجہ ہی میں پہنچے تھے کہ اُن کے باپ کا سایۂ بھی اُن کے سر سے اُٹھ گیا۔ اور پریم چند یتیم ہو گئے۔ خدا جانے ایسا کیوں ہے مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ یتیمی کا داغ شہرت کی پیشانی کا ستارہ بن جاتا ہے۔ دُنیا کی بڑی بڑی ہستیوں میں اکثر لوگوں کو اوائل عمر ہی میں اس غم سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پریم چند کو بھی یہ امتحان دینا پڑا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے اس مصیبت کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اُنھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور کسی نہ کسی طرح اپنے ادبی ذوق کی تکمیل بھی کرتے رہے۔ یہ تمام باتیں کسی نہ کسی پیرایہ میں اُنکی تصانیف میں مذکور ہیں۔ اپنے افسانے "شکست کی فتح" میں وہ اپنے مرکزی کردار کی زبانی یہ الفاظ ادا کراتے ہیں۔

"میں آزاد تھا، میرے والدین مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔"

اِسی طرح اپنے افسانے "نیک بختی کے تازیانے" میں نتھوا کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ۔

"نتھوا کے ماں باپ دونوں مرچکے تھے"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِسے اپنی ہی زندگی سے متعلق لکھ رہے ہیں۔ اور پھر جس لڑکے کے ماں باپ دونوں مرچکے ہوں، کوئی سہارا نہ ہو وہ اگر کیلاش کی بابت مندرجہ ذیل خیالات کا اپنے افسانہ "ڈگری کے روپئے" میں اظہار کرتا ہے تو کوئی تعجب نہیں۔

"کیلاش کو اپنے ہاتھوں سے کنواں کھود کر پانی پینا تھا جس کے خیال ہی سے اس کا دل پریشان ہو جاتا تھا۔"

بہرنوع پریم چند نے کسی نہ کسی طرح انٹرنس تو پاس کرلیا۔ مگر انگریزی تعلیم اور وہ بھی کالج کی تعلیم کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پریم چند کو مالی دُشواریاں درپیش تھیں چنانچہ اُنھوں نے ایک ٹیوشن کر لی۔ جس کا تذکرہ بھی اُن کے افسانوں میں ملتا ہے۔ اُن کے افسانہ "شکست کی فتح" میں لچیاوتی کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔

"بابو جی نے محض اپنی محنت اور کوشش سے پرائیویٹ ٹیوشن کر کے یہ درجہ حاصل کیا۔"

اُن کے دوسرے افسانہ "لال فیتہ" کی مندرجہ ذیل سطروں میں ہری بلاس کی جگہ پریم چند کو سمجھ لیجئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ اِنھیں کی آپ بیتی ہے۔

"مگر ہری بلاس کا شوق طلب اس گرمی اور سردی سے مستغنی تھا۔ اِسی عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار طلبا کا مایہ الامتیاز ہے وہ کالج میں داخل ہو گیا اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے پڑھا کر تعلیمی مصارف

نکال لیا کرتا تھا۔ مگر وقتاً فوقتاً اُسے یکمشت رقموں کی ضرورت ہوتی تھی۔"

اس کی تصدیق اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو ناظر کاکوروی نے "کائنات" میں لکھا ہے اور اس مقالے سے بھی جو منشی دیانرائن صاحب نگم نے "زمانہ" میں تحریر فرمایا ہے۔ مدیر زمانہ نے تو اس ٹیوشن کی تعداد بھی لکھدی ہے کہ یہ پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن تھی۔ اِس قلیل رقم کو دیکھئے اور اِس کو خیال کیجئے کہ ناسُاعدت زمانہ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ نصف پریم چند کو ملا کرتا تھا اور نصف وہ اپنے متعلقین کے پاس بھیجدیا کرتے تھے۔ جس میں سوتیلی ماں، بھائی اور ناںہال کے بعض لوگ شریک تھے۔ اِن کا بارِ کفالت پریم چند ہی کے کاندھوں پر تھا۔ بالآخر مجبور ہو کر انھیں ایک اسکول میں اٹھارہ روپیہ ماہوار کی ملازمت قبول کرنا پڑی۔ اس طرح فکرِ معاش سے نجات ملی اور حصول تعلیم کی تمنا جو ایک دبی ہوئی چنگاری کی شکل میں ہوگئی تھی یکایک شعلہ فشاں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں وہ ٹریننگ کالج میں داخل ہوگئے۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۰۵ء اور ۲۰ر فروری ۱۹۰۵ء کے دو خطوط سے جو پریم چند نے مدیرِ "زمانہ" کو لکھے ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الہ آباد ٹریننگ کالج کے ماتحت ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے اور کچھ دنوں پرتاب گڈھ میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے وابستہ رہے۔ پرتاب گڈھ سے اُن کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔ کانپور آنے کے بعد مدیرِ "زمانہ" اور اُن سے برادرانہ تعلقات ہوگئے۔ اور منشی پریم چند مستقل طور سے "زمانہ" کے قلمی معاونین میں شریک ہوگئے۔ ملازمت میں بھی ترقی کی راہیں اُن کے لئے مسدود نہ ہوئیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس زمانہ میں "سوزِ وطن" کے نام سے اُن کا مجموعہ شائع ہوا جس پر گورنمنٹ نے اُن کو فہمائش کی اور انھیں "نواب رائے" کا فرضی نام ترک کرنا پڑا اور اس کی پاداش میں اُن کا تبادلہ ہمیرپور سے بستی کر دیا۔ سب ڈپٹی انسپکٹر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انسان کی زندگی مسلسل دورہ بن جاتی ہے۔ پریم چند اس سے عاجز آچکے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی خدمات نارمل اسکول گورکھپور میں منتقل کرالیں۔ اور اُس وقت تک اسی اسکول میں فرائض متعلقہ انجام دیتے رہے جب تک کہ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات پر لبیک کہکر سرکاری ملازمت سے مستعفی نہ ہوگئے۔

(۲)

* یہ اُن کا تعلیمی دور تھا جس کے اکثر تاثرات اُن کے افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

مثلاً اُن کا افسانہ "توبہ" اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

(۱) "جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو گیند کھیلتا تھا۔ اور ماسٹروں کی دھمکیاں سہتا تھا، یعنی میرا بچپن کا زمانہ تھا۔ نہ عقل کا ظہور ہوا تھا نہ دانائی کی نشوونما۔"

اِس کے بعد اسی افسانہ میں لکھتے ہیں :۔

(۲) "میرے کتنے ہی دوست اس قدر مستقل مزاج نہ تھے۔ میرا چال چلن نہایت اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔"

اِس کے علاوہ ان کا پورا افسانہ "مایۂ تفریح" کالج کی "خوش فعلیوں" کے ذکر سے بھرا ہوا ہے لڑکے ایک دوسرے کو کس طرح اُلّو بناتے ہیں۔ اور جو لوگ ذرا "بدھو" ہوتے ہیں اُن کے خلاف کیسی کیسی سازشیں کی جاتی ہیں۔ بقول پریم چند :۔

"وہاں بیشتر طلبا تو معاش کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُنھیں خوش وقتی، خوش گپّی اور خوش گذاری کے سوا وہاں اور کوئی شغل نہیں رہتا۔ ... ... اگر کوئی صاحب دھرم کرم کے پابند ہوں اور پوجا پاٹ کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ بلا ناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں تو انھیں مایۂ تفریح بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی صاحب کتابوں کے عاشق ہیں مطالعہ میں سعی بلیغ کرتے ہیں تو سمجھ لیجئے اُن کی تضحیک کے لئے کسی گوشہ میں سازشیں ہو رہی ہیں۔"

اپنے افسانہ "آخری حیلے" میں لکھتے ہیں :۔

"میرا حافظہ بہت قوی نہیں۔ تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہوگئیں۔ وہ ساری تاریخیں جنھیں راتوں کو جاگ کر، جبر ڈال کر یاد کی تھیں۔"

ممکن ہے کہ اس بیان کے جزو اولیٰ کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ پریم چند نے تاریخ کے مشہور سنوات، راتوں کو جاگ کر، جبر ڈال کر یاد کئے ہوں گے اور جب تک کوئی شخص غیر معمولی دماغ لیکر نہ آیا ہو۔ ایک ہی نظر میں تاریخ کے اِن سنوات کا یاد ہو جانا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔

اُنھوں نے اسکول کی ملازمت کا نقشہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ پہلے پہل وہ اٹھارہ روپے پر ملازم ہوئے تھے۔ قلیل تنخواہ والے مدرسین کا حال خود اُن کی زبانی ملاحظہ فرمایئے۔

"پنڈت چندر دھر نے ایک اپر پرائمری مدرسہ کی مدّرسی کر تو لی تھی مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے تھے کہ ناحق اس جنجال میں آپھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے، آرام سے زندگی

بسر ہوتی۔ یہاں مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپئے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بھی اِدھر آئے اُدھر غائب! نہ کھانے کا سکھ نہ پہننے کا آرام۔"

اس میں پریم چند کی زندگی کے مکمل نقوش موجود ہیں اور اُن کے دلی احساسات وجذبات کی پوری عکاسی اس اقتباس میں ہوتی ہے۔

اُن کے ایک افسانہ میں ایک سب ڈپٹی انسپکٹر کا بھی تذکرہ ہے جن کی سفارش پر ایک اچھوت اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر نہیں کہا جا سکتا کہ پریم چند کی زندگی میں کبھی ایسا واقعہ پیش آیا تھا یا نہیں۔

جس واقعہ نے اُن کی درس و تدریس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا وہ غیر معمولی طور پر اہم ہے اس کے متعلق پریم چند نے کئی جگہ لکھا ہے "فتح چند" کا استعفیٰ اِسی بنا پر تھا وہ کسی افسر کے سامنے ذلت گوارا نہیں کر سکتے تھے گو" لال فیتہ" کے ہیرو ہری بلاس صیغۂ تعلیم میں ملازم نہ تھے لیکن تھے سرکاری ملازم اور ضلع کے انتظامی امور کے ذمہ دار۔ بہر کیف ان کے استعفیٰ کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں:-

"جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے اور اس کے قوانین بھی رحم، حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا۔ ممکن ہے بعض موقعوں پر حکام مجھ سے خوش نہ رہے ہوں اس لئے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقض ہوا میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمت ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ نمبر........ مورخہ........ میں جو احکام نافذ کئے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں۔ اور میرے خیال میں اُن میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں اُن کی تعمیل کے لئے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور اُن کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔

اِن حالات پر نظر کر کے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنا ہے۔ دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا بھی حق حاصل ہے اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر اس عہدہ سے سبکدوش کیا جائے۔"

"احباب نے استعفیٰ کی خبر سُنی تو ہری بلاس کو سمجھانے لگے۔"

یہ ہری بلاس صاحب پریم چند اور اُن کے خیالات کی تشکیل جامد کے سوائے اور کون ہو سکتے ہیں۔ پریم چند نے احباب کی اس نصیحت کا جو جواب دیا ہے اُن کے صحیح الفاظ کا تو علم نہیں ہے لیکن عقلمندوں کو اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا کہ وہ خط نقل کر دیا جائے جو "وشو مبھر" نے "آنند" کو لکھا تھا۔ اور پریم چند کے افسانہ "جیل" میں موجود ہے۔

"پیارے آنند مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں وہ میرے لئے فائدہ بخش نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت کھینچے لئے جا رہی ہے میں جانا نہیں چاہتا لیکن جاتا ہوں۔ اسی طرح جیسے آدمی مرنا نہیں چاہتا اور مرتا ہے رونا نہیں چاہتا لیکن روتا ہے۔ جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے اوکھلی میں اپنا سر ڈال چکے تو میرے لئے بھی اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا............ خدمت وطن کا تمغہ اس سے کہیں اچھا ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔

تمھارا وشو مبھر"

(۳)

ادبی حلقوں میں پریم چند کی عزت اِس استعفیٰ کی بنا پر نہیں ہے۔ ترک موالات کے سلسلے میں ہزاروں سرکاری ملازموں نے استعفےٰ داخل کر دیئے تھے لیکن وہ اس عزت و احترام کے مستحق قرار نہیں دیئے گئے۔ استعفےٰ دینے کا واقعہ تو صرف پریم چند سے ہماری ہمدردیوں کو بڑھاتا ہے۔ اُن کی اصلی عظمت اور اُن کا اصلی احترام جو ہمارے دلوں میں ہے وہ انکی افسانہ نویسی کی بدولت ہے۔ اُن کی علمی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اِس مضمون میں پریم چند کی ادبی حیثیت پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

اِس ضمن میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند کی ادبی زندگی کب سے شروع ہوتی ہے؟ ۱۹۳۰ء[ا] میں بنارسی داس صاحب چترویدی نے پریم چند سے کئی سوالات کئے تھے منجملہ اُن کے ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ نے افسانہ لکھنا کب سے شروع کیا؟ اس کے جواب میں پریم چند نے لکھا تھا۔

"میں نے سب سے پہلے ۱۹۰۷ء افسانے لکھے۔ ۱۹۰۸ء میں میرا "سوزِ وطن" (جس میں پانچ افسانے تھے)

ا۔ "وشال بھارت" بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۶ء۔ "پریم چند مرحوم" از بنارسی داس چترویدی۔

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اُسے ہمیر پور کے کلکٹر نے مجھ سے لیکر جلا ڈالا تھا کیونکہ اُن کے خیال میں وہ انقلاب انگیز تھا۔ حالانکہ اُس وقت سے اب تک مختلف رسالوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔"

لیکن منشی پریم چند کی ادبی زندگی اس سے بھی پہلے کی ہے۔ بقول مدیر "زمانہ"[۵۲] :-

"سال بھر کے اندر ہی اندر پریم چند جی سے جن کا اصلی نام دھنپت رائے تھا خط و کتابت شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ ۱۹۰۴ء کے آخر تک وہ بھی "زمانہ" کے قلمی معاونین میں شامل ہو گئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ نے سب سے پہلے ایک تنقیدی مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں "زمانہ" میں شائع ہونے کے لئے اور ایک ناول کا مسودہ بغرض مشورہ بھیجا تھا۔ ناول کے لئے پبلشر کی تلاش تھی چنانچہ اس میں ذرا دیر ہوئی تو ایک شکایت نامہ بھی لکھا تھا........ دوہی سال کے بعد آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہو گیا ...... اسی طرح بے ضابطہ حیثیت سے آپ کو "زمانہ" کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پوزیشن حاصل ہو گئی۔"

اِس "دوہی سال کے بعد" کا مفہوم وہی ۱۹۰۷ء ہے جبکہ پریم چند نے افسانے لکھنا شروع کئے تھے گویا ان کی ادبی زندگی تو ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے۔ تصنیف و تالیف کی اُمنگ اُن کے دل میں شروع ہی سے موجود تھی۔ کانپور میں مدیر "زمانہ" کی صحبت میں اس ذوق ادب میں زیادتی ہی ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ ملک میں "نواب رائے" "نواب رائے" کا چرچا ہونے لگا۔ نواب رائے پریم چند کا دوسرا نام نہ تھا۔ بلکہ اِس پردہ میں انہوں نے اپنی اصلی شخصیت کو چھپا لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اہلیت کسی نام کی پروا نہیں کرتی۔ منشی ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے کتنے ہی مضامین اور نظمیں مفروضہ ناموں سے لکھی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ مضامین اتنے ہی مقبول ہوئے ہیں جن کے وہ مستحق تھے۔ کانپور میں پریم چند کو خداداد صلاحیتوں کے استعمال کے کافی موقعے حاصل ہوئے "آزاد" اور "زمانہ" کے صفحات ہمیشہ اُن کے لئے کھلے رہے اور اسی مشق نے انھیں ادارت کے تمام مبادیات اور اصولوں سے واقف کر دیا۔

اِس سوال کا جواب کچھ بہت مشکل نہیں ہے کہ پریم چند مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کی طرف کیوں مائل ہوئے؟ یہ ضرور ہے کہ ان کی ادبی قوتیں زیادہ عرصہ تک خوابیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ کبھی نہ کبھی ایک مصنّف کی حیثیت سے دُنیائے علم و ادب میں نمودار ہی ہوتے

۵۲۔ "زمانہ" بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ "منشی پریم چند اور زمانہ و آزاد" از منشی دیانراین نگم۔

لیکن اس قدر جلد جو چیز انھیں اِس میدان میں گھسیٹ لائی وہ اُن کی مالی کشمکش تھی اِس کے متعلق کئی مقامات پر اشارتاً یا صاف صاف انہوں نے اپنے ہی پیدا کردہ کرداروں سے یہ بیان کرایا ہے کہ اُن کے اِس میدان میں فوراً آجانے کی وجہ اُن کی مالی دشواریاں تھیں۔ اپنے افسانہ "ڈگری کے روپئے" میں لکھتے ہیں کہ

"مجبور ہو کر اُسے اپنے قلم کا سہارا لینا پڑا"

یا اپنے فسانہ "فلسفی کی محبت" میں رقم طراز ہیں کہ:-

"لالہ گوپی ناتھ کو اب ضرورتاً تصنیف کا شوق ہوگیا تھا"۔

لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ صرف روپیہ پیدا کرنے کے لئے لکھتے ہوں۔ اور یہ ہو ہی کیونکر سکتا ہے۔ ہندوستان میں عموماً اور اُردو داں طبقے میں خصوصاً ابھی اپنے مصنفین کی صحیح قدر و منزلت کرنے کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا ہے اکثر اخبارات و رسائل نقصان پر چلتے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت میں عموماً کوئی خاص فائدہ نہیں مطبع والے یا دوسرے پبلشرز خاطر خواہ رقمیں نہیں دے سکتے۔ جب یہ عالم ہے تو پریم چند کو یہ خیال ہی نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اِس کے علاوہ بجائے خود اُن کا یہ خیال تھا کہ "ہمارے ادب کی تنزّلی کا باعث بھی یہی ہے کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لئے لکھتے ہیں[۵]"۔

ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد پریم چند کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔ اُردو داں طبقے میں ان کی تصانیف خاطر خواہ فروخت نہیں ہو رہی تھیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ چند مشہور ترین مصنفین کو چھوڑ کر "پریم چند" کی تصانیف اُردو داں طبقے میں سب سے زیادہ فروخت ہوئیں پریم چند انسان تھے۔ وہ فکر معاش سے آزاد نہ تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے جب یہ دیکھا کہ ہندی کی طرف رجوع کرنے سے اُن کی پریشانیاں کم ہو سکتی ہیں تو وہ ہندی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اسی زمانہ میں منشی بشن نراین بھارگو مالک مطبع نولکشور نے رسالہ "مادھوری" کی ادارت اُنکے سپرد کر دی۔ اس سے پریم چند کی مالی مشکلات میں بہت بڑی حد تک کمی ہو گئی۔ وہ ذرا اطمینان کی فضا میں سانس لینے لگے۔ بزم ہندی میں شریک ہوتے ہی پریم چند کو یہ احساس ہوا کہ یہاں انھیں مالی امداد زیادہ حاصل ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنے کو زیادہ تر ہندی کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۹۱۵ء سے

۵۔ یہ جملہ پریم چند کے افسانہ "ڈیمانسٹریشن" سے ماخوذ ہے جس میں افسانہ نویس نے یہ الفاظ ڈرامیٹسٹ کی زبان سے ادا کرائے ہیں

۱۹۳۶ء تک کوئی اکیس ۱۹ برس ہوتے ہیں۔ یہ تمام مدت ہندی کی خدمت کرتے گذری لیکن اس عرصہ میں پریم چند اُردو سے غافل نہیں رہے۔ بلکہ اُن کے افسانے اور مضامین اکثر اُردو رسائل کی زینت بڑھاتے رہے۔ سال گذشتہ جب اُردو، ہندی کے قضیہ میں گرما گرم بحثوں کا سلسلہ جاری تھا اس وقت منشی پریم چند مرحوم نے "زمانہ" میں اِس موضوع پر ایک بالکل غیر جانبدارانہ مضمون لکھا جو سنجیدہ حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ غالباً اسی کی بدولت ان کو سال گذشتہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ مولوی ظفر الملک علوی مدیر "الناظر" کا بیان ہے کہ:—

"جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ہندی لکھنا شروع کی تو پہلے وہ اُردو میں افسانہ لکھتے تھے اس کے بعد ہندی میں اُسے منتقل کرتے۔ رفتہ رفتہ ہندی میں مشاق ہوگئے۔"

بہرکیف یہ پریم چند کے لیے اور بھی قابل فخر بات تھی کیونکہ آخر عمر میں تو پریم چند ہندی کے مسلم الثبوت ادیب تصوّر کئے جانے لگے تھے اور ہندی والوں نے انھیں "اُپنیاس سمراٹ" یعنی افسانہ نگاری کے بادشاہ" کا لقب دیدیا ہے۔

مرحوم نے ۱۹۳۰ء میں مادھوری کی ادارت ترک کردی۔ اور خاکِ وطن نے انھیں اپنے دامن میں کھینچ بلایا اور وہاں جاکر "ہنس" نامی ماہوار ہندی رسالہ جاری کیا جس کے متعلق اُنھوں نے پنڈت بنارسی داس چترویدی کو لکھا تھا کہ "ہنس" کو تقریباً دوسو روپیہ ماہوار کے نقصان پر چلا رہے ہیں۔ اگر ذاتی مطبع نہ ہوتا تو پریم چند شاید اسے کسی طرح برداشت نہ کرسکتے۔ اُنھوں نے "جاگرن" نامی ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا مگر وہ ناکامیابی سے دو چار ہو کر بند ہوگیا۔ پریم چند نے افسانوں کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں بقول مدیر "الناظر"

"۱۹۳۵ء میں وہ سینما کے لئے قصوں کی ترتیب کے لئے بمبئی طلب کئے گئے اور وہاں چھ سات مہینہ رہے اور تقریباً پانچ ہزار روپیہ مل گیا۔"

اجنٹا سینی ٹون کمپنی نے "پریم چند" کو بمبئی طلب کیا تھا۔ انگریزی رسالہ "روپ بانی" کے مدیر نے لکھا ہے کہ گذشتہ موقع پر جب مجھ سے اور پریم چند سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی تو اُنھوں نے کہا تھا کہ اجنٹا سینی ٹون کے ذمہ دو مہینوں کی تنخواہ کے سلسلے میں کئی سو روپئے باقی ہیں" جس طرح محمود غزنوی نے فردوسی کے پسماندگان کے پاس رقم موعودہ فردوسی کے مرنے کے بعد

بھجوائی اسی طرح ممکن ہے کہ یہ رقم بھی غم رسیدہ پسماندگان کے پاس بھیجدی جائے۔ ان چند مختصر سطروں میں اس مرحوم افسانہ نویس کی ادبی زندگی کی تبدیلیوں پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالی گئی۔ اب ذرا افسانہ نویسی کے متعلق خود افسانہ نویس کے خیالات سُنئے۔

(۴)

پریم چند نے سب سے پہلے افسانے لکھنا شروع کئے۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اُن کی زبانی پہلے یہ سنئے کہ وہ افسانے کیونکر لکھتے تھے؟ مدیر"نیرنگ خیال" نے چار افسانہ نویسوں سے دریافت کیا تھا کہ وہ افسانہ کیونکر لکھتے ہیں؟ - اِن چاروں نے جو جوابات لکھے وہ مدیر موصوف نے "سالنامہ نیرنگ خیال" میں درج کر دیئے۔ منشی پریم چند نے جو جواب دیا تھا۔ وہ بلحاظ طوالت یہاں پر کل نقل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کے ضروری اجزا یہ ہیں:-

"میرے قصّے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں انمیں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض کسی واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم اُٹھتا ہی نہیں۔ زمین طیار ہونے پر میں کیریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔ میں جب تک کوئی افسانہ اوّل سے آخر تک ذہن میں جما نہ لوں لکھنے نہیں بیٹھتا......... میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُرسطوت واقعے پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پروا نہیں کرتا......... کبھی کبھی سُنے سُنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ اُن پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جا سکتی ہے......... میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی.......جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے تو میں اس واقعہ سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی رُوح ہے۔ میں بہت سُست رفتار ہوں۔ مہینے بھر میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی بنیاد مشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی......... شاعری کی طرح اس کے لئے بھی اور ادب کے ہر ایک شعبے کے لئے کچھ فطری مُناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں پیدا کرتی ہے"۔

نادانستہ طور پر آپ ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اُسے پڑھتا ہوں اگر اس میں کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس ہوتا ہے تو میں اُسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا...... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اُسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس لئے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔ پریم چند"

منشی پریم چند اپنے افسانہ "ڈمانسٹریشن" میں کبھی مست رام کی زبان سے یہ کلمہ ادا کراتے ہیں کہ:۔

"ڈرامہ ایسا ہونا چاہیئے کہ جو سُنے دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک نکتہ تیر و نشتر کی طرح دل میں اُتر جائے"

اور کبھی گورپرشاد کی زبان سے ڈرامہ کی اہمیت کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:۔

"ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خون جگر پینا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لئے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے مبصرین کا قول ہے کہ ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ روس، فرانس، جرمنی، تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے، مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے"

اپنے افسانہ "آخری حیلہ" میں اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات کو یوں لکھتے ہیں کہ:۔

"بے انتہا تکلیف دیکھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے۔ کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے۔ صبح ہوتے ہی دوا دوش۔ وہی ہنگامہ آرائی اس پر طرہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو"

اسپنے افسانہ "ادیب کی عزت" میں وہ یوں حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں:۔

(۱) "ادب کا یہ پجاری دُنیا و مافیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا تھا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا۔ دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیوں کر خوش کرتے"

(۲) "ادبی خدمت اور فقیری میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں"

(۳) "میں نے آج سمجھ لیا کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے"

اِن سے زیادہ جو الفاظ سرتا پا حقیقت و واقعیت بن کر سامنے آتے ہیں وہ اُن کے افسانہ "ڈگری کے روپئے" میں ملیں گے۔ ذیل میں دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پریم چند کس قدر فرض شناس واقع ہوئے تھے:۔

"اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے قومی وسیع النظری سے جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مُہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر اور ناقابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین تقضا ہے حتیٰ کہ وہ اکثر اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے اُس کی زندگی کا مقصد عظیم اور معیار پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے، جن کا نام امر ہو گیا ہے۔ جو مظلوم قوموں کے لئے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کے پیشرووں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔"

اور بھی بہت سے اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے لیکن مضمون طویل ہو رہا ہے اس لئے اسی کو کافی تصور کر لینا مناسب ہوگا۔

پریم چند کا تذکرۂ زندگی نامکمّل رہ جائے گا اگر اُن کی خانگی زندگی میں مندرجہ ذیل چند باتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ اُن کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے اُنھیں آرام کے بجائے رنج ہی پہنچتا رہا۔ اس کے تاثرات کا اظہار اُن کے ایسے مکالموں سے اکثر ہوتا ہے جو زن و شو کے درمیان (ان کے لکھے ہوئے افسانوں میں) ہوتے ہیں۔ دوسری بیوی شیورانی دیوی جی خود بھی ادیبہ ہیں۔ اور ہندی کے اہل قلم میں ایک مستقل جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ ان سے پریم چند بہت زیادہ خوش رہے زندگی کا یہ انقلاب بھی اُن کے افسانوں سے نمایاں ہیں۔ پریم چند نے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ شریمتی شیورانی ایک کمسن بیوہ تھیں۔ پریم چند نے ان سے شادی کر لی تھی۔

مُنشی پریم چند کی عادات و اطوار کے متعلق دو ایک لفظوں میں کچھ لکھنا ناممکن ہے، وہ اوصاف کا مجموعہ تھے اور گو وہ فارغ البالی کی زندگی بسر نہ کر سکے۔ تاہم غالب کی طرح یہ کہتے تھے کہ ع
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے۔" چنانچہ اپنے افسانہ "توبہ" میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایسی زندگی کو بامزہ بنانے کے لئے صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ خود فراموشی۔ جو ایک لمحے کے لئے مجھے دُنیاوی تفکرات سے چھٹکارا دے۔ میں اپنے گرد و پیش کے حالات کو بھول جاؤں۔ اپنے کو بھول جاؤں۔ ذرا ہنسوں، ذرا قہقہے لگاؤں۔ ذرا دل میں تازگی پیدا ہو۔"

یہ تمام زندگی ان کا معمول رہا۔ اسی وجہ سے اُن کے بے تکلف احباب انھیں "بمبوق" کہنے لگے تھے۔

ایڈیٹر صاحب "زمانہ" لکھتے ہیں کہ :-

"ایسی شگفتہ طبیعت پائی تھی کہ ہر وقت اور ہر بات میں ہنسی کا پہلو نکال کر خوب زور سے قہقہے لگایا کرتے......

چنانچہ یاران بے تکلف انھیں "بمبوق" کہا کرتے تھے"

پریم چند اصول کے فدائی تھے۔ سچے محب وطن تھے۔ اُن کا دل وطن کی محبت سے لبریز تھا۔ وہ ہندو مُسلم، عیسائی وغیرہ کی تفریقوں کے قائل نہ تھے اور اپنے ابنائے وطن کو اس کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اُن کے افسانوں میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ وہ نوجوانوں کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ نوجوانوں کے سامنے معاشرتی، سیاسی اور مذہبی و اخلاقی مسائل پیش کرتے تھے اُن پر بحث کرتے تھے۔ حریت فکر کے خاص موید تھے۔ یہ سب باتیں کسی شخص میں یکجا کم جمع ہوا کرتی ہیں۔ اُن کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وضع کی پابندی اُن کا خاص شیوہ تھا۔ اُن کے احباب میں ہندو مُسلم اور عیسائی سبھی تھے، اور ایک سچے ہندوستانی کی طرح وہ سب سے یکساں طور پر ملتے تھے" انھیں اس خود غرض دُنیا میں گندم نما جو فروشوں سے بھی سابقہ پڑا جو چھوٹی چھوٹی رقمیں لیکر روپوش ہوگئے۔ لیکن اس مردِ پاک باطن کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ آہ! ایسی ہستیاں اب چراغ لیکر ڈھونڈھنے پر بھی مشکل سے ملتی ہیں۔

(۵)

اُن کی تصانیف کے متعلق مجمل تبصرہ سے پہلے میں وہ تین سوال درج کر رہا ہوں جو پنڈت بنارسی داس چترویدی نے پریم چند سے کئے تھے وہ سوالات یہ تھے :-

(۱) آپ کے سب سے بہتر پسندیدہ افسانے کون ہیں ؟

(۲) آپ پر کس مصنف کے طرز تحریر کا اثر پڑا ہے ؟

(۳) آپ کو اپنی تصنیفات سے کتنی آمدنی ہوئی ؟

اِن سوالات کے جو جوابات مُنشی پریم چند نے دیئے ہیں وہ ذیل میں درج ہیں :-

(۱) اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے۔ دو سَو سے زیادہ افسانوں میں کہاں تک انتخاب کروں لیکن یاد سے کام لیکر لکھتا ہوں۔

(۱) بڑے گھر کی بیٹی (۲) رانی سارندھا (۳) نمک کا داروغہ (۴) سوت (۵) آبھوشنر (۶) پرانشچت (۷) کامنا (۸) مندر اور مسجد (۹) گھاس والی (۱۰) مہاتیرتھ (۱۱) ستیاگرہ

(۱۲) لاچھن (۱۳) ستی (۱۴) لیلیٰ (۱۵) منتر

(۲) میرے طرز تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ لیکن پنڈت بشن نراین درؔ اور ڈاکٹر رابندر ناتھ کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے۔

(۳) آمدنی کی کچھ نہ پوچھئے۔ تمام ابتدائی کتابوں کا حق طباعت پبلشرز کو دیدیا۔ "سیوا سدن" "پریم آشرم" "سپت سروج" "سنگرام" کے لئے ہندی پستک ایجنسی نے ایک مشت تین ہزار روپے دیئے تھے۔ اور نونِدھ کے لئے شاید اب تک دو سو روپیے ملے ہیں۔ دولارے لال جی نے رنگ بھومی کے لئے اٹھارہ سو روپے دیئے تھے اور دوسرے مجموعوں کے سو دو سو روپیے مل گئے ہوں گے۔ کایا کلپ۔ آزاد کتھا پریم تیرتھ، پریم پرتما۔ پرتگیا میں نے خود چھاپیں۔ لیکن ابھی تک مشکل سے چھ سو روپئے وصول ہوئے ہیں۔ تصانیف سے متفرق آمدنی پچیس ۲۵ روپے ماہوار ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں۔ اور ترجموں میں شاید دو ہزار سے زائد نہیں ملا۔ آٹھ سو روپئے میں رنگ بھومی اور پریم آشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہوگیا۔ "ہنس" اور جاگرن کی اشاعت میں تقریباً دو سو روپیہ ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔"

پریم چند کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تقریباً دو سو افسانے لکھے۔ لیکن جناب ناظر کاکوروی اپنے مضمون میں اُن کے افسانوں کی تعداد ۲۵۰ بتلاتے ہیں۔ مسٹر ٹنڈن[۵] نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو لیڈر میں شائع ہوا تھا لکھا ہے کہ اُن کے افسانوں کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ اس لئے ان دو شہادتوں کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خود مصنف کا تخمینہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کی کہانیوں کی تعداد دو سو نہیں بلکہ تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔ جن کی تعداد دس بارہ تک پہنچتی ہے۔ ڈرامہ بھی غالباً دو یا تین لکھے ہیں۔ ناولوں میں "رنگ بھومی" اور ڈراموں میں "کربلا" بہت زیادہ مقبول ہوئے۔

(ب) یہ منشی پریم چند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اُن پر کسی مصنف کے طرز تحریر کا اثر نہیں پڑا ہے کسی بڑے ادیب کے لئے یہ خیال کرنا کہ وہ کسی دوسرے مصنف کی نقل کرتا ہے۔ ادیب کی توہین ہے، تعریف نہیں ہے۔ جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ وہ سب اس کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک انفرادی حیثیت حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منشی پریم چند کی تصانیف کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تمام افسانے کسی ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ مختلف مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ کہیں سرشار کا رنگ نظر آئے گا تو کہیں

۵ مسٹر ٹنڈن۔ ایڈیٹر ہندوستانی (ہندی) الہ آباد

بشن نراین ورؔ کا اور کہیں رابندر ناتھ ٹیگور کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند کا یہ عقیدہ تھا کہ عبارت اور خیالات میں حتی الوسع ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے اس کے لئے ویسے ہی طرز ادا کا انتخاب بھی کرتے تھے۔ یہی وہ چیز ہے جو پریم چند کی ہندوستان گیر شہرت کی ضامن ہوئی ہے۔ اگر پریم چند نے اپنے قصہ کا پلاٹ مذاحیہ رکھا ہے تو اس کے لئے انہوں نے طرز ادا کو بہترین مذاحیہ نگاروں کے بیان سے ملا دینے کی کوشش کی اور اس طریقہ سے اثر و روانی بڑھانے میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح سنجیدہ مضامین یا فسانے لکھتے وقت اُن کا طرز بیان اتنا سلجھا ہوا اور سنجیدہ ہو جاتا ہے کہ وہ اچھے اچھے سنجیدہ مضامین اور افسانے لکھنے والوں کے مقابلے میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کے طرز تحریر کا اثر پریم چند کے چھوٹے چھوٹے جملوں اور اُن کی نفسیاتی تخئیل سے ظاہر ہے۔ پریم چند نے اپنے ایک افسانے میں ایک جگہ اپنے ہیرو کے متعلق لکھا ہے کہ "اس کے مضامین میں طول کم اور تفتیش زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حرف بحرف پریم چند کے لئے بھی صحیح ہے۔ وہ ہندوستان کے ذرّے ذرّے پر نگاہ تحقیق ڈالتے ہیں۔ وہ تمام جسمانی، روحانی نسلی اور صنعتی خصوصیات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں اور اُن کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند کی یہ خاص کوشش ہوتی ہے کہ اُن کے افسانوں میں کوئی لفظ بیکار استعمال نہ ہونے پائے۔ وہ ہر ہر لفظ میں معانی و اسرار کے سمندر بھر دیتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر "دریا بکوزہ" کی کوئی اصلیت مانی جا سکتی ہے تو اسی طرح سے کہ الفاظ کے محدود کوزے میں مطالب و معارف کا دریا موجزن نظر آتا ہے یا دل کے ظرف میں جو بظاہر تنگ معلوم ہوتا ہے تمام کائنات کی وسعت نظر آتی ہے۔ اِن سب باتوں میں پریم چند ڈاکٹر ٹیگور سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ان سب کے علاوہ جو چیز پریم چند کے طرز بیان کو ٹیگور کے طرز بیان سے قریب تر لانے والی ہے وہ اُن کے افسانوں کا مقامی رنگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیگور کے بعد پریم چند کے سوائے کسی دوسرے افسانہ نویس نے مقامی رنگ سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا ہے جتنا کہ پریم چند نے۔"

(ج) پریم چند کو جو آمدنی اُن کی تصنیفات سے ہوئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ اگر مغربی ممالک میں جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ پریم چند نے مکمل بیس برس تک جتنا روپیہ اپنی تصانیف کے صلے میں پایا وہ انگلستان وغیرہ میں ایک ایک کتاب کے بدلے مل

جایا کرتا ہے۔ دور کیوں جایئے " آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ" (ALL QUIET ON THE WESTERN FRONT) کے مصنف کو محض اسی ایک تصنیف کے معاوضہ میں اتنی کثیر رقم مل گئی کہ جب اس سے یہ کہا گیا کہ ایسی ہی دوسری تصنیف اشاعت کے لئے دو تو اس نے کہا کہ مجھے پہلے ہی ناول کی اشاعت کے بعد اتنا روپیہ مل گیا ہے کہ اب مزید تصنیف و تالیف کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ ع ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

جناب اعجاز لکچرار الہ آباد یونیورسٹی اپنی "مختصر تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے منشی پریم چند کے دل و دماغ کو خاص طور سے افسانہ کے لئے بنایا تھا۔ جس کا صرف منشی جی نے اس خوبی سے کیا کہ ابھی تک میدان افسانہ نویسی میں کوئی اُن سے آگے قدم نہیں رکھ سکا"

پریم چند کے متعلق یہ رائے انتہائی صداقت شعاری اور کثرت مطالعہ پر مبنی ہے اور اپنی جگہ اس قدر جامع و مانع ہے کہ مزید اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ پریم چند کا خود ہی خیال تھا کہ افسانہ نویسی بھی شاعری کی طرح بہت کچھ عطیات فطرت کی محتاج ہے۔ بقول سعدی ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پریم چند فطری طور پر افسانہ نویسی کے لئے موزوں تھے۔ اور غالباً ہر میدان میں قسمت آزمائی کے بعد وہ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ سیاسی و تحقیقی مضامین لکھنے کے بجائے انہوں نے اپنی عنان توجہ افسانہ نویسی ہی کی طرف مبذول کی۔ فن افسانہ نویسی پر انہوں نے متعدد کتابیں پڑھیں، مختلف زبانوں کے افسانوں کا مطالعہ کیا۔ ملکی حالات کا بغور مشاہدہ لیا اس کے بعد انہوں نے قلم اُٹھایا۔ اس کوشش کا جو نتیجہ ہوا اُس سے آپ ناواقف نہیں ہیں اور کیوں نہ ہو جب کسبی اور وہبی قوتیں یکجا ہو جائیں تو ایسی عظیم المرتبت ہستی کا افق شہرت پر جلوہ گر ہونا ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔

برانڈر میتھوز (BRANDER MATTHEWS) نے اپنے شہرۂ آفاق مضمون " فلسفۂ افسانہ " جس کا اصلی نام انگریزی میں PHILOSOPHY OF SHORT STORY ہے) لکھا ہے کہ:۔

ایک مختصر افسانہ اس کہانی سے جو صرف مختصر ہو مختلف اور زیادہ اہم چیز ہے۔ ایک سچا افسانہ ناول سے

اپنی مشہور خصوصیت اتحادِ اثر (UNITY OF IMPRESSION) کی بنا پر جداگانہ حیثیت اختیار کرتا ہے۔ چونکہ مختصر افسانوں میں الفاظ کا صحیح اور بالکل حسب محل استعمال کیا جاتا ہے اس لئے تمام افسانے میں وہ فنی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے جو ناول میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اکثر مختصر افسانوں میں فرانسیسی زبان کے کلاسک ڈرامہ کے تینوں اتحاد یکجا ہو جاتے ہیں۔ یعنی اتحادِ عمل و مکان و زمان۔"

اب اس تعریف کی روشنی میں پریم چند کے افسانوں کو دیکھئے تو یہ محسوس ہوگا کہ اتحادِ اثر پیدا کرنا پریم چند کا اولین مقصد تھا وہ مرکزیت خیال پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک اُن کی یہ کوشش ہوئی تھی کہ افسانہ میں اتحادِ عمل بھی ہو، اتحادِ مکان بھی ہو اور اتحادِ زمان بھی۔ اگر ایک لفظ یا ایک جملہ پریم چند کے اکثر و بیشتر افسانوں سے کم کر دیا جائے تو نگاہ آشنا اس کمی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

جیسا کہ پریم چند نے لکھا ہے وہ ہمیشہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر افسانے لکھا کرتے تھے۔ ابتدا سے آخر تک وہی مقصد افسانہ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ اس لئے کوئی تغیّر یا تبدل تمام افسانہ کی کی تبدیلی کے مترادف ہوگا۔ سر سڈنی کالون نے ایک مرتبہ اسٹونسن کو ایک خط لکھا تھا جس میں اسٹونسن کو یہ رائے دی تھی کہ وہ اپنے افسانوں میں سے کسی ایک خاص افسانہ کا خاتمہ تبدیل کر دیں۔ اس کے جواب میں اسٹونسن نے لکھا کہ:-

"اس کا دوسرا خاتمہ لکھوں؟ اوہو! لیکن یہ میرے لکھنے کا طریقہ نہیں ہے، اختتام کے تبدیل کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ابتدا کو بالکل غلط کر دوں........ ابتدا، اور تمام پلاٹ مع اختتام کے ایک ہی استخوان و خون کے مجموعہ سے بنے ہیں۔"

منشی پریم چند کے افسانوں کے متعلق بھی بجنسہٖ یہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پریم چند کے افسانے فن کی مکمل تصویریں ہیں۔ فن کی تمام نزاکتوں کا مجموعہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کثیر المطالعہ بھی تھے اور اپنے مطالعہ کا صحیح مصرف جانتے تھے۔ ان کے یہاں مختلف النوع افسانے ملیں گے کسی میں اسکاٹ (SCOTT) کا رنگ ہے، کسی میں ڈکنز (DICKENS.) کا اسلوبِ بیان ہے، کہیں پو (POE) یا (MAPAUSSANT) کے طرز بیان کی جھلک ہے اور کچھ افسانے (BRET HARTE) "KIPLING O.HENRY, G.W CABLE" اور (H.G.WELLS) کے اسالیب تحریر کے عکس بردار ہیں۔ لیکن ہر جگہ پریم چند کی انفرادیت نمایاں ہے اُن کے قلم سے بیک وقت مختلف افسانے مختلف اندازِ بیان میں صفحہ قرطاس پر نمایاں ہوتے

ہیں لیکن پریم چند چونکہ خذ ما صفا و دع ما کدر کے مقولے پر عامل ہیں اس لئے دربار افسانہ نویسی کے اِن مشہور رتنوں میں ہر ایک کا انداز ایک خاص امتزاج کے ساتھ اُن کے یہاں نظر آتا ہے یہ ایسی تقلید ہے جس پر تقلید کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ جہاں انسان اپنی قوت ممیزہ سے کام لیتا ہے اور نظر انتخاب ڈالتا ہے وہاں تقلید پر بھی نہیں مار سکتی۔ پریم چند کے متعلق اسی لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حقیقت پسند یعنی (REALIST) ہیں یا مثالیت پسند یعنی (IDEALIST) ہیں اُن کے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد (IDEALISM)[1] کی اچھی مثال ہے۔ لیکن زیادہ تر افسانوں میں پریم چند نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی حقیقت کو بے نقاب کر دیں اس لئے اُن کے افسانے زیادہ تر "ریلزم" (REALISM) کے بہترین نمونے ہیں۔ بہرکیف بہ حیثیت مجموعی پریم چند کو (IDEALIST) (آئیڈیلیسٹ) نہیں کہہ سکتے۔ اُن کی زندگی کا خاص مشن یہ تھا کہ وہ حیات انسانی کے ... نقشے ہمارے سامنے پیش کر دیں۔

عموماً افسانہ اور حقیقت کے درمیان ایک وسیع خلیج نظر آتی ہے لیکن جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غلط سلط واقعات پر افسانوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اُنہوں نے افسانہ کی موجودہ ترقی کو نہیں دیکھا ہے۔ دوسری طرف حقیقت پسند کا یہ حال ہے کہ وہ رومانیت اور تخیّل کو دوراز کار سمجھتا ہے۔ لیکن حقیقی افسانہ نہ تو حقیقت سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ ایسی حقیقت کا پابند جس میں نہ تو رومان کی گلگونی ہو اور نہ تخیلات کی رنگینی۔ افسانہ درحقیقت ان چیزوں کے ایسے امتزاج کا نام ہے جو تفریح کے ساتھ ہی ساتھ انسانی دماغ کو پست اور سطحی خیالات سے بلند کر کے ایک بلند معیار زندگی سے روشناس کرائے۔ ہمارے افسانہ کو تحریک میں لانے والی وہ چیزیں ہونا چاہیئے جو ہمارے مشاہدات زندگی پر مبنی ہوں۔ مگر اُن میں ایسے لطیف عناصر کی چاشنی بھی ہو جو تلخ اور ناخوشگوار حقیقتوں کو دلچسپ اور نظر فریب بنا دے۔ افسانہ نویس کا فرض ہے کہ وہ زہر ہلاہل کو شہد کی حلاوت عطا کرے۔ پریم چند کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ وہ ہر چیز کو ایک حقیقت پسند کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد اُسے اپنے مخصوص انداز میں رنگ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ کبھی کبھی پریم چند صرف اپنی تخیّل سے کام لیتے ہیں اور جو چیزیں ہم نے نہیں دیکھی ہیں اُسے وہ افسانہ کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں لیکن اُن میں بھی امکان مثالی

---

[1] معیار پسندی۔ مثالیت

(IDEAL PROBABILITY) موجود نہیں رہتا ہے۔ یعنی گو وہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں نہیں آئی ہیں مگر اُن کا امکان ضرور ہوتا ہے۔ ہڈسن (HUDSON) نے لکھا ہے کہ حقیقت کو حدود فن میں لانے کے لئے ہمیں مثالیت سے کام لینا پڑتا ہے۔ پریم چند حرف بحرف اس کی عملی تقلید کرتے ہیں اسی وجہ سے اُن کی اخلاقی تعلیمات میں کبھی واعظانہ خشکی نہیں آنے پاتی۔ مثلاً اُن کے افسانہ توبہ کو لیجئے۔ اُس میں شراب نوشی کے مضر اثرات اس طرح دکھائے گئے کہ پڑھنے والے کو خود بخود شراب سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مگر مصنف نے کہیں بھی واعظانہ رنگ اختیار نہیں کیا ہے البتہ اس میں امکان مثالی موجود ہے۔ اُن کے دوسرے افسانہ "نیک بختی کے تازیانے" کو دیکھئے یا "ڈگری کے روپئے" کا مطالعہ کیجئے۔ سب میں پریم چند اپنے فرائض سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں

پریم چند پر سیاسی تحریکوں کا زبردست اثر پڑا تھا۔ وہ ملک کی سیاسی تحریکوں سے اسقدر متاثر ہوئے تھے کہ سرکاری ملازمت بھی ترک کردی تھی۔ اس طرح ملکی تحریکوں کا اثر اُن کی تحریروں میں صاف طور سے نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے افسانے "بھاڑے کا ٹٹو" کا ایک اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جس میں پریم چند نے تحریک دہشت انگیزی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس تحریک کا زور شور بنگال میں بہت زیادہ ہوا۔ اس کا ایک خاص سبب تھا جسے پہلے خود پریم چند ہی کی زبانی سُنئے۔

"اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر گذرتی ہے جو افراد کے لئے ناقابل خیال ہے۔ سیلاب اگر آبادیوں کو غرقاب کرتا ہے تو زمین کو زرخیز بھی کر دیتا ہے۔ دریائے تہ نشین کے سکون میں یہ قوت عمل کہاں۔ اس مجمع میں ستم نارواکے خلاف احتجاج کا ایک سیلاب سا آگیا۔ خون بیدار انتقام کے لئے مشتعل ہوگیا۔ قانون پر تصرّف اس ذہنیت کی خصوصیت ہے صدہا آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر کیطرف دوڑے۔" (ماخوذ از افسانہ "برات")

گذشتہ سیاسی بدنظمی کے دور میں ایسی ہی اجتماعی ذہنیت انقلاب کی طرف مائل تھی۔ ملک میں غربت اور افلاس جس حد کو پہنچ چکے تھے۔ اس کا ردِعمل لازمی تھا۔ چنانچہ ہوا اب اسے بھی آپ پریم چند کی زبانی سنئے۔

"رمیش جیل سے نکل کر پکا انقلاب پسند بن گیا۔ جیل کی تاریک کوٹھری میں تمام دن کی سخت محنت کے بعد وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا۔ سوچتا کہ انسان کیوں گناہ کرتا ہے؟

اِس لئے تاکہ دُنیا میں اس قدر افتراق ہے۔ کوئی تو عالیشان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں۔ کوئی ریشم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے کسی کو پھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں ہے۔ ایسی بے انصاف دنیا میں اگر چوری، ہتیا اور ادھرم ہے تو یہ کس کا قصور ہے ؟ وہ ایک ایسی انجمن قائم کرنے کا خواب دیکھتا تھا جس کا کام دنیا سے اس افتراق کو نابید کر دینا ہو۔ دنیا سب کے لئے ہے اور اس میں سب کو راحت و آرام سے بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ ڈاکہ ہے نہ چوری چوری!! دولت مند اگر اپنی دولت کو خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ ہے؟ دولت مند اسے گناہ کہتا ہے تو کہے۔ اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علیحدہ ہوگی۔ اس کے سامنے وہ سبھی ملزم ہوں گے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے......... جیل سے نکلتے ہی اس نے اسی جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیا۔ خفیہ انجمن قائم ہونے لگی۔ ہتھیار جمع کئے جانے لگے:" (ماخوذ "بھاڑے کا ٹٹو")

پریم چند نے اپنے افسانہ "قاتل" میں اِسی سبھا کا تذکرہ کیا ہے۔ دھرم ویر اور اس کی ماں کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے وہ حقائق سے مملو ہے۔ ملک میں ایسے دو گروہ یقیناً پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے دونوں کا مقصد حصولِ آزادی ہے۔ مگر ایک ستیہ گرہ کا قائل ہے۔ وہ عدمِ تشدد کے اصول پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ اشتراکیت کے نشے میں مست ہو کر دہشت انگیزی پر اُتر آیا ہے۔ ان گروہوں کے خیالات منشی پریم چند کے الفاظ میں یہ ہیں:-

"دھرم ویر! مجھے اُمید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریحی اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں آزاد نہیں ہوا کرتیں.........

مجھے تو یہ طرزِ عمل بچوں کا سا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں وہی ان لوگوں کو مل جائیگا۔ اصلی چیز جبھی ملیگی جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے

ماں:- اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں ضبط کرائیں؟

دھرم ویر:- اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا۔ وہ ہندوستان اُسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہو جائیگا کہ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا.........

ماں:- کیا تم سمجھتے ہو کہ انگریزوں کے قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں۔ ہم اس طرز حکومت کے دشمن ہیں ......"

اس عبارت سے نہ صرف پریم چند کی قوت استدلال کا سراغ ملتا ہے بلکہ ان کی سیاست دانی اور بیدار مغزی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی حالات پر کتنا عبور رکھتے تھے۔

یہ حقیقت محتاج بیان بھی نہیں کہ آج کل ہم ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جو روحانیت اور مادیت کی جنگ میں گذر رہا ہے۔ روحانیت کا اثر و نفوذ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور مادیت اپنا جال ہر طرف پھیلاتی جا رہی ہے۔ ہماری تمام تحریکیں، ہمارے تمام اعمال اور ہمارے تمام خیالات مادی اشیاء کے تابع ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور خالص مشرقی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہم بجائے بلندی کے پستی کی طرف مائل ہیں۔ روحانیت ہمیشہ مشرق کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ مگر دنیا کے ذہنی انقلابات ہماری ذہنیتوں کو بھی برباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ پریم چند اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اِسی لئے وہ ہمیں ہندوستان کی عظمت گذشتہ کے افسانے سُناتے ہیں۔ وہ راجپوتوں کی بہادری، وطن پروری اور آن بان کو ایسے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جن سے ہمارے دلوں میں روحانیت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور یہی پریم چند کا مقصد ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پریم چند نے راجپوتی عظمتوں کا تذکرہ محض ہندوؤں کے مردہ جذبات کو حیاتِ نو بخشنے کے لئے کیا ہے۔ مگر مجھے اس سے قطعی اختلاف ہے۔ پریم چند کا اصلی مقصد ہندوستان کی روحانیت کو اُجاگر کرکے پیش کرنا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں بھی وہی جذبات پیدا کر دیں جن پر ہم کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ راجپوتوں کی شُجاعت اور بہادری ہندوستان کی بہادری اور شجاعت کے مرادف ہے اسے فرقہ دارانہ رنگ دینا کسی حیثیت سے مناسب نہیں ہے

اُن کا ہر افسانہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

پریم چند اگر کچھ چاہتے ہیں تو صرف اس قدر کہ لوگ ان کے افسانوں کو پیام زندگی سمجھ کر اُن کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکیں

وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی غمکدے ایک نئی روشنی سے جگمگا اٹھیں۔ اور اُن کی حیات کی رگوں میں ایک برقی لہر دوڑ جائے۔ وہ عورتوں کو بھی دعوت عمل دیتے ہیں۔ راجپوت عورتوں کے ایثار، قربانی، وطن پرستی اور جانبازی کے افسانوں کے سُنانے کا اس کے سوا اور مقصد ہی کیا ہو سکتا ہے۔ "وکرمادت" "رانی سارندھا" "راجہ ہردول" "گناہ کا اگن کنڈ" وغیرہ افسانے کیوں لکھے گئے؟ محض اِسی مقصد کے حصول کے لئے کہ ہندوستانیوں کو "خودشناسی" آجائے۔ وہ اسلاف کے کارنامے اِس لئے سُنانا چاہتے ہیں کہ وہ یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر دیں کہ "تم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے ہو"۔

اِس قسم کے افسانوں میں پریم چند نے بعض جگہ حقیقت کے ساتھ ساتھ شعریت سے بھی کام لیا ہے۔ اس سے جوش، روانی اور اثر تو ضرور بڑھ گیا ہے مگر ان مقامات میں شعریت حقیقت پر غالب آ گئی ہے۔ پھر بھی اُن کی عبارت یا اُن کا پلاٹ غیر فطری نہیں ہونے پایا۔ آپ اسے چاہے اُن کی کمزوری سمجھئے یا کمال۔ بہرحال پریم چند کوئی خدائی کے دعویدار نہیں تھے اور خطا و نسیاں مقتضائے بشریت ہے۔ پھر پریم چند سے کبھی ایسی فروگذاشت ہو گئی ہو تو چنداں نکتہ چینی کے قابل نہیں۔

پریم چند کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ دیہاتی زندگی کی صحیح اور ہو بہو مرقع کشی ہے۔ اُن کے افسانوں کو پڑھتے وقت۔ یہ کبھی خیال بھی نہیں ہونے پاتا کہ ہم انھیں لوگوں کے حرکات وسکنات کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں جو ہمیں میں سے ہیں۔ جن سے آئے دن ہم سے سابقہ پڑا کرتا ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جس زندگی میں ہمارے لئے دل کشی کا کوئی سامان نہیں ہے، وہی پریم چند کے قلم کی ادنیٰ سی جنبش کی بدولت اتنی لطیف اور پُرکیف بن جاتی ہے کہ اُس میں ہم ایک لذت محسوس کرنے لگتے ہیں گویہ لذت ایک جذبۂ غم کے پہلو بہ پہلو پیدا ہوتی ہے۔ کسانوں کی زبوں حالی، زمینداروں پولیس والوں اور سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں کا حال پڑھ پڑھ کے بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

پریم چند دیہاتی زندگی سے متعلق افسانے لکھتے وقت اتنی احتیاط ضرور برتتے ہیں کہ وہ دُکھ اور درد بھری داستانیں سناتے وقت اکثر و بیشتر دیہاتی زندگی کے چند ایسے

دلچسپ مناظر بھی پیش کر دیں کہ تھوڑی دیر کے لئے فضائے دل پر چھائے ہوئے غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور خوشی کی ایک بجلی چمک جاتی ہے۔ اس سے ہمارے مضطرب جذبات میں اشتعال کی جگہ متفکرانہ سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی سکون علم النفس کے مسائل بیان کر دینے سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع کو پریم چند کبھی ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے وہ عالمگیر نفسیاتی حقائق بیان کرتے ہیں۔ مثلاً رنج والم عیش، مسرت، حسد و بغض وغیرہ کے جذبات صرف کسی مخصوص طبقے کی ملکیت نہیں ہیں۔ وہ امیر و غریب، کالے اور گورے میں یکساں طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ایسے جذبات کے بیان کر دینے سے، دیہاتی زندگی کی خشک داستان اور بھی پُر اثر اور نتیجہ خیز ہو جایا کرتی ہے۔

پریم چند کے کردار عموماً مثالی ہوتے ہیں جنھیں انسان مشعل راہ ہدایت بنا سکتا ہے۔ وہ عموماً یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور بُرائیاں بھی لیکن پریم چند خوبیوں کو زیادہ نمایاں کر کے بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے بُرائیاں خود بخود دب جاتی ہیں۔ اُن کے تمام کردار آہستہ آہستہ ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اسی باعث اُن میں ہمواری اور یک رنگی موجود رہتی ہے۔ کوئی کردار کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے لئے وہ ابتدا ہی سے تیاریاں نہ کر رہا ہو۔ پریم چند کو یہ بات بہت پسند ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو کشش و پنج اور گو مگو کی حالت میں مُبتلا کر دیں۔ اُن کے کردار دو مختلف جذبات سے برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ اُن کے سامنے دو راستے ہیں جن میں وہ ایک کو اختیار کرتے ہیں اور دوسرے کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور اپنے اُس انتخاب کی وجہ وہ کبھی پوشیدہ نہیں رکھتے۔ بلکہ بتا دیتے ہیں۔ یہ وجہ بھی ایک نہ ایک زاویہ نظر سے معقول سزدر ہوتی ہے۔

پریم چند کرداروں کے نام اُن کی نسلی خصوصیات، اُن کی مالی حالت اور اُن کے ماحول کے بیان کرنے میں خاص کوشش سے کام لیتے ہیں۔ سوائے چند ناموں کے جتنے نام بھی ہیں اُن سے کرداروں، عادات و اطوار کا پتہ چلتا ہے اور اُن کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ کرداروں میں جسمانی اور دماغی خوبیاں وہ یکجا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں اور جسمانی کیفیتوں کا ذکر ضروری سا خیال کرتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں بوڑھوں، بچوں جوانوں، مردوں، عورتوں، عالموں، جاہلو پنڈتوں، مولویوں، پروفیسروں، کلرکوں، ججوں، اخبارنویسوں سب کو جگہ ملی ہے لیکن سب علیحدہ علیحدہ خصوصیات اور عادات و اطوار کی مالک ہیں۔ اس بات نے ایک امتیازی شان پیدا کر کے مختلف طبقوں اور صنفوں کی عادات میں ایک خطِ فاصل کھینچ دیا ہے۔

ان کرداروں کے مکالمے عموماً نہایت مہتم بالشان اور پُرمعنی ہوتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں ہر ایک کا کردار ادا ہو جاتا ہے اور مافی الضمیر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ پریم چند کو کردار نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے

حیات انسانی

"شباب انسانی زندگی کی معراج ہے۔ طفلی میں اگر ہم سنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب اُن خوابوں کی تفسیر ہے" (پردۂ مجاز)

"عہد طفلی کے بعد ایسا زمانہ آتا ہے جب ایک بیجا جنون سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اس میں شباب کا مستقل ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست امید آفرینی جو مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن سمجھتی ہے" (پردۂ مجاز)

"بچپن کا دوسرا نام سیلانی پن ہے" (گوشۂ عافیت)

فطرت انسانی

"انسان کا دل لاکھ کی مانند ہے۔ اس کے نشانات مٹا نا یوں تو ناممکن ہے اُسے گرم کر کے ہم اُس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں"

(خواب و خیال)

"انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ ہوتی ہے نہ سفید۔ ان میں دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال ہوتا ہے" (گوشۂ عافیت)

منشی پریم چند کے ناول

از سید طالب علی صاحب طالب ایم اے الہ آبادی

میں یہ کہنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں کہ پریم چند کے سبھی ناول باقی رہنے والے ہیں، آگے چل کر کیا ہوگا یہ تو کوئی پورے بھروسے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن، تاروں کی چال سے، فصل و موسم کی تبدیلیاں سیاسی مطالعہ سے انقلاب کی خبر، انسانی عادات سے واقعات کی پیشین گوئی اور سبب و اثر سے عناصر کی روش حیات کا پتہ چل سکتا ہے تو پریم چند کے ناول، پڑھنے کی طرح پڑھ کر بے بتائے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس لڑی کے کچھ موتی ایسے بھی ہیں جنکو کسی ملک کسی زمانہ اور کسی بھیس میں خریداروں کی کمی محسوس نہ ہوگی،

مکرمی دیانراین نگم صاحب کی پیہم یاددہانیوں کا ممنون ہوں کہ میں کامل ایک مہینہ تک پریم چند کے ناول ہی پڑھتا رہا۔ ورنہ اس خزانے کی نہ جانے کب سیر ہوتی اور میری آتما کی پیاس جو اُردو ناولوں کی ترسی ہوئی تھی خدا معلوم کب تک بجھتی۔

میں نے دو ڈھائی سو سے زیادہ اُردو ناول نہیں دیکھے انگریزی ناول بہت دیکھے ہیں، اب دل میں پھر ایک لہر سی اُٹھی ہے، دیکھوں کیا انجام ہو،

اس تشریح سے ناظرین کو صرف یہ بتانا منظور ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں، نہ تو میں نقاد ہوں، نہ محسن ادب اور نہ ماہر فن۔ میری صرف اسی قدر تمنا ہے کہ پریم چند کے ناولوں کے متعلق جو کچھ میرے خیالات ہیں اُنکو پوری سچائی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کردوں، آپ بھی اس مضمون کو مانگے کی عینک سے نہ پڑھیں اور قیاس کی دوربین سے موشگافیوں پر آمادہ نہ ہوجائیں، ہمہ دانی کو مطالعہ سے ٹرا بیر ہے، ذرا سی زحمت ضرور ہے مگر خود کتابیں پڑھئے اور رائے قایم کیجئے۔ میری تمام مسرت صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ آپ ایک نظر پریم چند کے ناول خود دیکھ ڈالئے پھر آپ کی جو رائے ہوگی خواہ وہ بالکل وہی ہو جو میری ہے یا اس کے سراسر خلاف مجھے پرواہ نہیں ـــــ میرے دماغ کا ہر دروازہ آپ کے خیالات کے لئے آغوش محبت کی طرح کھلا رہے گا۔

مجھے یہ اندیشہ صرف اسلئے ستاتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ زندگی کے ہر شعبے میں، ہماری غلامانہ زندگی کے اثرات نمایاں ہیں، اُردو سے ہماری بے توجہی کا عالم ناگفتہ بہ ہے صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ سب مجھے

پریم چند جیسے مقبول مصنف کے اُردو ناولوں کی ضرورت ہوئی تو سارا شہر الہ آباد چھان مارا، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد یونیورسٹی پبلک لائبریری اور الہ آباد کے دوسرے پبلک کتب خانوں کی آستان بوسی کی اُردو کے محسنین اور پرستاروں کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا مگر کہیں انکا مکمل سٹ نہ ملا، خدا بھلا کرے اُردو ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد کا جنھوں نے جامعہ دہلی سے انکا مکمل سٹ منگالیا ورنہ ــــ خدا جانے کب تک ــــ مجھے ان کے مطالعہ کی مسرت نصیب ہوتی۔

پریم چند نہ اوتار تھے نہ فوق الفطرت انسان، البتہ وہ کامیاب ناول نویس ضرور تھے اور ان کے یہاں زبان، بیان، فن اور تخیئل کی دنیا میں دوسرے کامل افسانہ نگاروں کی طرح بلندیاں اور پستیاں دونوں ہیں۔ پریم چند سچے مگر انتہا پسند تھے۔ انکی بلندیاں ستاروں سے باتیں کرتی ہیں اور انکی پستیاں بھی گہری ہیں

اس مضمون میں پریم چند کے ناولوں کا دوسرے ناولوں سے موازنہ کرنے کا خیال نہیں ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ؎

"وہ وہاں" ہیں جہاں سے اُن، کو بھی آپ اپنی خبر نہیں آتی

اس مضمون میں، تفصیل و اقتباسات بھی بہ خوف طوالت نظرانداز کردئے گئے ہیں۔

بہرحال میں نے پریم چند کے جتنے ناول پڑھے ہیں انکا میرے دل پر جو اثر ہوا ہے وہ حاضر ہے۔

(۱) جلوۂ ایثار یہ طویل فسانہ منشی جی کی پہلی یا دوسری کوشش ہے، غالباً پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اسمیں اُس زمانہ کی فسانہ نگاری کا رنگ غالب ہے، ابتدا، بیانیہ ہے۔ کیونکہ اُن دنوں کسی نہ کسی فطری منظر کی تصویر سے داغ بیل ڈالنا، فن اور اصول کی پابندی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس نئے کھلاڑی نے پرانے میدان اور کھیل کے قدیم طریقے برتتے پر بھی ایسے ٹھاٹھ دکھائے ہیں اور ایسے تیور سے قلم اٹھایا ہے اور اس خوبی سے تشبیہ و استعارات کا صرف کیا ہے کہ کہیں بھی فرسودہ ترکیبیں اور رعایت کی موقلی نہیں بلکہ اس ناول میں ہر جگہ جدت طبع اور زور فکر کا ثبوت ملتا ہے، پہلا باب ڈرامائی خصوصیات سے مالامال ہے، تشبیہوں میں بھی ندرت اور البیلاپن ہے۔ پریم چند کی ایک ادا مجھے بہت پسند ہے۔ جب کبھی وہ مادی چیزوں کی تصویر کشی کرتے ہیں ایسی بے جوڑسی روحانی ادا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں کہ دماغ کا توازن نہیں بگڑنے پاتا۔ بلکہ اُن کی نکتہ دانی کے بدولت تصویر میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور ایک عجیب پُرلطف کشمکش پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی اس کا اُلٹا۔ نفسیات اور روحانیات کا دریا موجیں لے رہا ہے اور اسمیں لکڑی کی ایک ناؤ لہروں میں ڈوبتی اُبھرتی نظر آتی ہے۔ ایسے نظارے کے وقت ناظرین پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ بیان نہیں کیجا سکتی پورے ناول کا خلاصہ پہلے ہی باب میں موجود ہے، پریم چند کبھی دیر تک ناظرین کو انتظار میں نہیں رکھتے

سپوت بیٹا وہی ہے جو دیس کا اُپکار کرے، پریم چند وطن کے سچّے پوجاری تھے اسلئے اُنکے سبھی، سورما، دیش بھگت ہیں، خواہ اُنکا تعلق کسی ذات، طبقے، یا جماعت سے ہو۔ دراصل وہ آدمی کی خلقت اور اس کی زندگی کی صرف یہی غرض سمجھتے ہیں کہ عموماً خلقت کی اور خصوصاً اپنے وطن کی خدمت کرے اگر آپ انکے ہیرو سے یہ جوہر چھین لیں تو اُن میں کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔

پریم چند کے سُورما عمل سے زیادہ آئیڈیل رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں یعنی بعض مقامات پر وہ اپنے ہیرو کے ہاتھ سے ایسے ایسے کام کرا دیتے ہیں جو ناول کے صفحوں پر سچّے اور سینما کے پردوں پر فطری معلوم ہونگے مگر روزمرہ زندگی اور اصلی مسافرخانۂ دنیا میں وہی کام، فلسفی یا شاعر کے دماغ کی چلتی پھرتی تصویریں ہوں گے۔ تاہم مجموعی حیثیت سے اُن کا ہر "ہیرو" سچائی کا پتلا انصاف پسند، تیاگ اور ترک کا نمونہ، کامیاب، فاتح اور گوشت پوست کا رہنما معلوم ہوتا ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنے "ہیرو" کو آواگون کی برکت اور "سنیاس" کے معجزوں کے ہتھیار بھی دیدیتے ہیں۔ آپ ان چیزوں سے اتفاق نہ کریں مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ پریم چند کوئی گڑھی ہوئی بات بیان کر رہے ہیں۔ انکی تعلیم، فضا، یا نشوونما کا اثر کہئیے یا ان کے مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو بات پریم چند بیان کرتے ہیں وہ دل سے نکلتی اور سننے والے کے دل پر اثر کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ پریم چند سے بالکل مختلف سوچنے والوں پر وہ اثر کم ہو یا زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ لیکن جب تک آپ پریم چند کی افسانوی دنیا میں سانس لیتے رہتے ہیں اُن کی ہر بات کا آپ پر اثر ہونا لازمی ہے۔

اس ناول میں نئی روشنی اور پُرانی روشنی اس لطافت سے سموئی گئی ہے کہ جہاں کہیں طبیعت پر کوئی ادا بار ہوئی فوراً دوسری اُمید افزا شان سامنے آگئی۔ ایک چیز البتہ مجھے کھٹکتی ہے، پریم چند نفیس ایجاز واختصار کی جگہ ہمیشہ جزئیات اور تفصیلات سے کام لیتے ہیں اسی لئے طول میں آمد نہیں آورد ہوتی ہے اور بعض اوقات دم گھبرا جاتا ہے۔

پریم چند بیانیہ اور نفسیہ کے بہت دلدادہ ہیں۔ ثالث یا مصنف کی حیثیت سے ہر معاملہ پر رائے زنی کرتے رہتے ہیں اور اس کا پڑھنے والا محتاج رہتا ہے کہ اس کا پورا مفہوم سمجھنے کے لئے پریم چند ہی کی جادو بھری زبان کے سامنے آخر تک اپنا دست سوال دراز رکھے۔ اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے، مہذب زبانوں کے تمام ناول نگار، بیانیہ اور نفسیہ (Narration & soliloquy) کا کام صرف مکالمے سے نکال لیتے ہیں۔

پریم چند کے بعض مکالمے بہت زیادہ دلکش نہیں ہیں، جب کبھی وہ اپنے اطراف کی زبان میں

گفتگو لکھتے ہیں تو واقعی خاص مزہ آجاتا ہے، مقامی زبان (بنارس اور نواح بنارس کی) پوربی زبان پر آپکو پورا ملکہ ہے اور غریب یا متوسط طبقہ کے جذبات کی پوری ترجمانی اُنکی زبان سے ہوجاتی ہے۔ مگر ان کے مکالموں میں احتیاط نہیں ہے، وہ دو مردوں کا مکالمہ بھی لکھتے ہیں، اور عورتوں کا بھی مگر انہیں جنسی امتیازات نہیں برتتے، جس سے اُن کے ناول واقعات کے لحاظ سے کئی جگہ غیر فطری سے ہوگئے ہیں، مگر اُنکی تصانیف میں تصوّف، ترک علایق، تیاگ اور تپسیا کے برقی مشعل اتنے تیز ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔

ان کا شاعرانہ تخیل ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کا سمندر ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے اور اپنی رو میں ہر چیز کو بہائے لئے جاتا ہے۔ پریم چند کا مشاہدہ خواہ کتنا ہی نامکمل اور محدود ہو مگر وہ ہندوستان کی بہت سی مہلک اور تباہ کن رسوم سے بخوبی واقف تھے اور قریب قریب ہر جگہ اُنھوں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ شراب، جوا، سرمایہ داری، شادی اور بیاہ کے مضر رُسوم اور سوسائٹی کی برائیوں کی اصلاح ہوتی رہے یہی اُن کی قلمی کاوش کی معراج ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ آئے دن کے واقعات سے بھی لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور لوگ تیلی کے بیل اور گڈریئے کی بھیڑ کی طرح لکیر کے فقیر بنے ہوئے آنکھیں بند کئے چلے جارہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بھلا افسانوی واقعات میں تازیانہ کی شان کون پسند کریگا۔ لوگ مزے مزے سے پڑھ تولیں گے لیکن پھر جلد ہی بھول جائیں گے۔ اسلئے وہ مجبور ہوکر صاف گوئی اور نصیحتوں پر اُتر آتے ہیں۔ دُکھا ہوا دل اُبل پڑتا ہے۔ چوٹ کھائی ہوئی آتما سے آہیں نکل پڑتی ہیں خواہ اُنکی کھری کھری باتوں کا وہ اثر نہ ہو جو پردہ پردہ میں کہہ جانے کا ہوتا ہے۔

بالاجی اس ناول کے ہیرو ہیں ان کا کیرکٹر نہ مکمل اور نہ کچھ ایسا کیف آور ہے کہ ہم بھی بالاجی بن جانے کی آرزو کریں وہ صرف ایک معمولی قومی لیڈر معلوم ہوتے ہیں جنھیں، عام ذہنیت کی مدد اور واقعات کی سازگاری نے کچھ دنوں کے لئے معراج شہرت پر پہونچا دیا مگر ہمارے یہاں ایسے سورما روز ہی اسٹیج پر آتے جاتے رہتے ہیں اس ناول کی دوسری سیرتیں برائے بیت معلوم ہوتی ہیں یا پہیلیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ بالاجی مرکز نور ہیں اور تمام کیریکٹر صرف پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ کسی کی کوئی خاص وقعت نہیں۔

پریم چند کے دیگر ناولوں میں آپ کو مکمل اور اثر انگیز سیرت نگاری کا اتنا صاف نمونہ مشکل سے کہیں ملے گا۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کسی ناول کا پورا پلاٹ پہلے سے اپنے دماغ میں طے نہ کرلیتے تھے بلکہ دورانِ تصنیف ہی انکے افراد کے کیریکٹر کا نشوونما ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے ان کے اکثر ناولوں میں پلاٹ اور ضمنی پلاٹ کا سلسلہ نہیں ہے۔ بلکہ متعدد پلاٹ علیحدہ حیثیت اور شان کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی

نتھی کر دیئے گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کے بیشتر ناولوں کو تقسیم کر سکتے ہیں، ہر پلاٹ ایک مکمل فسانہ بن سکتا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ پلاٹ کا اتحاد اور تسلسل ناول کے لئے لازمی ہے یا نہیں مگر میرا جی یہی چاہتا ہے کہ ایک دریا ہو جس میں بہت سی ندیاں آکر ملی ہوں تاکہ ہماری توجہ مرکزی شے سے ہٹنے نہ پائے

پریم چند کے یہاں دوسری کمی اس چیز کی ہے کہ تدریجی ترقی سے جذبات کا اپنی انتہا پر پہنچنا اور وہاں سے پھر سہولت کے ساتھ واپس ہونا۔ بہر حال ہم پورے طور پر حادثات اور انقلابات کے لئے تیار نہیں ہونے پاتے۔ اور شاید اسی کی بدولت ذہن میں کوئی وقفہ یا تعطل Suspence محسوس نہیں ہونے پاتا اور ہم اس لطف سے محروم رہ جاتے ہیں جو کیف کشمکش سے حاصل ہوتا ہے۔

بالاجی خاص کر اپنی اس زندگی میں فوق بشر یا تحت بشر نظر آتے ہیں۔ جب ان کی انقلابی تیاریاں ایک جنگل میں ہوتی ہیں تو اعتقاد اور جذبات سے الگ ہو کر ان کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔

اس ناول میں ایک چیز ایسی بھی ہے جسکی مثال شاید ہی اور کہیں مل سکے، (Telepathy) ٹیلیپتھی کہئے یا اثراندازی۔ بالاجی کے والد (جو اب رشی ہو گئے ہیں) چاہتے ہیں کہ بالاجی کو پہاڑوں کی گود سے رخصت کرنے سے پہلے ان کی قوتِ تحمّل کا امتحان لے لیں۔ مگر یہ امتحان کاغذ اور قلم یا زبان سے نہیں لیا جاتا بلکہ مسمریزم کی طرح معمول پر ایک خاص دماغی کیفیت طاری کر کے نفسیاتی ہیجان کی زہد شکن تصویریں بالاجی کو دکھائی جاتی ہیں جنکو دیکھکر انھیں ایکطرف بہشت معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اتھاہ غار اس نفسیاتی امتحان کی تشکیل اور اس کو ترغیب کی چلتی پھرتی زندہ تصویروں سے ایسا سجایا گیا ہے کہ جبتک ایک ہی سانس میں آپ پورے تین صفحے نہ پڑھ لیں آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ امتحان اصلی تھا یا ذہنی۔

افسانہ کا خاتمہ پریم چند کے یہاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ کملا کا انجام بالکل افسانوی انجام ہے۔ اور بے ربط۔ وہ زبردستی مار ڈالا گیا ہے، اس نظارے سے نہ تسکین ہی ہوتی ہے اور نہ عبرت ہی حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال پریم چند ہر جگہ اپنے (Villain) کی سیرت سے بھی مشترک کمزوریوں کے سہارے ناظرین کے دلوں میں ایک جذبۂ ہمدردی پیدا کر دیتے ہیں۔

بہرکیف اس ناول میں سرشاریت شرریت، چٹرجیت اور رسوائیت کا عجیب میل جول ہے ایثار کے معنے صرف تیاگ کے ہیں اور سپوت بیٹے کی پوری تفسیر بالاجی میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کی زبان بھی ناہموار، ثقیل اور مغلق ہے جا بجا فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ ساتھ ہندی سنسکرت کے انمل اور بے جوڑ الفاظ بھی ہیں بعض جگہ ایک ہی صفحے اور ایک ہی پیرا میں اور کہیں کہیں ایک ہی جملے میں یہ ہنگامہ نظر آتا ہے۔

(۲) غبن

اس کی زبان بھی کم ناہموار نہیں ہے۔ طوالت بھی ہے مگر اتنی نہیں کہ نگاہ یا ہوش پر بار ہو۔ مکالمہ میں سادہ گفتگو سے کام لیا گیا ہے جسمیں مصنّف کے جذبات اور اعتقادات کا جلوہ پوری تابانی سے نمایاں ہے۔ تعارف یا نفس شناسی کا کوئی پہلو باقی نہیں ہے۔ عورتوں کی خالص گفتگو میں وہ لہجہ وہ لوچ اور وہ مزہ نہیں جو فسانہ نگار عورتوں کے یہاں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ واقعات گو غیر فطری نہیں اور روزمرّہ کے بھی نہیں مگر بہت دلچسپ بنا دئے گئے ہیں گویا کسی نے کٹھ پتلیوں کو جادو کی چھڑی سے رقاصۂ فلک بنا دیا ہے مگر کہیں کہیں توازن کی کمی محسوس ہوتی ہے جیسے بوڑھے وکیل کے بعد رتن کی حالت، وارفتگیٔ شباب ایک ہی ٹھوکر میں رشک شیب بن گئی ہے۔ رما کا یکایک بھاگنا یا جالپا کی بعض حالتیں مبہم ہیں۔

تسلسل سے بھی گہرا تعلق نہیں صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے مختصر افسانے ایک ساتھ پرو دئے گئے ہیں اور ناول آپ سے آپ تیار ہو گیا ہے۔

پریم چند کی ایک خصوصیت مجھے اور نظر آتی ہے کہ اُن کی کسی ناول میں نہ رموز جنسی کے فلسفہ کی چھاؤں ہے اور نہ کہیں عریانی۔ دراصل فحش اور سوقیانہ انداز تحریر سے اُنکا دامن قلم کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ اسی کے ساتھ یہ کمی بھی محسوس ہوتی ہے کہ کہیں کوئی میاں بیوی مکمل طور پر مسرور نہیں دکھلائے گئے ہیں شاید ان کی رائے میں زندگی کا کوئی حصّہ ایسا نہیں ہے جسمیں صرف پھولوں کی کیاریاں ہوں اور کانٹوں کی روش نہ ہو۔

پریم چند کے یہاں قانون اور ضوابط و رسوم بھی بعض جگہ ادب اور شاعری کے شکنجے میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ان کی ناولوں کا انجام بھی ہیپّی اینڈ سا ہے۔ جیسے آج کل اکثر پردہ سیمیں پر ہر بدمعاش یکایک کسی دیوی دیوتا یا واقعہ کے اثر سے بالکل فرشتہ بن جاتا ہے۔ وہی حال پریم چند کے ناولوں کا ہے۔ رما کو دیکھئے یا زہرہ کو کوئی پہچانا نہیں جاتا،

(۳) گوشۂ عافیت حصہ اوّل

زبان نہایت ہموار، پیاری، بچیلی اور اتنی ستھری اور میٹھی ہے کہ فارسی خط میں اُردو اور ناگری حرفوں میں ہندی معلوم ہوتی ہے، ادھر چار پانچ برس سے پریم چند کی تمنا تھی کہ اُردو اور ہندی کے میل جول سے ہندوستانی زبان پیدا ہو، وہ دونوں زبانوں کے کامیاب لکھنے والے تھے اور سیکڑوں صفحے ایسے لکھ جاتے تھے جنہیں کوئی کٹھن بات آتی ہی نہ تھی۔ ابھی عموماً ہم کو ایسی زبان لکھنے میں ذرا محنت سے کام لینا پڑتا ہے پر تھوڑے ہی دنوں میں عادت ہو جائیگی ہم چاہیں تو ہندستانی ہی میں سوچیں گے اور اسی میں لکھیں گے۔ جو لوگ اُردو ہندی کو دو ہوا بند ڈبے سمجھتے ہیں وہ خطرناک راستے پر چل رہے ہیں، اصل میں دونوں

ایک ہیں، ہماری باہمی جنگ و جدل کی ایک یہ بھی چال اور ہماری غلامی کی ایک یہ بھی ادا ہے کہ ایک طرف فارسی عربی ٹھونس کر اُردو کو اجنبی بنایا جارہا ہے۔ دوسری طرف سنسکرت کے بھرمار سے ہندی بھول بھلیاں ہو رہی ہے۔ مگر اتنی اونچی اُردو اور اتنی پوتر ہندی دونوں زبانیں مٹ جائیں گی باقی رہیگی تو یہی ہندوستانی جس کو ہندو مسلمان دونوں محبت سے گلے لگا سکیں اور جس کی آؤ بھگت وہ سب قومیں کر سکیں جو ہندوستان میں بستی ہیں۔

گوشۂ عافیت کے مکالمے میں اُن کمزوریوں کی چھاؤں بھی نہیں ملتی جو دوسرے ناولوں میں نمایاں ہیں۔ خاص کر دیہاتی لہجہ اتنا سچا اور ایسا دلکش ہے کہ لکھنے والا معلوم ہوتا ہے عمر بھر انھیں لوگوں میں رہا ہے۔

سیرت نگاری بھی کہیں سے تشنۂ تکمیل نہیں، ہر سیرت اپنی جگہ مکمل ہے اور جیسے گفتگو میں نئی سیرتوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے اور اُن کا کچا چٹھا بھی معلوم ہوتا ہے ویسے ہی سیرتوں سے واقعات کا ربط و تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ اور حادثات کے لئے بیانیہ اور نفسیہ کی وہ بھرمار نہیں ہے مگر واقعات کے سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے، پریم چند کا مشاہدہ کتنا ہی وسیع نہ کیوں ہو اور اُن کی نظر کتنی ہی لامحدود ہو لیکن بعض واقعات وہ اس طرح لکھ جاتے ہیں جن میں نہ مادّی سچائی ہوتی ہے نہ افسانوی۔ مثلاً بالاجی کا ایک کرکٹ میچ میں کھیلنا ہیچ کے بیان سے کچھ تو ہنسی آتی ہے اور کچھ غصہ حالانکہ مصنّف نہایت متانت سے تصویر کھینچتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پڑھنے والے بالاجی کو براڈمین سے کم نہ سمجھیں۔

گوشۂ عافیت میں اس قسم کے ناہموار اور بے جوڑ واقعات نہیں ہیں تمام باتیں ایسی ہیں جو روزمرّہ ہماری زندگی میں ہوتی رہتی ہیں اور اسی شان سے ہوتی رہتی ہیں جس شان سے دکھائی گئی ہیں۔

پریم چند نے رشوت ستانی اور جبریہ رسوم کی بے لاگ تنقید کی ہے مگر وہ متعصب اور طرفدار نہیں ہیں دونوں پارٹیوں کی کمزوریاں، تصویر کے دونوں پہلو اور معاملات کے دونوں رُخ اس صفائی سے دکھائے ہیں کہ کہیں انصاف کا خون نہیں ہونے پاتا۔ کہیں جذبات کا بے جا جوش و خروش ہوا ہے نہ تخریب کی ٹھنڈی مشرقی وضعداری اور مغربی دنیا داری کا موازنہ بھی محض قوّت بیان سے نہیں بلکہ واقعات سے کیا گیا ہے اور ایسا کہ جگہ جگہ دونوں کی برتری نظر آتی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ پریم چند کو وطن اور وطن کی ہر چیز سے عشق ہے۔ یہاں کی تہذیب تعلیم، معاشرت سب کو دھبے داغ ہی نہیں سمجھتے بلکہ عربوں کی طرح یا قدیم یونانیوں کی طرح وہ اپنی تہذیب اور مدنیت کو ساری دنیا سے بہتر جانتے ہیں اور بہتر منوانا چاہتے ہیں اسی لئے کہیں کہیں اعتدال قایم نہیں رہتا۔

اس ناول میں انسانی نفسیات کا ایسا پاکیزہ مطالعہ ہے کہ سارا افسانہ علم النفس کا ایک دریا معلوم

ہوتا ہے، جذبات کے توازن میں وہی شان ہے جو رومن رولینڈ کی خصوصیات میں داخل ہے، میری رائے میں اس حصّہ کا ترجمہ یوروپین زبانوں میں ہو تو بہت مقبول ہوگا۔

اپنے اُصول کے خلاف پریم چند نے دوھوا گاتری اور گیان شنکر کو گھوڑا گاڑی میں گھر لوٹتے وقت جنسی ازاد کی شان سے پیش کرنا چاہا ہے مگر یہاں وہ صرف شاعر اور جذبات نگار ہو کر رہ گئے ہیں۔

گوشۂ عافیت حصّہ دویم

حصّہ اوّل جتنا بلند ہے دوسرا حصّہ اتنا ہی پست ہے جیسے بعض اوقات شعر کے ایک ہی مصرع میں پورا مفہوم ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا مصرع محض تکمیل ضابطہ معلوم ہوتا ہے یا یوں سمجھئے کہ کوئی آتشکدہ ٹھنڈا ہو چکے اور ایک دبی دبائی چنگاری پھونک کر بھڑکائی جائے۔ اقبال کے جواب شکوہ میں پھر بھی جان ہے، بہرحال ہمکو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند ایک ہی نشست میں جو کچھ سوچ کر لکھ لیتے ہیں وہ تو نہایت نفیس ہوتا ہے اور باقی یونہی بھرتی کے واسطے ہوتا ہے یا یوں سمجھئے کہ مختصر افسانوں میں وہ نہایت کامیاب رہتے ہیں اس لئے کہ ان میں شروع سے آخر تک ایک ہی جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ مگر ان کے طویل ناولوں میں ہم آہنگی۔ اتحاد اور روانی نہیں پائی جاتی۔

بھوت پریت فرشتوں اور روحانی ہستیوں کو پریم چند کے ناولوں میں اگر کہیں جگہ ملتی ہے تو توہمات کے گوشہ میں، ان تمام باتوں کو وہ وہم سمجھتے اور مٹا دینا چاہتے ہیں مگر حیرت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی معمولی انسان کو بھی گیان اور دھیان کے زیور سے سج دیتے ہیں تو اُن سے ایسی کرامات ظاہر کرتے ہیں جو معجزوں سے کم نہیں اور جنکی مانگ اس سائینس کے زمانے میں ہو ہی نہیں سکتی۔ سکھو چودھری کرتار کے ایمان کا امتحان لیتے ہیں تو کرتار کے چھوتے ہی روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی ٹھیکریوں کی تھیلی ہو جاتی ہے۔

اس حصّے کے واقعات میں بھی تنقید نے، فضول کی بکواس کا لباس پہن رکھا ہے، منوہر نے جیل میں خودکشی کر لی تو سارے عمّال پر قیامت آگئی!

وکیلوں کی بے اعتنائی اور بے اصولی کا مضحکہ بھی اصلیت سے دور ہے، اس حصّے کے مکالمے بھی کمزور اور روکھے پھیکے ہیں۔ مسلمانوں کی سیرت نگاری بھی ایسی ہے جیسے بنگال میں ساری عمر بسر کر دینے والا آدمی، حجاز، قسطنطنیہ، عراق یا ایران کے چشم دید حالات لکھے۔

بھیرو کا جادو جگایا جاتا ہے اور امتحانِ عمل کے وقت سگا بھائی ایک ہی وار میں اپنے بھائی کا سر اُڑا دیتا ہے اور پھر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس حصّہ پر نہ ہنسی آتی ہے نہ رنج ہوتا ہے۔

گائتری، رائے صاحب اور گیان شنکر کی اکثر تصویریں یا تو عقیدت کے نغمے ہیں یا نفرت کے مرقعے

ایسی ہستیاں صرف فسانہ نگار کے دماغ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہیں زندگی کے دن بسر کرتی اور وہیں فنا بھی ہو جاتی ہیں ہماری دنیا کے لئے وہ عجائبات سے کم نہیں ہیں۔

اس ناول کا انجام نہ تو Artistic (ادبی شان والا) ہے نہ اثر انگیز۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کو المیہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال گائتری کا انجام بالکل اجنبی سا ہے اور شردھا کی ضدیں بھی مناسبت سے بے نیاز ہیں۔

پہلے اور دوسرے حصہ میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا، پہلا حصہ ادبی جواہر ریزوں سے مالا مال ہے — گوشہ عافیت کے پہلے حصہ کے متعلق بعض نکات رہ گئے ہیں جنکا نہ لکھنا نقادانہ ایمانداری کے خلاف ہوگا۔

معلوم نہیں منشی پریم چند مالیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے یا نہیں مگر جب کبھی وہ کارخانوں۔ گھریلو مصنوعات، اور درآمد و برآمد کی جزوی باتیں لکھتے ہیں تو اس قدرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اصابت رائے اور وسعت مطالعہ کے سکے بٹھا دیتے ہیں۔

پریم شنکر امریکہ سے واپس ہوتے ہیں تو دیش سیوک ہو جاتے ہیں، بیوی سے محبت کے باوجود اجتناب کرتے ہیں اور وہ بھی صرف خاندانی رسم و رواج پر اپنی بے پایاں اُلفت کو ایک زمانے تک برباد کرتی رہتی ہے۔ مگر پریم شنکر کی سیرت سے جوش عمل بھی پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نفس کشی غار میں بیٹھنے کا نام نہیں بلکہ ترغیبات کا مقابلہ کرنا اور اس پر فتح پانا ہے۔ اس میں نام نہاد لیڈروں کا تبصرہ بھی نہایت پیارا ہے۔

ڈپٹ سنگھ کی موت میں ایسا دردانگیز پہلو ہے کہ دل بھر آتا ہے، بھگت کا مایوسی کے عالم میں بڑبڑانا، مورتی کو توڑنا اور پوجا کا سامان بکھیر دینا عبرت اور نصیحت کے لاجواب مرقعے ہیں۔

پریم چند کے یہاں دیہات کی مقامی گفتگو ہر جگہ مزیدار ہے اور گاؤں کے ذہنی حدود سے کہیں آگے نہیں بڑھنے پاتی اور ایسا کہیں نہیں ہے کہ لہجہ گنواروں کا ہو اور باتیں مصنف کی۔ معلوم نہیں کیوں مگر پریم چند کے یہاں ظرافت کی چاشنی بہت کم ملتی ہے، قہقہہ درکنار انبساطی کیفیت بھی نہ دل میں پیدا ہوتی ہے اور نہ دماغ میں اُن کے طنزیات زہر میں بجھے ہوئے نشتر ہوتے ہیں اور تمسخر اور استہزا سے نفرت سی پیدا ہوتی ہے۔

ہاں کہیں کہیں خوش مزاجی کی ہلکی ہلکی بیمار لہریں دکھائی دیتی ہیں جو گرد و پیش کی متین و مہذب تاریکیوں میں سما کر رہ جاتی ہیں، اور گدگدی درکنار طبیعت میں لہر بھی پیدا نہیں کرتیں۔

شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ خود منشی صاحب کی زندگی کانٹوں کی کیاری تھی۔ یا تو ہمیشہ مصائب کا شکار رہی یا اتنے بلند ہو گئے کہ مسرت و غم کے جذبات سے بالاتر اور بے نیاز ٹھہرے۔[1]

---

[1] ہمارے دوست کی یہ تشخیص درست نہیں کیونکہ حلقہ احباب میں منشی پریم چند ہمیشہ بات بات پہ ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔

(۴) پردۂ مجاز

اس میں Suspense (ذہنی کشمکش) نہایت پاکیزہ ہے، مکالمہ بھی زیادہ تر فطرت سے ہم آغوش ہے۔ واقعات البتہ بعض جگہ عجیب سے ہیں، گجر دھر ایسے استاد کا منورما سی کمسن لڑکی سے روپیہ لے لینا، اور پھر جگدیش کی رانی کا اسی وقت وہاں سے گزرنا ایک فسانوی اتفاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

ترک دنیا اور ترک علایق کی تعلیم سے پریم چند کا جی کبھی نہیں بھرتا، اعلیٰ اخلاقی معیار صرف سیرتوں اور حالتوں میں محدود نہیں ہیں ان کے لئے علیحدہ لکچر بھی دئے جاتے ہیں۔

Villain اور ہیرو (بدمعاش اور سورما) کی سیرتیں بعض جگہ نقطۂ تضاد سے اس قدر الگ ہو گئی ہیں کہ اکثر عناصر مشترک ہو گئے ہیں ورنہ عام طور پر پیٹینٹ قسم کے ہیں جن کی فطرتیں ایک دوسرے سے اتنی برعکس ہیں کہ پناہ نہیں ملتی۔ تکرار کہئے یا یکسانیت، ہر جگہ نمایاں ہے۔

پریم چند ایسے فطرت نگار کے قلم سے جب اواگون کے ثبوت میں، نامانوس اور عجیب واقعات نکلتے ہیں تو حیرت کی آنکھیں کھلی رہجاتی ہیں۔ جگدیش پور کے راجہ کے تین جنم اور ہر جنم کی پوری یادداشت عجیب ہے اور اس سے زیادہ عجیب پہاڑیوں کی تاریک گھاٹی میں وہ محل ہے جہاں چار ہزار برس آگے والے سائنس کے آلات اور مشینیں کثرت سے ہیں ایک ہوائی جہاز بھی ہے جس پر بیٹھ کر عاشق و معشوق چاند کی سیر کے لئے جاتے ہیں۔ بیوی کا دو مرتبہ اعادۂ شباب بھی ڈاکٹر ورناف کے تجربات پر چشمک زنی کرتا ہے مگر ان تمام واقعات کی تہ میں نفسیات کی تصویر کشی اور تشنہ کام شباب کا سیراب نہ ہونا نہایت کیف انگیز ہے۔

منورما کی سیرت گرگٹ کے مشابہ ہے۔ قربانی کے ہر پہلو نے اس کی کایا پلٹ کر دی ہے خود ہیرو چکر دھر کی سیرت نگاری ایسی پاکیزہ نہیں ہے کہ لوگوں کی انگلیاں نہ اُٹھ سکیں۔

ربط و روانی پہلے حصہ میں کچھ زیادہ ہے مگر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ رانی دیوپریا کا کیرکٹر صرف انسان نما فرشتے سمجھ سکتے ہیں ہم جیسے سادہ انسانوں کے بس سے باہر ہے۔ خاتمہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابھی بہت کچھ لکھنا تھا مگر مصنف نے گھبرا کر ختم کر دیا۔

(۵) بازارِ حسن

سیوا سدن اس کا بڑا پیارا نام ہے۔ معلوم نہیں ایک ننھی منّی سی کہانی میں کہاں سے اتنی سمائی گئی۔ اس کے کیرکٹر زیادہ تر مرقع ہیں۔ دنیائے دل اور جہان دماغ کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ زبان زیادہ ناہموار نہیں ہے۔ مگر اثر بہت خوشگوار ہے اور دلچسپی اتنی زیادہ ہے کہ گار دحسن بکنے اور سزا اردو

کی تصویریں نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔

سیوا کا جلال، شکوہ عظمت اور مآل دیکھ کر بے ساختہ اُمنگ اُٹھتی ہے کہ کاش ہم بھی ایسے ہی ہوجاتے۔

ناصحانہ رنگ کہیں کہیں بہت شوخ اور مذاق فہمائش نہایت خشک ہوگیا ہے۔ مکالمہ اور نفسیہ میں دوسرے کا پایہ کافی سنگین ہے۔

خود مصنف بھی کہیں کہیں ثالث بن گئے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم خاموش سینما کے پردوں پر آج سے دس برس پہلے والے بڑے بڑے تشریحی بورڈ دیکھ رہے ہیں۔

(۶) نرملا

پریم چند کی بلندیوں کے سامنے عرش بھی پست نظر آتا ہے اسی طرح ان کی پستی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ نرملا اور نرملا کے خاندان کی ساری مفروضہ ٹریجڈی ایسی اَنہونی مصیبتوں کا مجموعہ ہے جسکی مثال حیاتِ انسانی کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیگی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہستیاں چند سادہ نقوش تھیں جو ابھریں تو ایسی کہ سطح پر بلند نہ ہوئیں اور مٹیں تو یوں کہ کہیں کوئی چھاؤں بھی باقی نہیں۔ اس حریم سادہ میں ہمدردی اور دُکھ کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ جمنا بائی (اداکار) کی سادہ صورت کی ایک تصویر یہ بھی ہو جس کا اصلی حُسن یہ سمجھا جاتا ہے کہ چہرے مہرے اور خد و خال پر جذبات و محسوسات کا کوئی اثر ظاہر ہی نہ ہو اور یہ شاہد اَدب بھی سادگی کی جان ہو جس کے بگاڑ میں ہزار رنگ کی سنوار چھپی ہوئی ہو مگر جو آنکھیں برقی قمقموں کی تیز روشنی کی عادی ہوں اور یکایک دھندلکے کی طرف دیکھیں تو سپیدی کی ہلکی ملاوٹ بھی اندھیرے کو نپٹ اندھیاری بنا دیتی ہے۔

اس کا مکالمہ بھی کہیں کہیں بے نمک اور طویل ہے اور شوخی اور حلاوت کی جگہ بے نمکی اور بے مزگی ہے۔

(۷) بیوہ

ناول نہیں ہے ایک طویل سا مختصر فسانہ ہے، فن اور اُصول والے صرف طوالت کی بنیاد پر اسے ناول نہ کہیں گے مگر اس کی نفسی خوبیوں کے سامنے بڑے سے بڑا نکتہ چین بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس قصّے کا کوئی واقعہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں جو روزانہ کی زندگی سے الگ تھلگ ہو، ہاں فسانہ نویس کی گلکاری نے ذرا ذرا سی بات میں کوٹ کوٹ کر موہنی بھردی ہے۔

دان ناتھ اور پریما کی زندگی وہی ہے جس کا نقشہ کم و بیش ہندوستان کے ہر تیسرے گھر میں آسانی سے نظر آئیگا۔ خلش پر حیات کا دار و مدار ہے ورنہ انسان مشین بن کر رہ جائے جیسے نمک کے بعد چینی اور چینی کے بعد نمک کا مزہ کچھ اور ہوجاتا ہے ویسے ہی شادی شدہ زندگی میں ذرا سی کھچاوٹ اور ذرا سی لگاوٹ بھی حیات کے آئینہ کو نئی جلا دیدیتی ہے۔

پورنا کے پتی کا گنگا میں تیرتے ہوئے ڈوب جانا کوئی نئی بات نہیں ہے نہ اسمیں کوئی انوکھاپن ہے لیکن کنول کی لاگ بیوی کی محبت اور جستجوئے مہلک کی وہ پاکیزہ تصویر کشی کی گئی ہے کہ ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے گنگا کے کنارے کھڑے ہوئے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے ہیں اور ایک جوش سا پیدا ہوجاتا ہے کہ غضبناک لہروں میں کود کر ڈوبنے والے کو بچالیں مگر امرت رائے کے بدھوا بیاہ سے متفق ہوتے ہی اس واقعہ کا ہوجانا اپنے دامن میں افسانوی آمد کی نہیں آورد کی سی شان پیدا کر دیتا ہے۔ پورنا خود بھی رسمی بیوہ نہیں ہے جو اکثر مکرر شادی کے فدائیوں کے صفحوں میں جلوہ ریز نظر آتی ہے۔

حیرت یہ ہے کہ بیوہ فسانے کا نام بھی ہے اور بیوگی کا بیان بھی طوالت کے ساتھ ہے، دوسری شادی کی تحریک بھی ہے مگر خود بیوہ ہیروئن نہیں ہے۔

امرت رائے تیاگی اور مجرد نوجوان ہیں اور ہیرو پرستی کی پوری شان سے آراستہ نظر آتے ہیں۔

بیوہ کا خاتمہ البتہ "موتیوں کے جزیرے" کی طرح نہایت ادیبانہ، شوخ، کیف افزا ہے اگر ایکطرف یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ کیف و سرور مکمل نہیں ہوا اور خدا جانے امرت رائے اور پورنا کا کیا حشر ہو تو اسی کے ساتھ اس خیال سے تسکین ہوجاتی ہے کہ کم سے کم واقعات کی بھنور سے دونوں کی کشتی نکل گئی۔

ناول کا حاصل صرف اتنا ہے کہ آدمی سچا اور دھن کا پکا ہو تو ہزاروں مصیبتیں جھیل کر بھی تنہا قوت بازو سے ایک چھوٹا موٹا سا انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔

بدھوا آشرم اگر یہی چیز ہے جو بیوہ کے صفحوں میں جلوہ افروز ہے تو اس قسم کے ادارے ہندوستان کے لئے نہایت ضروری اور مفید ثابت ہوں گے۔ پریم چند کی انصاف پسندی کی ایک جھلک اس سے بھی ملتی ہے کہ "گنڈوں" سے پست اخلاق رکھنے والے مرد بھی، فطری خوبیوں سے بالکل عاری نہیں ہوتے۔ چھپے ہوئے جواہر ریزوں کی نمایش اس خوبی سے کی گئی ہے کہ مشاہدہ انسانی قلم کے بوسے لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے زبان بہت سجل اور پاکیزہ ہے، ہندی کے شبد اور فارسی کے الفاظ دونوں کثرت سے مگر بڑے حسن سے استعمال ہوئے ہیں۔

(۸) چوگان ہستی

اگر پریم چند نے اپنی ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں کی صف میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ برنرڈ کی جسارت، رسل کی آزادی، ڈکنس کی غربت نگاری، گالزورذی کا ساطنزیہ تبسم، ڈوما کی نقشہ کشی، راشد کی ٹیسیں، نظامی کی سادگی، نعیمی کی عظمت، شرر کا جوش، رسوا کی معنویت اور ٹیگور کی لطافتیں اگر ایک جگہ اور پورے تناسب کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس

ناول کی سیر کیجئے ۔شاید یہی وجہ ہے کہ چینی جاپانی ، مرہٹی، جرمنی اور ہندی سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔

"World is a theatre" اور "Life is a stage" ایسے کامیاب ناول بھی اس کے ساتھ تولے جائیں تو شاید ہلکے ٹھہریں۔

اندھا سورداس، جاہل ناکارہ بھکاری، بے بس، کیا کچھ نہیں مگر ہزار صفحے کے ناول کا ہیرو ہے اور ایسا کامیاب ہیرو کہ مقبول ناولوں کے مختلف ہیرو اس کے سامنے نہیں جچتے ، اردو ناول کا یہ پہلا قدم ہے جہاں فطرت اور اخلاق نے رسمی شان وشکوہ کو ٹھکرا دیا ہے اور جہاں "درد" اور "خدمت" کو اسکی اصلی جگہ ملی ہے۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں بھی ہیں اور زوربیان کا لطف بھی ہے۔اس کی ہر چیز اثر سے بھری ہوئی ہے۔طوالت ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناظرین کا کہیں سے دم گھبرانے پائے۔لفظ یہی ہیں جو ہم آپ ہر وقت بولتے ہیں، پر جوہری کے ہاتھوں میں انکا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ایسے نگینے بن گئے ہیں جنکے ہر رُوے سے نئی جوت نکلتی ہے۔

(۹) میدان عمل

عدم تشدد، ترک موالات اور ستیاگرہ کی پوری تاریخ اس کے صفحوں میں بند کردی گئی ہے۔ناول کیا ہے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک کے ہندوستان کی تمام تحریکوں کی ایک پُر کیف داستان ہے جس نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔اسکے لئے قندمکرر کا لطف ہے اور جس نے دیکھا ہی نہیں اس کے لئے اس زمانہ کے تاریخ وتمدن کا زندہ مرقع ہے۔

اس ناول کی جادوبیانی بالکل ویسی ہی ہے جیسے اسٹیج پر کھیل یا کسی بازیگر کا تماشہ، وہ جوش وہ زور اور وہ اثر نہیں جو گوکھلے، لاجپت رائے، محمد علی، گاندھی یا جواہر لال کی تحریر وتقریر میں ہوتا ہے۔

اسکی سیرت نگاری تشنہ ہے۔آمر کا کیریکٹر کہیں کہیں بہت پاکیزہ ہے لیکن محرک تقلید نہیں سلیم سکینہ اور کالے خاں کی سیرتیں فسانوی نزاکتوں اور شاعرانہ لطافتوں سے مالامال ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور نظر فروز ضرور ہے زبان اتنی اچھوتی ہے کہ دل میں اُتر جاتی ہے۔

سیرت نگاری، آغاز، انجام، اتحاد، ربط، پلاٹ کی عمدگی، ذہنی تعطل، ظرافت، ہنگامہ آرائیاں، منتہا، تدریجی ترقیاں، جذبات کا توازن، اعتدالی نزاکتیں سب کچھ اتنی نفاست کیساتھ اسمیں موجود ہیں کہ اگر ذرا بھی تفصیل سے کام لوں تو شاید جتنے صفحے ابتک لکھ چکا ہوں اتنے ہی صفحے اور لکھنا پڑیں اور پھر بھی تسلی نہ ہو۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اُردو ناولوں سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو کم سے کم اسے ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ درحقیقت اس کی زبان، طرز بیان، فنی خوبیاں اور اثر انگیزی اس قابل ہیں کہ ہر چیز پر تفصیلی نظر ڈالی جائے مگر اس وقت یہ مزید طوالت کا باعث ہوگا۔

منشی پریم چند کا اُپدیش

(از سید مقبول حسین صاحب احمد پوری، بی۔ اے، ایل ایل بی)

ہندوستان کی تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں جس میں مصلحانِ قوم کا وجود نہ ہوا ہو۔ اس ملک کی ہر زبان شاعری، قصص اور اخلاقیات سے مالا مال رہی ہے۔ ڈراما اور ناول لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی، مگر اُردو زبان اور خصوصاً ہندی بھاشا میں تو ان کی بڑی کمی ہے۔ اُردو میں سرشار اور نذیر احمد کے بعد شرر پر نظر پڑتی ہے۔ ہندی میں یہ بھی نہیں۔ ایک منشی پریم چند البتہ اخلاقیات کے حامل اور ذہنی ارتقار کے پیام بر نظر آتے ہیں اور حقیقت میں ان کا وجود اس دورِ خلفشار کے لئے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پریم دھاراؤں کا سنگم تھا۔

منشی صاحب ناول اور افسانہ نگاری میں جو مہارت رکھتے تھے اس کا مقابلہ اردو یا ہندی میں بہت کم لوگ کر سکے۔ اخبار پانیر میں ایک نقادِ فن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کے متعدد ناول انگریزی زبان کے کامیاب ناولوں کے ہم پلہ ہیں۔

سطورِ ذیل میں مقابلہ و موازنہ سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک کامیاب اوسٹ کے آہنگ و انداز سے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے یہ خیال ضرور ظاہر کر دینا چاہیئے کہ افسانہ اصل ناول کا ایک دلچسپ خاکہ ہے۔ اگر محاورۂ زبان اجازت دے تو اس کو "ننھی ناول" کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً منشی صاحب کا افسانہ "نیک بختی کے تازیانے" جو ان کی تصنیف "فردوسِ خیال" کی ایک کڑی ہے تھوڑی سی وسعت کے ساتھ ایک کامیاب ناول بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے پلاٹ طربیہ پہلو حزنیہ انجام کا ذریعہ ہو کر ایک دلچسپ ٹریجڈی بہم پہونچا سکتا ہے۔ افسانہ کا خاکہ بھی نہایت یدافزا اور دلچسپ ہے۔ مثلاً رائے بھولا ناتھ نامی ایک دولتمند آدمی ہیں۔ ان کا نوکر نتھوا نامی لڑکا تھا۔ رائے صاحب کی بھولی بھالی لڑکی رتنا کے کمرے کی صفائی کیا کرتا اور کبھی کبھی اس کے ساتھ یلا کرتا۔ ایک دن نتھوا کے جی میں کچھ ایسی سمائی کہ رتنا کے پلنگ پر چادر تان کے سو گیا۔ رائے صاحب

ا یہ مجموعہ گیارہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

نے انہیں اِس حرکت کو دیکھ لیا، مارے کوڑوں کے غریب تھتھوا کا کچومر نکال دیا۔ بیچارے نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ رتنا کی میم صاحبہ نے جو اس کی ٹیوٹرس تھیں اس کو مسیحی مشن میں چلنے کی ترغیب دی۔ مگر وہ کرسٹان ہو جانے کے خوف سے نہ گیا۔ بھنگیوں میں جا کر گانا بجانا سیکھنے لگا کسی اُستاد نے اُسے پکا کر دیا، گوالیار میں کوئی موسیقی کانفرنس ہونے والی تھی تھتھوا نے وہاں جا کر اپنے جوہر دکھائے اور مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ سب سے اونچی سند حاصل کی حتّٰی کہ اپنے اُستاد کے ساتھ یورپ کا سفر بھی کیا اور مغربی علم موسیقی پر بھی تھوڑا بہت عبور حاصل کر لیا۔ اب کیا تھا بابو ناتھو رام سوئٹی کا زیور ہو گئے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ لکھنؤ بھی آئے، یہاں اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ رتنا نے پھول مالا پہنائی، رائے بھولا ناتھ سے بھی ملاقات ہوئی اور رائے صاحب نے اپنی صاحبزادی کا عقد اُستاد ناتھو رام میوزک ماسٹر سے کر دیا۔ قدرت نے رتنا کے پلنگ پر لیٹنے سے تازیانے بھی لگوائے اور پھر رتنا ہی کو ان کی لونڈی بھی بنا دیا۔ شادی کے ایک مہینہ بعد اُستاد ناتھو رام نے رتنا سے کہا کہ اگر تم میری حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ تو ابھی شرمندگی اور غم سے نڈھال ہو کر رونے لگو۔ رتنا نے کہا "میں سب جانتی ہوں لیکن رائے صاحب سے نہ کہیئے گا ورنہ زہر کھا لیں گے، میں نے تو جان بوجھ کر تمھیں اپنایا ہے۔"

مندرجہ بالا افسانہ کو وسعت دینے کے دو طریقے ہیں:۔

اول یہ کہ تھتھوا کو مشن بھیج دیا جائے اور وہاں کسی لڑکی کو تھتھوا کی بچھڑی ہوئی بہن وغیرہ ثابت کر کے ناول کا رُخ ہی بدل دیا جائے یا اس کی ٹریجڈی بنا کر تھتھوا کا حال رائے بھولا ناتھ پر رتنا کی شادی کے بعد ظاہر کر دیا جائے۔ اس طرح نئے واقعات کا اضافہ ہو سکتا ہے، اور ناول کو کامیڈی سے ایک کامیاب ٹریجڈی کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

منشی صاحب چاہتے تو انہیں افسانوں کو ناول کر دیتے مگر حیاتِ مستعار پر کسے اعتبار وہ خلاصہ لکھ گئے تاکہ آنے والے نقادانِ معاشرت کو آسانی ہو۔

ناولسٹ یا افسانہ نگار کی حیثیت سے منشی صاحب مرحوم کا مطمح نظر مندرجہ ذیل صورتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے، یعنی :۔

ا۔ حسن اعمال اور حسن اخلاق کو مجاز سے حقیقت کی طرف لے جانا اور اس طرح کرم یا کو دھرم یا ایمان سے ہم رشتہ کرنا۔

معیار انسانیت، نہ کمال تک پہونچانے والے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈالنا۔

۴۔ محبت وطن اور آزادی کے پیام سے مذہبی اور معاشری تعلیم بہم پہونچانا۔
مرحوم نے مندرجہ بالا مطمح نظر کو جس انداز سے ظاہر کیا ہے، اس کے رنگ و آہنگ میں بڑے مزے کا اختلاف ہے۔ کہیں دیانت کی تعلیم ہے، کہیں بھگتی کی، کہیں اخلاقیات کی زیادتی ہو کہیں علم النفس کی، کہیں رنگِ فطرت کا غلبہ ہے، کہیں حقیقت و مجاز کا امتیازی پہلو، کہیں یگانگت و اتحاد کے گیت ہیں کہیں فرقہ وارانہ نوک جھونک اور بات بات میں تضادِ ملیح نے دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اُردو ہندی نے شیر و شکر ہوکر وہ لطف پیدا کر دیا ہے جو اُردوئے معلیٰ اور ٹھیٹھ بھاشا کو کبھی نصیب نہیں ہوسکتا اور لطف یہ کہ ظرافت کے تبسم کے ساتھ موسیقی کی ملاحت بھی ہے اور نغمۂ روح کا لحن بھی۔ ناول سے قطع نظر کرکے ایک ناکامیاب ڈرامے کے متعلق خود منشی صاحب کا یہ خیال ہے کہ اس میں

"کہیں جذبات ہیں تو زبان نہیں، زبان ہے تو جذبات نہیں، ظرافت ہے تو گانے نہیں اور گانے ہیں تو ظرافت نہیں، جب تک یہ چاروں ارکان پورے نہ ہوں اُسے ڈراما کہنا ہی بیکار ہے[۱]"

ذیل میں ہم منشی صاحب کے چند ناولوں اور افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر ان کا مقابلہ انگریزی وغیرہ کے ناولوں سے کرتے ہیں۔ اِس بحث سے متعلق ہمارے کئی عنوانات ہونگے، یعنی روحانی پہلو، اصلاحی پہلو، عملی پہلو، فرقہ وارانہ پہلو، فنی موشگافیاں اور انتخاب۔

(۱) روحانی پہلو۔ روحانیت کا علم آجکل خارج از قیاس ہوتا جاتا ہے۔ اب لوگوں کو یہ کہنے میں بہت کم پس و پیش ہوتا ہے کہ روح میں نہ کوئی قوت ہے نہ تاثیر، خیال سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یہ تو برائے نام ایک نظریہ ہے، لیکن درحقیقت اِس قسم کی تشکیک ہی روح کی حقیقی پہچان کا ذریعہ ہے، روح کو حساس ماننے کے لئے صرف یہ دلیل ہی کافی ہے کہ جسمانی تکالیف کی طرح روحانی تکالیف بھی ہوا کرتی ہیں۔ روحانی تکلیف کا احساس انسان کے دل کی وہ ندامت ہے جو ارتکاب معصیت کے بعد محسوس ہوتی ہے اور یہ مؤخرالذکر تکلیف کبھی کبھی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان رو پڑتا ہے۔ جسمانی تکلیف کا علاج تو دوا سے ہوجاتا ہے مگر اس روحانی تکلیف کے علاج کو بڑے ریاض اور تپسیّا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں ضمیر کی آواز لعنت ملامت کرکے اپنی نوائے لاہوتی سے ایک طرح کی ڈھارس ضرور باندھ دیتی ہے کہ "باز آ"

[۱] ڈیانسٹریشن۔ ہمایوں جنوری ۱۹۳۲ء

ہر وہ شخص جو دنیا میں پاک زندگی اور عمل نیک کا خواہاں ہو اُس کی آزمائش کارکنانِ قضا و قدر بڑی سختی سے کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا کرکے اور اُن کے جان و مال کو خطرے میں ڈال کے آزماتا ہے کہ آیا تکالیف کی حالت میں وہ خدا کو بھول جاتے ہیں یا یاد رکھتے ہیں۔ اِس کی تمثیل حضرت ایوبؑ پیغمبر کے قصّے کا پلاٹ ہے۔ آزمائش کا سب سے بڑا ذریعہ جس کا اکثر جگہ ذکر کیا گیا ہے شہوانی جذبات ہیں۔ اِن جذبات کو قابو میں رکھنے کا انعام مصر کی سلطنت اور آلِ عمران میں ابن مریمؑ ہیں۔ قرآن شریف کا وہ دلچسپ افسانہ جو یوسفؑ و زلیخاؑ کی طرف منسوب ہے اِسی آزمائش کی تشریح ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسے افسانے یا ناول ہونگے جن کے پلاٹ کا مقصد شہوانی جذبات کو قابو میں رکھنے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ آزمائشی اسباب سے ہی آدم اور ابلیس کی داستان شروع ہوئی اور آزمائش ہی ہمارے وجود کی غرض و غایت ہے۔ مغربی ناولسٹ میری کوریلی کے متعدد ناول اسی غرض و غایت کی تفسیر ہیں۔ اس کا ایک ناول "شیطان کا غم و الم"[1] اِس آزمائشی پہلو کی ایک دلچسپ تمثیل ہے، جس کا خاکہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے:

"ایک مفلس ادیب اپنی تصانیف کی اشاعت کے لئے اپنی مالی حالت مضبوط کرنا چاہتا ہے وہ دولت کا شلاشی ہے اپنے نزدیک اُس نے دل کا مخلصانہ پیام اپنی کتاب کے ذریعہ سے سب کو پہنچا دیا ہے۔ لیکن خدا اور اُس کے وجود کا وہ قائل نہیں۔ اس کے پیام کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا، کیونکہ بوجہ ناداری وہ اپنی تصانیف کو عوام تک نہیں پہونچا سکتا۔ ایک نامعلوم شخص جو خود کو شہزادہ کہتا ہے مالی امداد پر آمادہ ہوکر اُسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ ادیب اسی دوران میں اپنے کسی دولتمند رشتہ دار کی جائداد ترکے میں پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرتِ زر اُسے حسن و عشق کی طرف لے آتے ہیں اور لکھ پتی ادیب ایک عالی خاندان مگر مفلس لارڈ کی لڑکی سے شادی کرتا ہے، مگر وہ لڑکی مذکورہ بالا شہزادہ پر جان دیتی ہے۔ یہ راز ادیب پر ظاہر ہوجاتا ہے، اور وہ شہزادہ سے جواب طلب کرتا ہے۔ زمیندار کی لڑکی اس بات پر خودکشی کرلیتی ہے۔ لکھ پتی ادیب بھی روحانی اور دماغی خلفشار میں مبتلا ہوکر خودکشی پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ شہزادہ ادیب کو ایک کمرے میں جو جہاز پر ہے بند کردیتا ہے۔ سمندر طوفانی ہواؤں کی کشمکش پچھاڑ سے ہانپ رہا ہے۔ لکھ پتی ادیب زور لگاکر کمرہ کھول دیتا ہے شہزادہ

[1] ناول Sorrows of Satan.

کو سر سے پیر تک دیکھکر کہتا ہے کہ میں تو تمھیں اپنا دوست سمجھتا تھا۔ شہزادہ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ نہیں میں تمھارا دشمن ہوں، تم مجھ سے کتنی ہی دوستی کرو میں دشمنی سے باز نہ آؤنگا۔ ایسی حالت میں لکھ پتی ادیب کو خدا یاد آتا ہے، شہزادہ اپنے آپ کو ظاہر کر کے کہتا ہے کہ پہچانو میں وہی ہوں جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔ اسی رو میں شہزادہ (یا شیطان) اس لکھ پتی ادیب کو عالمِ ناسوت کی سیر کراتا ہے۔ وہاں جہاز ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ لکھ پتی ادیب ایک بہتے ہوئے تختے پر سمندر کے آغوش میں موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے۔ اُسے ایک غیبی آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ " اسے دوبارہ دنیا کی اندھیر نگری میں چھوڑ دو تاکہ نئے سر سے ظلمت میں خدا کے نور کو تلاش کر سکے "

منشی صاحب نے میری کوریلی کے اس آزمائشی پیام کو کئی جگہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے ایک ہندی افسانہ " پالاگن " میں وہ لکھتے ہیں کہ " لابھ کی ترشنا کبھی شانت نہیں ہوتی، پرنتو اس ترشنا میں شانتی چھپی ہوتی ہے۔" اس کا ثبوت منشی صاحب نے اپنے ناول "پردۂ مجاز" میں دیا ہے جس میں تین کیریکٹر قابلِ غور ہیں۔ منورما جاہ وحشم پر جان دیتی ہے، رانی دیو پریا ابدی جوانی اور حسن پر دیوانی ہے اور ہرشپور کے راجکمار اندر کرم سنگھ جو محبت کی آرزو سے چھٹکارا نہ پا سکے محبت کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ کھری مکتی اور کامل نجات کے لئے محبت کو بھی تج دینے کی ضرورت ہے۔ "پردۂ مجاز" کی دو جلدیں ہیں، پہلی جلد تو ایک معمولی سی تمہید ہے، دوسری جلد میں وہ سب کچھ ہے جس کے لئے پہلی جلد میں بطور دیباچہ مواد مہیا کیا گیا ہے۔ اس ناول کا دوسرا نام " آواگون " بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اصل میں مسئلہ تناسخ پر ایک دلچسپ تبصرہ ہے۔ منشی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر واقعی پریم سے مکتی حاصل ہو سکتی ہے تو اس کا ذریعہ شہوت کشی ہی ہے۔ ناول کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی صاحب ویدانت فلاسفی پر کافی عبور رکھتے تھے۔ اور اُپنشدوں کی حکایتیں اُن کے دماغ میں محفوظ تھیں۔ ناول کے پلاٹ کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی، اور مجازی، روح اور جسم کی طرح یہ دونوں پہلو ساتھ ساتھ رکھے گئے ہیں۔ ناول کا مجازی رُخ دنیاوی جاہ وحشم سے متعلق ہے، اس کا حقیقی رُخ پریم کی راجدھانی سے تعلق رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس ناول کے پلاٹ کی بنیاد میر صاحب کے اس شعر پر ہے ؎

---

۱ دیکھئے "مادھوری" لکھنؤ

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا تم کو وگرنہ تم خدا تھے گر دلِ بے مدّعا ہوتے

ذیل میں ہم پلاٹ کے صرف حقیقی رُخ کا خاکہ پیش کرتے ہیں کیونکہ یہی ناول کی جان ہے دوسرا رُخ تو محض جسیم ہے :-

"جگدیش پور کی رانی دیوپریا کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، مگر رانی کی ہوس یا آرزو یہ تھی کہ ایک بار پھر جوانی کے مزے اڑاتی، کیونکہ دیوتا بھی یہی بردان مانگتے ہیں کہ پیری کی بلا کبھی اُن کے سر نہ آئے۔ بھادوں کے مہینے میں ہرشپور کے راجکمار اندر بکرم سنگھ کی دعوت تھی۔ دیوپریا کو اپنے بڑھاپے پر بڑا افسوس ہوا، اُس نے مصنوعی روغنیات سے خود کو آراستہ کیا اور تھوڑی سی اکسیر پی لی جس سے آنکھوں میں شباب آور سرخی دوڑ گئی۔ راجکمار سے ملاقات ہونے پر بڑے ناز و انداز دکھائے۔ دیر تک آنکھوں کے ذریعہ سے پیامِ عشق کا تبادلہ ہوتا رہا یہاں تک کہ رانی نے محسوس کیا کہ اکسیر کا اثر زائل ہو رہا ہے۔ جب پیری کے ضعف کا بہت غلبہ ہوا تو رانی رو پڑی اور شرم سے منہ چھپا لیا۔ راجکمار نے کہا کہ دیوی مجھے تمھاری اسی صورت سے محبت ہے۔ میں وہ چیز چاہتا ہوں جو اس صورت کے پردے میں چھپی ہے، ذرا مجھے غور سے دیکھو، مجھے پہچانتی ہو، کبھی دیکھا ہے۔ رانی نے حیرت میں آ کر راجکمار کے چہرے پر نظر ڈالی، آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ ایک وارفتگی کے عالم میں دیوپریا نے کہا "پران ناتھ کیا تم اس شکل میں؟" کیا کوئی انسان بھی مجاز کی اتھاہ تاریکی کو یوں چیر سکتا ہے؟ زندگی اور موت کی درمیانی خلیج کا پار کرنا تو دیوتاؤں کا کام ہے۔ راجکمار نے کہا کہ رانی کچھ دنوں کے لئے موت نے مجھے تم سے جدا کر دیا تھا۔ میں فضائے بسیط کے لامتناہی خلا میں اُڑتا رہا۔ دفعتاً ایک دن غائب ہو گیا جب ہوش آیا تو راجہ ہرشپور کا نوزائیدہ لختِ جگر تھا مجھے مانسرور تال پر ایک مہاتما کے درشن ہو گئے۔ ان کی تعلیم سے ہستی کے وہ اسرار جن پر ابتک پردہ پڑا ہوا تھا مجھ پر کھل گئے، مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میری بیوی جگدیشپور میں ہنوز زندہ ہے۔ چنانچہ تمھارے پاس جگدیشپور آخر میں آ ہی گیا گو ہمارے سوامی جی نے منع کیا تھا غرض راجہ اپنی رانی دیوپریا کے عشق کو نہ چھوڑ سکا باوجودیکہ اس کو رشیوں کا بردان حاصل تھا اور وہ علم غیب جو اُسے تھا اس علم سے دوسرے محروم تھے۔ راجہ کی محبت نفس کی آلائشوں سے پاک نہ تھی۔ وہ حتی المقدور ان آلائشوں سے دور رہنا اور بھاگنا چاہتا تھا، مگر یاس کی پیاس اور ترشنا کی تیزی اُسے بار بار آزمائشی دنیا میں کھینچ لاتی تھی۔ ناول میں اس قسم کے

ڈو آزمائشی دَور دکھائے گئے ہیں، ہر دَور میں راجہ نیا بَرن لیتا ہے اور اپنی غیبی قوت سے رانی کی عمر کو تبدیل کر کے حسن و شباب کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے، مگر خود کو اس سے دُور رکھتا ہے۔ پہلا آزمائشی منظر ایک کوہستانی غار کی چٹان پر ہے۔ راجہ مہندر یعنی راجکمار رانی دیو پریا کے ساتھ یہاں یوگ کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، رانی بھی ریاضت و خدمت اپنا شعار بناتی ہے۔ راجہ کی کشیدگی سے رانی کو اُلجھن ضرور ہے کیونکہ وہ شباب کی نعمت پانے کے بعد اس پھول کے پھل کی بھی متلاشی ہے لیکن راجہ کا مقصد محض خوشبو کو برقرار رکھنا ہے لیکن مایا کے سمندر میں تختہ بند ہونے کے بعد تر دامنی سے بچ کر نکل جانا تو آزمائش کی بڑی دشوار منزل ہے۔ راجہ مہندر رات کو یوگ ابھیاس کرتے ہیں، نہ جانے کب اور کہاں جاتے ہیں اور کیسے اچانک چلے آتے ہیں۔ آخر ایک دن رانی دیو پریا نے کہا کہ تم نے میرا ظاہر بدلا تھا تو باطن بھی بدل دیا ہوتا۔ راجہ بولے یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔ رانی چُپ ہو گئی، سمجھی کہ پہلی فروگذاشتوں کی وجہ سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ ایک دن راجہ کی طبیعت میں ولولہ پیدا ہوا جی میں جوانی کی اُمنگ ہچکولے کھانے لگی۔ راجہ نے کہا کہ دیوی چلو آج عالم بالا کی سیر کریں راجہ صاحب رانی دیو پریا کو ایک بِمان پر بٹھا کے بلند ہوئے، جو تارے زمین پر ٹمٹماتے نظر آتے تھے وہ اب چندر ماں ہو گئے تھے، اور چندرماں اپنی وسعت سے دس گنا بڑا نظر آتا تھا کائنات پر کامل سکون تھا، نور کی سنہری بارش ہو رہی تھی، دیو پریا کے کان میں ایک لاہوتی نغمے کی آواز سنائی دی۔ راجہ نے کہا کہ ہمارے سوامی ایشور کی مدح میں گانا گا رہے ہیں۔ راجہ نے دیو پریا سے ایک گیت گانے کی فرمائش کی۔ دیو پریا نے بینا اُٹھائی اور نہایت سہانے سُر میں گیت گایا۔

"پریا ملن ہے کٹھن باوری"

راجہ کے دل میں ایک بیتاب خواہش جس میں جنون کی شدت تھی بیدار ہو گئی، راجہ نے کہا

جوانی سے صبر کی سخت جانی — جو صبر آزما ہو نہیں وہ جوانی

اور اُس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹ دیو پریا کے رخساروں پر آ گئے۔ بمان مائل بہ پستی ہوا، تحت الثریٰ کو گرنے لگا، راجہ کے قابو سے باہر تھا، ایک دھماکے کی آواز آئی۔ راجہ پھر موت کے چنگل میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور عالم نزع میں راجہ نے کہا:-

"دیوی! ہم تم پھر ملیں گے، یہ تشنہ آرزو مجھے تمہارے پاس پھر کھینچ لائیگی۔ غیب کے بیدرد ہاتھ اِسے نہیں روک سکتے۔"

تیسری مرگ و زیست کی منزل آزمایش نمبر ۳ ہے، اس مرتبہ راجہ کا نام سنکھدر ہے، اپنے باپ چکردھر سے مل کر راجہ گھر واپس ہو رہا تھا، ہرشپور کے اسٹیشن پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی، اُتر پڑا۔ ہرشپور کی بیوہ رانی کملا دیوی عبادت و ریاضت میں زندگی کے آخری ایام کاٹتی تھی۔ راجہ جوگیئے بھیس میں رانی سے ملا، اپنی یاد دلائی اور اُس کے اُجڑے ہوئے شباب کو پھر حسن و جمال کے آغوش میں دیدیا۔ یکایک کملا کو اپنی قلبِ ماہیت یاد آئی، ایسی ایسی آرزوئیں اور ایسی ایسی اُمنگیں بیدار ہوگئیں جنھیں رانی نے اپنی تپسیا اور بَرت سے دفن کر دیا تھا، لیکن نفس مرا نہیں تھا، محض سو گیا تھا۔ لٹے ہوئے سہاگ نے نیا چولا بدل کر نفس پروری کی مکروہ صورت سامنے کھڑی کر دی۔ راجہ سنکھدر کملا سے مطلق ملتفت نہیں ہوتا تھا، کملا اس کے پاس بار بار جاتی اور دعوتِ حسن دے کر لوٹ آتی، شاید راجہ کا بار بار ہَرن لیکر رانی کو تعلیم دینا ہی مقصود تھا۔ ایک دن کملا نے جوگیا رُوپ بھرا سنکھدر کملا کے فطری روپ کو دیکھکر وجد میں آگیا۔ کملا اُس کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ ایک بار پھر کملا مجازی محبت کے آغوش میں پہونچ گئی۔ راجہ کے پہلو میں جاکر اُس نے پھر روحانیت کی دولت پر ڈاکا ڈالا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین دھنسی جاتی ہے اور آسمان اُڑا جاتا ہے سنکھدر پر مرگ کی بیہوشی پھر طاری ہوگئی اور اُس نے دَم توڑتے ہوئے کہا:۔

"دیوی! رخصت، ہم آزمایش میں پھر ناکام رہے، مرگ و زیست کے دَور اُس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک "محبت" نفس کی آلائیشوں سے پاک نہ ہوگی۔ ہماری زندگی اسی آزمایش کے لئے مخصوص ہے۔"

منشی صاحب نے اس ناول یعنی "پردۂ مجاز" میں فلسفۂ ویدانت سے متعلق اُپنشدوں کی اُس حکایت کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے جو ایک سنیاسی کی آخری حسرتوں کے انجام سے تعلق رکھتی ہے۔ تارک الدنیا ہوکر یہ سنیاسی ایک ندی کے کنارے تپسیا کیا کرتا تھا، اُس نے ایک ہرن کا بچہ پالا تھا، اس بچے سے اُس کو بڑا پریم تھا، اُس کی بھولی بھالی چُلبلی، نرم سُکمار نتھنے، جذبات سے بھری رسیلی مگر وحشی آنکھیں سنیاسی کے دل کو قابو میں کئے ہوئے تھیں۔ آخر موت کے فرشتے نے آکر سنیاسی کو یَم کی بارگاہ کا پروانہ پہونچا دیا۔ سنیاسی نے پران تج دیئے لیکن ہرن کی محبت نے اُس کی آتما کا ساتھ نہ چھوڑا۔ انجام کار دوسرے جنم میں سنیاسی ہرن بناکر دنیا میں پھر بھیجا گیا، اور جنگلوں میں

چھلانگیں بھرنے لگا۔ اس کا دھیان الینور کی طرف نہ تھا، بلکہ اس کے من کے مندر میں ہرن کی پوجا ہوتی تھی۔ افسوس اُن لوگوں پر جو پتھروں کے دس سیرے پوجتے ہیں، کبیر نے اسی کا رونا رویا ہے

کوئی پوجے پاتھر، کوئی پوجے ڈھیلا

ہری کا کوئی نہ چنھیلا رے بابا

اِن مثالوں کو دیکھکر کم از کم یہ بات ضرور تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ فلسفۂ تناسخ روحانی تعلیم کے لئے نہایت ہی دلچسپ چیز ہے، اگرچہ مسلمان اس کے قائل نہیں ہیں۔ یہاں پر طوالت کے خوف سے حضرت ابراہیمؑ کی بیٹے کو قربان کرنے والی آزمایش کا ذکر، اور حضرت مولانا روم کی مثنوی سے سوداگر اور طوطی والی حکایت کا خلاصہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ناول پردۂ مجاز کے پلاٹ کا دوسرا رُخ بالکل ایسا ہے جیسا کہ عام ناولوں میں ہوتا ہے۔ اِس زی پہلو کو قلم انداز کرنے کے بعد یہ لکھنا ضروری ہے کہ پردۂ مجاز میں جنم بدلنے والے راجہ کی طرح اور بار آغوش شباب میں کھیلنے والی رانی کی طرح جو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود نفس امّارہ ، نجات نہ حاصل کر سکے منشی صاحب نے ایسے کیرکٹر بھی آزمایشی اکھاڑے میں بُلائے ہیں کارکنانِ قضا و قدر کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح بے بس تھے۔ اس اعتبار سے منشی صاحب شہور انگریزی ناولسٹ ٹامس ہارڈی سے اتفاق ہے۔

منشی صاحب کا ناول "چوگانِ ہستی" جو غالباً بہترین تصنیف ہے کسی انگریزی ناول سے کم مرتبہ معلوم ہوتا۔ اس میں مسیحی خاتون صوفیہ کا مقابلہ ہارڈی کے ناول "دلیسیونگی واپسی" میں Eustacia Vye سے کیا جاسکتا ہے۔ شرر کے ناول "فلورا اور فلورنڈا" میں غریب فلورا تارک الدنیا رہ پاک مسیحی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، اُسی کے لگ بھگ صوفیہ بھی اپنے مذہب کی پابندیوں سے ت حاصل کرکے سچائی کی متلاشی تھی۔ فلورا کے لئے مسیحی پادری "اخوان الشیاطین" ثابت ہوئے یہ کو خود اُس کے دل نے مجبور کیا۔ Eustacia Vye ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر انجام کار خدا کایت کرنے پر مجبور ہوئی۔ اگر دیوتا ابتدا ہی سے اُسے پختہ کار بنا دیتے تو کوئی شیطان اُسے بہکا نا، بالآخر اُس نے کہا کہ:۔

"ملے وہ خدا جس نے مجھے اس دنیا میں لا ڈالا۔ میں کیا کچھ نہ کرسکتی تھی، لیکن مجھے اُن اسباب نے ہلاک کیا، جو میرے قابو سے باہر تھے، یہ ہلاکت آمیز آزمایش کیا میرے ہی لئے تجویز ہونا تھی"

پر نشدہ۔ ئے شناسا۔ The Return of Native کا

میں تو ایک ناچیز ہستی ہوں جس نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔"

منشی پریم چند کے ناول "گوشۂ عافیت"[۱] میں گائتری کی زبان سے بھی اِسی قسم کے الفاظ نکلتے ہیں، وہ خدا کی طرف جا رہی تھی مگر شیطان نے اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ پاپی گیان شنکر نے مایا لوبھ کے نشے میں آ کر اُس کی عصمت کو لُوٹ لیا۔ اُس نے بھی کہا کہ "ایشور میں نے تیرا کیا بگاڑا اور یہ کہ" جو کچھ ہو میں اس سے (گیان شنکر سے) اپنی عصمت کے خون کا بدلہ ضرور لونگی اور اس سر اس طرح کچلوں گی جیسے سانپ کا سر کچلا جاتا ہے۔"

آخر وہ خود اپنے آپ سے روٹھنے کے بعد دنیا والوں سے بھی روٹھ گئی۔

ہندوستانی شریف زادیاں تریا چرتر کے فن کو تو جانتی نہیں، اسلئے وہ دوسروں کے اطوار و کردار کا بہت جلد نشانہ بن جاتی ہیں۔ اگلے زمانہ میں شریف نوجوانوں کو آدابِ مجلس سیکھنے کے لئے شاہدانِ بازاری سے بھی سبق دلوایا جاتا تھا۔ منشی پریم چند بھی ایک مخالف کیرکٹر کی زبانی یہ کہتے ہیں کہ "جب تک انسان مدرسۂ حسن میں شاگردی نہ کرلے اُس کے مزاج میں نفاست و لطافت نہیں آتی۔"[۲] بہرحال جس طرح ٹامس ہارڈی کے بھولے بھالے دیہاتی کیرکٹر شہر میں کھینچ کر لائے گئے ہیں، اُسی طرح منشی پریم چند کی پردہ نشین دیویاں بھی آزمائشوں کی تعلیم کے لئے پردے سے نکال کر بازارِ حُسن میں تیزی و طراری سیکھنے کے لئے لائی گئی ہیں۔

انگریزی ناولسٹ ہال کین[۳] کی ہیروئن میری[۴] کی مصیبت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ میری جو اپنے محبوب مارٹن سے جدا ہو کر لارڈ را[۵] کے ساتھ زبردستی بیاہ دی گئی تھی ایک دن لارڈ کے محل سے پوشیدہ بھاگ نکلی اور لندن پہونچی۔ وہاں اس کے لڑکی پیدا ہوئی لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس نے مختلف مقامات پر ملازمت کی اور اس سلسلے میں شاہدانِ بازاری سے بھی اس کی راہ و رسم ہوگئی۔ ان معشوقانِ عاشق نواز سے بڑھکر تریا چرتر کا فن کون جان سکتا ہے۔ چنانچہ میری کو وہاں ایک عجیب سبق حاصل ہوا۔ اسی طرح سٹر کی ناول "بدالنساء" کی مصیبت میں سادگی اور پردہ نشینی سے جو نتائج پیدا ہوئے اُن کا انجام تریا چرتر کے فن کی سفارش کرنے میں سب سے پیش پیش ہے۔ اندازہ کرنے کی بات ہے کہ دو جگہوں سے دُلھنیں رخصت ہو کر آ رہی ہوں اور دونوں بدل جائیں، ایک سیدانی پٹھان کے یہاں پہونچے اور پٹھانی سید صاحب کے یہاں آئے اور اس قسم کی غلطی سے جو بدنامی اور تباہی دونوں گھرانوں میں پھیل سکتی ہے اس کا

---

[۱] گوشۂ عافیت جلد دوم [۲] بازارِ حسن جلد دوم [۳] Hall Cane [۴] The Woman thou hast given me [۵] Lord Raa

ذکر فضول ہے۔

مولوی نذیر احمد صاحب کے افسانے بنات النعش اور مرأۃ العروس بھی اِس حقیقت کے شاہد ہیں۔ مرأۃ العروس کی پھوہڑ اکبری بیگم کو کٹنیوں نے کیسا ٹھگا مگر اس طرح تباہ ہونے کے بعد آخر وہ بھی ہوش میں آ گئی۔ خود پریم چند کی ہیروئن سمن بائی نے شاہدانِ بازاری ہی سے انسانیت سیکھی۔ پڑوس میں بھولی بائی رقاصہ رہتی تھی اُس نے اپنی صحبت میں رکھکر سمن بائی کو عقل کی دیوی بنا دیا۔ یہ مانا کہ ہر جگہ اِس قسم کی تعلیم کا انجام ٹریجڈی ہے، مگر مرد اِس سے دیوتا اور عورتیں دیویاں ہوگئی ہیں۔ "گوشۂ عافیت" کی ہیروئن گائتری کی بابت خود منشی صاحب نے لکھا ہے کہ گیان شنکر کی شیطانی صحبت نے اُسے کچی دیوی سے پکّی دیوی کر دیا تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو شیطان نے پٹّی نہیں پڑھائی وہ آدمی نہیں بنے، اگرچہ فرشتہ بنے رہے۔ اِسی اعتبار سے بقول علامہ اقبال شیطان کا یہ دعویٰ سچائی سے خالی نہیں کہ آدمی کا معلّم شیطان ہے۔ بالِ جبریل میں شیطان خدا کے ایک مقرب فرشتے سے کہتا ہے کہ میرے لہو سے انسان کی داستان رنگین ہوگئی۔ میں نے اُسے انسانیت سکھائی، اور میری ہی وجہ سے اُس نے خدا کو پہچانا۔

(۲) منشی پریم چند کا اصلاحی پہلو

متوسط طبقے کی طرزِ معاشرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے منشی صاحب کا اصلاحی پیام زیادہ تر اِسی طبقے سے متعلق ہے۔ یوں تو راجے مہاراجے ان کی ناولوں میں بھرے پڑے ہیں، تاہم اصلاحی پہلو زیادہ تر کلرکوں، دیہاتیوں اور متوسط گھرانوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔ تعلیمِ عبرت دینے اور آزمائشی مرحلے طے کرنے کے لئے راجہ مہاراجہ لائے گئے ہیں۔

اُن کا مضمون "نوک جھونک" اصلاحی پہلو کی نمایاں تمثیل ہے۔ 'نوک جھونک' میں قومی اور معاشی رواداری اور اُس کے مناسب محل عمل پر بحث کی گئی ہے۔ افسانہ "نیک بختی کے تازیانے" میں بیجا غرور اور ظلم کی حد تک پہونچنے والے احساسِ شرافت کا تماشا دکھایا گیا ہے۔ "آہِ بیکس" میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر دنیاوی عدل و انصاف کی مشینری جرائم

۱؎ بازارِ حسن جلد دوم
۲؎ اقبال:- داستاں انسان کی رنگیں کر گیا میرا لہو ❊ تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو!
یہ شعر شیطان نے بطورِ طنز فرشتے سے کہا ہے۔ (بالِ جبریل)
۳؎ خواب و خیال ۴؎ فردوسِ خیال ۵؎ پریم پچیسی حصہ اوّل۔

کی تحقیق سے قاصر ہے تو صرف دل کی آہ ہر قسم کی سیہ کاریوں اور ظلم کو مٹانے کے لئے کافی ہے۔ منشی صاحب حکّام وقت کی رعونت سے نالاں ہیں، جس کا ثبوت اُن کے افسانہ " بڑے بابو"[۵۱] سے ملتا ہے

زبردست کی زبردست پر خواہ مخواہ کی دھونس اُنھیں ناپسند تھی، ہریجنوں کے ساتھ اُنھیں خاص ہمدردی تھی، افسانہ "تالیف قلوب"[۵۲] میں اُن لوگوں کے ظرف کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی ہے جو منھ سے ہریجنوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں مگر اُن کے دل اُن سے موافقت کرنے پر تیار نہیں۔

محض دنیاوی اغراض کو مدِّنظر رکھکر وہ تبدیلِ مذہب کے خلاف تھے جس کا اظہار "شُدّھی"[۵۳] میں کیا گیا ہے۔

روحانی اصلاح کے متعلق اوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، افسانہ "نغمۂ روح"[۵۴] میں انسان کے حسنِ خیال کو نغمۂ لاہوتی کہا گیا ہے۔

متوسط طبقے کی طرز معاشرت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مذہبی اعتبار سے منشی صاحب قدامت پسند تھے۔ مگر لبرل خیالات سے اُنھیں بَیر نہ تھا، جس کا اظہار ان کے ناول "بازارِ حسن" اور "چوگانِ ہستی" میں کیا گیا ہے۔ البتہ سیاسی اعتبار سے منشی صاحب انتہا پسند کانگریسی تھے، اور اِس کا ثبوت اُنھوں نے اپنے ناول "میدانِ عمل" اور افسانہ "ستیاگرہ"[۵۵] میں دیا ہے۔

زبردست کی زبردست پر زیادتیاں اُن کے لئے سوہانِ روح تھیں ("آہ بیکس"[۵۶]) اور وہ اِس بات کے قائل تھے کہ ظلم وستم ایک نہ ایک دن اپنی خودکشی آپ ہی کر لیگا۔ (افسانہ "فکرِ دنیا") اور مظلوموں کا انتقام ایسا سخت گیر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے راجے مہاراجے اس سے زیر ہو جاتے ہیں (افسانہ "ذکرِ ماتِ کا تیغہ" اور "گناہ کا اگن کنڈ"[۵۷])

کسانوں سے منشی صاحب کو بڑی ہمدردی تھی، اُن کا ناول "گوشۂ عافیت" مخصوص طور پر کسانوں کے حقوق کی نگہداشت کا پرچار کرتا ہے۔

ناول "میدانِ عمل" میں دیہات کی اصلاح کے لئے حاکمانِ وقت کو آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

۵۱ خاکِ پروانہ
۵۲ خاک پروانہ
۵۳ خواب و خیال
۵۴ خاک پروانہ
۵۵ خاک پروانہ
۵۶ پریم پچیسی
۵۷ پریم پچیسی حصہ اول
۵۸ پریم پچیسی حصہ اول

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے منشی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگریس کے ہوا خواہ تھے، ان کا ناول "میدانِ عمل" تو گویا پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانحعمری "میری کہانی" کی تفسیر ہے میری کہانی کے دو حصے ہیں، میدان عمل کے چھوٹے چھوٹے پانچ حصے ہیں، دونوں کا پلاٹ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں حکومت سے جنگ چھڑی ہوئی ہے، دونوں دیہاتی اصلاح اور کامل آزادی کے گیت گا رہی ہیں، دونوں میں ہندو مسلمان دوش بدوش چل رہے ہیں۔ دونوں میں ہندو فدایانِ قوم حکومت پرست مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے اور اُن کو دُنیا کی اصلی حالت سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دونوں میں پکڑ دھکڑ، لاٹھی چارج، جیل خانہ شورش، فساد اور بلوے اپنی اپنی جگہ انقلابی مناظر پیش کر کے ایک نئی منزل اور نئے دَور کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ "میدان عمل" کے پلاٹ کا خاکہ لکھنا ہم اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ اس کا مطالعہ جانی بوجھی بات ہو جانے کے بعد اپنی دلچسپی قائم نہ رکھ سکے گا۔ بطور مقابلہ و موازنہ یہاں چند نمایاں خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔" ایک دولت مند ساہوکار کا فرزند امر کانت اور اُس کے دوست مسٹر سلیم دونوں ایک ہی کالج میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، امر کانت فارغ التحصیل ہو کر خدمتِ قوم کی طرف جاتا ہے اور سلیم صاحب سرکار میں ایک معزز عہدہ دار ہو جاتے ہیں اور جنٹ صاحب کہلاتے ہیں، امر کانت کے اصلاحی مضامین اس کی دلی شورش اور اس کے دماغی خلفشار کا پیش خیمہ ہیں، وہ کسان سُدھار اور دیہاتی اصلاح کے لئے دیہات میں بود و باش اختیار کرتا ہے اور اس طرح ایک پہلو سے کانگریس کی خدمت کر رہا ہے۔ اُس کی بیوی سُکھدا بھی قومی کاموں میں حصہ لینے لگی اور اس کا انہماک اس قدر بڑھا کہ شورشوں کے سلسلے میں اُسے جیلخانہ جانا پڑا۔ امر کانت بھی گرفتار ہوا اور سزا یابی میاں سلیم ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ امر کانت جیل میں تھا، اس کے والد سمر کانت نے مسٹر سلیم سے ملاقات کی اور اپنی گفتگو سے سلیم کے خیالات کو بالکل بدل دیا۔ اب سلیم جو رپورٹ مرتب کرتا اس میں رعایا کی بہبودی مدنظر رکھکر دیہاتیوں کی فلاح کا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ سرکار کی ملازمت میں رعایا کی فلاح کا خیال سب سے زیادہ اہم فرض ہے، لیکن ہر افسر کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا۔ ایک بنگالی بابو جو سرکاری عہدہ دار تھے اس معاملہ پر سلیم سے جھگڑ بیٹھے سلیم نے انھیں دے مارا، اُن کے چوٹ آگئی سلیم جیلخانے بھیجا گیا، وہاں امر کانت وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ بالآخر عارضی سزا کے بعد سب کے سب چھوڑ دیے گئے۔ اس طرح یہ ڈراما، کامیڈی کی صورت میں تمام ہوا۔ "میری کہانی" کا خاکہ بھی ایسا ہی ہے

پنڈت جواہرلال ایک دولتمند وکیل کے صاحبزادے ہیں، آپ نے باپ کے قدم بقدم قومی خدمت کا بیڑا اٹھایا، کسانوں میں بیداری آپ ہی کی ذات سے پیدا ہوئی کیونکہ خود دیہات کا دورہ کیا۔ آپ کی شریکِ زندگی کملا نہرو نے بھی قومی خدمات کی بنا پر پبلک لائف میں حصّہ لیا اور شورشوں کے سلسلے میں جیلخانہ جانا پڑا۔ لبرل پارٹی کے ممبروں سے جواہرلال کو ایک خاص عناد ہے، وہ اُنھیں اکثر تھالی کا بیگن اور ابن الوقت وغیرہ کہکر یاد کیا کرتے ہیں

میدانِ عمل کا مقابلہ ہال کین کے ناول "ایٹرنل سٹی" سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ البتہ "ایٹرنل سٹی" کا ہیرو "رُوسی" (Rossi) اپنی ابتدائی زندگی کے مراحل بڑی مصیبتوں میں طے کرتا ہے، اس کا بچپن تو ابراہام لنکن کے بچپن سے بھی زیادہ مفلسی میں گزرا تھا ورنہ امرکانت سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، اور سلیم کا مقابلہ ہال کین کے بیرن بونیلی سے ہوسکتا ہے، البتہ سلیم نے اپنی حالت تبدیل کرلی تھی اور بیرن بونیلی کا آخری انجام ظلم و استبداد کے لباس ہی میں نمایاں ہوا۔ جس طرح امرکانت کو ایک مسلم لڑکی سے محبت تھی اسی طرح "روسی" کو ایک اطالوی خاتون سے۔ سلیم کا عقد اس خان زادی کے ساتھ ہوا اور "روسی" کا اطالوی خاتون سے۔ بیرن کو "روسی" نے مار ڈالا۔ سلیم اپنے دوستوں میں آملا اور خود امرکانت اسکی شادی کا محرک ہوا۔ ایٹرنل سٹی کا مختصر سا پلاٹ یہ ہے :۔

"ایک لڑکا موسمِ سرما کی شام کو گلہری کا پنجرا لئے جارہا ہے۔ لندن اس کے لئے کرۂ زمہریر ہے، ایک ڈاکٹر نے اس کی پرورش کی۔ لڑکے کا نام ڈیوڈ لیون (David Leon) ہے۔ ڈاکٹر کی لڑکی اس کو اپنا منہ بولا بھائی بنالیتی ہے۔ اب منظر شہر روم (Rome) کو منتقل ہوجاتا ہے۔ پوپ کی سالگرہ کا دن ہے، جشن کی تیاریاں ہورہی ہیں، لیکن شہر کے باشندے دولت کے اس بیجا اسراف سے ناخوش ہیں، ایک عام شورش پھیل رہی ہے۔ اسی اثناء میں ایک نوجوان اس شورش کا سرغنہ ہوجاتا ہے۔ بیرن بونیلی Baron Bonelle شاہ اٹلی کا وزیراعظم ہے، ایک خاتون کو جس کا نام روما (Roma) ہے اور جو وزیراعظم کی مرغوب نظر ہے اس اجنبی شخص سے جو شورش کا سرغنہ ہے اور جس کا نام روسی (Rossi) ہے محبت ہوجاتی ہے۔ روسی اٹلی کی حکومت کو تہ و بالا کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اسی دُھن میں وہ پارلیمنٹ کا ممبر ہوجاتا ہے مگر وزیراعظم کی ریشہ دوانیاں اُسے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بھاگتے وقت وہ روما سے شادی کرلیتا ہے۔

ہال کین Eternal City = Baron Bonelle ۔

روسی کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے، پوپ روما کو مجبور کرتا ہے کہ روسی کو چھوڑ دے روسی گرفتار کیا جاتا ہے، اس اثنا میں وزیر اعظم صاحب روما کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، روما وزیر کو پستول کا نشانہ بنانے ہی والی تھی کہ روسی پولیس سے چھوٹ کر آ جاتا ہے، وزیر نے روما سے پستول چھین لی اور وہی پستول روسی کی طرف کر دی، روسی نے حفاظت خود اختیاری میں وزیر کا ہاتھ قابو میں کر لیا، پستول چھوٹ گئی اور وزیر اعظم ڈھیر ہو گیا۔ روسی وہاں سے چلا گیا روما پکڑی گئی، اُس نے روسی کی جان بچانے کے لئے اقبال جرم کر لیا، اُس کو سزائے حبس دوام دی گئی روسی پوپ کے پاس اقبال جرم کرنے آیا، اور اس سلسلے میں اپنی زندگی کے تمام واقعات بیان کر دیئے واقعات کا سلسلہ کچھ ایسا ثابت ہوا کہ روسی خود پوپ کا گم شدہ فرزند نکلا اور روما وہی ڈاکٹر کی لڑکی تھی جس نے روسی کو جس کا نام ڈیوڈ لیون (David Leon) تھا اپنا منہ بولا بھائی بنایا تھا۔"

یہ ناول نصف حزنیہ اور نصف طربیہ ہے مگر انجام کامیڈی ہے۔ اِسی طرح "میدان عمل" بھی حزنیہ اور طربیہ پہلو لئے ہوئے ہے اور اس کا انجام بھی کامیڈی ہے۔

اِن تمام خصوصیات کے علاوہ منشی پریم چند کو سماجی اصلاح کی بڑی فکر تھی۔ بچپن کی شادیوں سے منشی صاحب کو عناد تھا ہی مگر وہ بوڑھے جوان کے میل کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ خورد سال بچوں کی موجودگی میں دوسری شادی کے بھی خلاف تھے۔ مگر اپنے افسانہ میں سوتیلی ماں کی محبت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ افسانہ یعنی "سوتیلی ماں" ابتدائی درجوں کے تعلیمی کورس میں بھی داخل ہو گیا ہے۔

بوڑھے جوان کے میل پر منشی صاحب کا ہندی افسانہ "نیا بیاہ" نہایت دلچسپ ہے۔ یہ افسانہ رسالہ "سرسوتی" الہ آباد میں شائع ہوا ہے۔ پلاٹ کا خاکہ یہ ہے:۔

"پہلی بی بی لیلا سے سیٹھ جی کی طبیعت نہ بھری، دوسری بیاہ لائے، کمسن آشا اُن کو دادا جان سے کم نہ سمجھتی تھی۔ وہ اُنھیں "آپ" کہکر خطاب کیا کرتی، اور سیٹھ جی کا اصرار تھا کہ "تم" کہا کرو۔ وہ کہتے ہیں:۔

"تم مجھے "آپ" کیوں کہتی ہو، میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں چنچل بالک بننا چاہتا ہوں......

آشا نے جیسے بعیتر سے زور لگا کر کہا "تم" اور اُس کا مکھ منڈل لجّا سے آرت ہو گیا۔

بعض وقت آشا کے "کٹھور شبدوں سے وہ نراش ہو جاتے" اور دوستوں سے شکایت کرتے دوست اور بھی دُون کی ہانکتے اور کہتے کہ وہ نازک ہیں تم زبردست ہو۔ لالہ جی چاہتے تھے کہ

اُن کے دوست اس سونے کی رانی کے درشن سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ ریشہ خطمی ہوکر بول اُٹھتے کہ "بھائی میں تو بڑی بپت میں پھنس گیا، کچھ بدھی کام نہیں کرتی"۔ یار لوگ کہتے کہ "وہ ہیں کمسن کومنگی اور آپ ٹھہرے پرانے لیفٹیٹ، دنگل کے پہلوان، بس اگر یہ بات نہ ہو تو مونچھیں منڈوا ڈالیئے"۔ یہ سُنکر سیٹھ جی کی آنکھیں جگمگا اُٹھتیں۔

انجام کار آشا کے دل پر گھر کے مہرانے اپنا قبضہ جمالیا، آشا کی اُس سے باتیں ہوا کرتیں، ٹیپ کا بند یہی ہوتا کہ "لالہ بھوجن کرکے چلے جائیں تب آنا"۔

اِس قسم کے بیاہ پر خود منشی صاحب اپنے ہندی الفاظ میں اس طرح فرماتے ہیں:-

"بیاہ کیا ہے جیون کا آنند اُٹھانے کے لئے جھلملاتے ہوئے دیپک (چراغ) میں تیل ڈالکر اُسے اور چمک (تیز) کرنا ہے۔ اگر دیپک کا پرکاش (نور) تیز نہ ہوا تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ"[1]

بیواؤں کی شادی سے متعلق منشی صاحب کا اصلاحی پیام تھوڑا بہت ہر ناول میں ملے گا مگر اُن کے ناول "بیوہ" میں اس پیام کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے بنیادی اصول دو رکھے گئے ہیں

۱- وہ مرد جن کی بیویوں کا انتقال ہوگیا ہو اُن کو چاہیئے کہ صرف بیوہ عورتوں سے عقد کریں۔

۲- اگر بیوہ عورتوں کا عقد ممکن نہ ہو تو انھیں ایسے ذرائع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ لواحقِ دنیا سے جُدا ہوکر خدا کی یاد یا قومی خدمت کو اپنا شعار بنا سکیں۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کی تصنیف "ایامیٰ" سے منشی صاحب اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ ناول "بیوہ" کا پلاٹ برا نہیں۔ اس کی ابتدا تو نہایت ہی دلچسپ ہے، مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ "کاشی کے آریہ مندر میں امرناتھ کا لکچر ہوا۔ موضوع یہ تھا کہ بیواؤں کی فلاح کو مدنظر رکھکر اُن حضرات کو جن کی پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا ہو کوئی حق نہیں کہ ناکتخدا خاتون بیاہ کے لائیں۔ بابو امرت رائے کی بیوی فوت ہوچکی تھیں، اُن سے ایک کنواری دیوی پریما محبت کرتی تھی، مندرجہ بالا اُصول کے ماتحت انھوں نے پریما سے قطع تعلق کرلیا، اور اس کا عقد امرت رائے کے دوست پروفیسر دان ناتھ سے ہوگیا۔ پریما کا ایک بھائی کملا پرشاد تھا، اُس کے پڑوس میں ایک کلرک بابو بسنت کمار رہتے تھے، اتفاق سے کھیل ہی کھیل میں وہ گنگا میں ڈوب گئے۔ اُن کی خوبصورت بیوی پورنا بیوہ ہوگئی۔ کملا کی بہنوں کے پاس وہ اکثر آیا کرتی تھی۔ کملا پرشاد نے اُس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے، اس کے لئے ساڑیاں وغیرہ لائے آخر اُس غریب کی عفت کا پاؤں بھی قدرے پھسل گیا، اور صورتِ حال نے اس حد تک ترقی کی کہ کملا بابو

[1] سرسوتی، پریاگ

اُسے اپنے کمرے میں لے گئے اور ہمیشہ دان کے خواہاں ہو گئے۔ پورنا کو معاً دھرم کا خیال آیا اور کملا کو زخمی کر کے بھاگ نکلی۔ اس کا ٹھکانا بھی بازارِ حسن کی سُمن بائی کی طرح آشرم ہی میں ہوا۔ وہاں وہ ہر دم پوجا پاٹ میں مشغول رہنے لگی۔"

شادی بیاہ کے موقعوں پر منشی صاحب ناچ رنگ کے مخالف تھے، خاصکر غریب گھرانوں میں اس قسم کی فضول خرچی کو وہ قومی ادبار تصور کئے ہوئے تھے، ناول "میدان عمل" میں امرکانت کے فرزند کی ولادت پر ناچ رنگ سے اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔ بازارِ حسن میں سدن سنگھ کی برات کے موقع پر براتیوں کی "نظر انتخاب بہترین حسن کی تلاش میں سرگرم تھی"۔ لوگ آپس میں ناچ کے لئے جھگڑ رہے تھے کہ ایک مہاتما سوامی نے آکر ناچ وغیرہ سے بچنے کا اُپدیش دیا اور لوگ خاموش ہو گئے۔

(۳) ترغیبِ عمل

منشی صاحب کے پیام کا عملی پہلو اُن کے اصلاحی پہلو کے ماتحت ہے۔ ترغیب عمل سے متعلق منشی صاحب نے پچاسوں افسانے لکھ ڈالے۔ خصوصاً اُن کا افسانہ "بنک کا دیوالہ"[۵] اور "شدھی"[۵] قابل غور ہیں۔ افسانہ "وکرمادت کا تیغہ"[۶] عدل و انصاف کو برقرار رکھنے اور ان خاصیتوں کو عملی جامہ پہنانے کی اچھی مثالیں ہیں۔ منشی پریم چند شدھی کے موافق تھے کیونکہ اُن کے نزدیک اس سے چھوت چھات کا مرض دُور ہو سکتا ہے۔

افسانہ "شدھی" کے ہیرو پنڈت لیلا دھر نے ہریجن اُدّھار کا بیڑا اُٹھایا، مگر وہ ان نیچ ذات والوں کے سامنے ایثار کے اعتبار سے کم ظرف ثابت ہوئے، وہ زبان کے کھرے مگر دل کے کھوٹے تھے۔ کوئی غنڈا رات کو آیا اور چھُری مار کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ گانوں کے نیچ ذات والوں نے پنڈت جی کی ایسی سیوا اور تیمارداری کی گویا نئے سر سے زندگی ملی۔ اب پنڈت جی بھی دیہاتیوں میں رہکر اُن کی خدمت کرنے لگے۔ ہریجن اور پنڈت دونوں میں ایک جان دو قالب کا رشتہ پیدا ہو گیا اور اس طرح پنڈت جی وہاں سب کے گرو مشہور ہو گئے۔

ترغیب عمل کا دوسرا افسانہ "ستی" ہے یہ افسانہ اگر ناول کی صورت میں پیش کیا جاتا تو ایک کامیاب ٹریجڈی ہوتا۔ اس کا خاکہ یہ ہے کہ "چنتا دیوی کالپی کے ایک مہا بندیلے کی بیٹی تھی۔ باپ

---

۵ پریم بتیسی حصہ دوم ۵ پریم بتیسی حصہ اول ۶ خواب و خیال ۷ خواب و خیال

لڑائی میں مارا گیا تو چنتا نے باپ کے قدم بقدم چلنے کی قسم کھائی جس سے دشمنوں کے پیر اُکھڑ گئے، چنتا کے حسن کا شہرہ عام تھا، بالآخر رتن سنگھ راجپوت کو اُس کی شوہری کا شرف حاصل ہوا، ایک دن دشمنوں نے گھیر لیا۔ رتن بڑی بہادری سے لڑا۔ اُس کے سب ساتھی مارے گئے مگر وہ کہیں نکل گیا چنتا سمجھی کہ وہ بھی مارا گیا، اُس نے ستی ہونے کی ٹھان لی اور چتا پر چڑھ گئی۔ جس وقت چتا میں آگ دی گئی رتن سنگھ آموجود ہوا۔ چنتا دیوی آخر وقت تک یہی کہے گئی کہ "تم رتن سنگھ نہیں ہو وہ مر چکا" اور ستی ہو گئی۔

اسی طرح "ناول" "بازارِ حسن" میں منشی پریم چند نے سوامی گیانند کے جسم لطیف کو دیوتاؤں کا برن دیکر کھلے الفاظ میں ترغیب عمل کا اُپدیش کیا ہے۔

"بازارِ حسن" ایک کامیاب ناول ہے مگر در اصل یہ محض ناول یا افسانہ نہیں بلکہ علم النفس اور گیان یوگ پر ایک دلچسپ تبصرہ ہے۔ اس ناول کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دعوتِ عمل ریفارمر، لیڈر یا مذہبی پیشواؤں کا ہی کام نہیں، داستان گو اور شاعر اُن سے کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ دھرم کو کرم سے ہم آہنگ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس ناول میں منشی صاحب نے حسن کو عمل کی ترغیب کا آلۂ کار بنایا ہے۔ اکثر ناولوں اور افسانوں میں حسن ترغیب عمل کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ "فسانۂ آزاد" کی بنیاد ہی ترغیب عمل ہے۔ یعنی یہ کہ حسن آرا آزاد کو اس شرط پر اپنا شوہر بنانے کے لئے تیار ہے کہ وہ جنگ میں جاکر ترکوں کی مدد کریں، اور اپنی ہمت و شرافت کا اِس طرح ثبوت دیکر قوم میں نام آوری حاصل کریں۔ اس طرح حسنِ انسانی ذوقِ عمل کو بیدار کر سکتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ کے ہر احساس کو عملی جدوجہد کے لئے اُکسا سکتا ہے۔ احساسِ حسن شاہ و گدا، فاسق و فاجر، زاہد و رند سب میں ہوتا ہے۔ اِس لئے منشی صاحب شاہراہِ بازاری کی تعلیم گاہ میں ایک ایسے فرد کو لائے ہیں جس میں حسنِ صورت بھی ہے اور حسنِ سیرت بھی۔ اِس سے زیادہ پُرتاثیر اور دلچسپ طریقہ عوام کی تعلیم کا اور کیا ہوگا۔ حسن نے انسان کے ہاتھ سے پہاڑ ترشوائے، دودھ کی نہریں نکلوائیں اور بڑے بڑے دیو، عفریت اور راکششوں سے لڑائی میں مقابلہ کرایا۔ پھر بھلا یہ معمولی سی بات یعنی "اصلاحِ اخلاق" حسن کے نزدیک کونسی ایسی مشکل مہم ہے۔

ذیل میں ہم "بازارِ حسن" کا پلاٹ ایک مختصر سی دوکان کی صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ہر قسم کا مال قدردانوں کے سامنے آجائے اور وہ اس بازار سے کچھ نہ کچھ سودا خرید لیں۔ یہ ناول دو جلدوں میں ہے، اور اس کا پلاٹ قدرے پیچیدہ ہے جس سے اور بھی زیادہ دلچسپی کا سامان مہیا ہو گیا ہے

اِس ناول کے پلاٹ پر غور کئے بغیر منشی صاحب کے اصلاحی اور عملی پیام کو بخوبی سمجھنا آسان نہیں، چنانچہ اس کا خاکہ یہ ہے:۔

" داروغہ کشن چند کی دو لڑکیاں تھیں، سُمن اور شانتا، رشوت کے جرم میں بیچارے داروغہ جی سشن سپرد ہوگئے اور کئی سال کی سزا ہوگئی، اب ان لڑکیوں کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ اُن کے ایک عزیز نے بڑی لڑکی سُمن کی شادی ایک غریب کلرک مسمی گجادھر سے کردی جس کی تنخواہ صرف پندرہ روپیہ ماہوار تھی اور آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا، کچھ عرصہ تک اُسٹم لسٹم نباہ ہوتا رہا۔ سُمن نے بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی تھی، اس کے دل میں اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا شوق تھا تو کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن شوہر کے یہاں اُسے کھانا بھی پکانا پڑتا اور چکی پیسنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی، جیسا کہ اُس کی پڑوسن بھولی طوائف نے کہا تھا کہ لدّو خچر عربی گھوڑے کا ساتھ نہیں دے سکتا وہی پیشین گوئی آخر پوری ہوئی۔ سُمن کی راہ و رسم ایک معزز وکیل مہاشے پدم سنگھ کی اہل خانہ شریمتی سوبھدرا سے بہت بڑھ گئی، وکیل صاحب پڑوس ہی میں رہتے تھے، سُمن وہاں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن کسی تقریب کے سلسلے میں وہاں سے رات گئے تک نہ آئی اِس بات پر اُس کے شوہر منشی گجادھر پرشاد کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے اور غصہ اتنا بڑھا کہ انھوں نے سُمن کو اپنے گھر سے نکال دیا، کچھ روز سُمن اپنی سہیلی سوبھدرا کے یہاں رہی۔ مگر وکیل صاحب کی بدنامی کے خیال نے اُسے وہاں نہ رہنے دیا۔ اب بھولی طوائف جو پڑوس میں رہتی تھی اُس پر مہربان ہوئی اور گانا وغیرہ سکھلا کر اُسے ایک کامیاب گائن بنا دیا اِس طرح سُمن بازارِ حُسن میں آگئی۔ اب کیا تھا حُسن و نغمہ اور اُس پر ناز و ادا نے ملک و دولت کو سُمن کا غلام بنا دیا حتّٰی کہ مہاشے پدم سنگھ وکیل کا بھتیجا سدن سنگھ جو بمنزلہ اولاد کے تھا سُمن پر فریفتہ ہوگیا۔ سُمن کا شوہر گجادھر تارک الدنیا ہوکر سادھوؤں اور سنیاسیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایام نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ سُمن کی چھوٹی بہن شانتا کی منگنی اسی چھبیلے رسیا سدن سنگھ کے ساتھ طے ہوگئی اور گجادھر بابو نے جو اب اپنے آپ کو سوامی گجانند کہلاتے تھے روپیہ دیکر شادی کی تمام رسوم کو سرانجام کرا دیا۔ برات داروغہ کشن چند کے یہاں آگئی مگر جب لڑکے والوں کو معلوم ہوا کہ شانتا سُمن کی چھوٹی بہن ہے تو سب بدنامی کو ڈرے اور گونہ لیجانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آپس میں بڑی بحثا بحثی رہی۔ اسی اثنا میں داروغہ کشن چند بھی جیل سے چھوٹ کر آگئے، اُن کو جب سُمن کی بیچائی اور اپنے گھر کی بدنامی کا حال معلوم ہوا تو

مارے غیرت کے گنگا میں ڈوب مرے۔ اب سُمن کے کان کھڑے ہوئے کہ میری وجہ سے میرا تمام خاندان تباہ ہو رہا ہے۔ اُس نے اپنے پیشے سے توبہ کی اور اُس کا داخلہ "بدھوا آشرم" (مامنِ بیوگان) میں ہو گیا۔ سُمن کے شوہر سوامی گجانند ایک مرتبہ سُمن سے ملے اور اپنی خطائیں معاف کرائیں کہ غصہ اور ادبار نے مجھے اندھا کر دیا تھا اس لئے میں نے تمھیں نکال دیا تھا۔ سُمن نے اُن کو معاف کیا اور اپنے حسنِ انتظام سے شانتا کے شوہر سدن کو شانتا کا گونہ لیجانے کی ترغیب دی۔ اِن دونوں کا گھر آباد کر کے خود اُن کی خدمت کرنے لگی۔ سُمن جب تک آشرم میں رہی تھی اپنے حسنِ انتظام اور حسنِ خدمت سے اُس کے ہر کیل کانٹے کو درست رکھا تھا اور دن رات اپنے ہم جنسوں کی خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا۔ جب وہ شانتا اور سدن کے یہاں آئی تو ان کو بھی گھر گرستی کا گُن سکھا دیا اور جب شانتا کے بچہ پیدا ہوا تو اسکی بڑی نگہداشت اور سیوا کی مگر سدن کے دل سے بدنامی کا خوف نہ گیا اس لئے سُمن کا رہنا ناگوار معلوم ہوا۔ سدن کے ماں باپ پُرانے خیال کے آدمی تھے، وہ اس سے بہت ناراض تھے، آخر سُمن وہاں سے بھی نکل جانے پر مجبور ہوئی۔ پتھریلے پٹھار اور خاردار جھاڑیوں میں سُمن چلی جا رہی تھی، اس کی کوئی منزل نہ تھی رات کی تاریکی پھاڑے کھاتی تھی، جنگلی جانور بول رہے تھے گویا سر پر چڑھے آتے تھے، سُمن کے پیر میں کانٹا چبھا اور وہ آہ کر کے گری اور بیہوش ہو گئی۔ اس حالت میں اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے اُسے جگایا، اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک نورانی شکل کا آدمی بڑی بڑی جٹائیں سر پر، کمنڈل ہاتھ میں، مرگ چھالا کاندھے پر، لالٹین لئے اُسے اُٹھا رہا ہے۔ سُمن نے غور سے دیکھا تو پہچانا کہ سوامی گجانند ہیں۔ سُمن قدموں پر گر پڑی اور کہا کہ تم بھی میری خطاؤں کو معاف کر دو، سب تمھاری ہی خطا نہ تھی بلکہ میری بھی، میں نے تمھاری ناداری اور غریبی کا پاس نہ کر کے امیرانہ زندگی کی آرزو کی تھی، آہ ایشور نے مجھے حسن دیکر چنچل بھی بنا دیا تھا۔ شاید ایشور اسی طرح ہماری آزمائش کرتا ہے۔ سوامی گجانند نے پوچھا کہ اگر اب بھی تمھیں دولت و عزت کی آرزو ہو تو ویسا کہو۔ سُمن نے کہا مجھے اب کچھ نہ چاہئیے۔

دولت ملے نہ تخت نہ تاج و لوا ملے ‏ ‏ ‏ ‏ بس وہ ملے کہ جس کے ملے سے خدا ملے

سوامی جی بولے کہ اگر واقعی دولت و عزت سے اب تمھاری طبیعت کو لاگ نہیں تو سنو:۔

"ستیہ جُگ میں آدمیوں کی مُکتی (نجات) گیان سے ہوتی ہے، دواپر میں بھگتی سے، ترتیا میں ستیہ (صدق و خلوص) سے، پر اس کلجگ میں اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ

سیوا (خدمت) ہے۔ اس راستے پر چلوگی تو تمہاری مکتی ہو جائیگی۔ جو لوگ تم سے بھی بیکس، دُکھی اور مصیبتوں کے مارے ہیں اُن کی خبر لو، اور اُن کی دعائیں تمہارے آڑے آئیں گی۔"

یہ کہکر سوامی جی چل کھڑے ہوئے، سُمن پیچھے پیچھے چلی مگر وہ آگے نکل گئے تھے، سُمن دوڑی، پکارا آواز آئی کہ چلی آؤ، یہاں تک کہ اُسے ایک کُٹی دکھائی دی جس میں گجانند سوامی رہتے تھے، وہاں جاکر دیکھا تو گجانند کمبل تانے سو رہے تھے۔ سُمن کو بڑی حیرت ہوئی، جگایا اور سب حال کہا۔ گجانند جی نے کہا کہ میں ابھی تمھیں خواب میں دیکھ رہا تھا، اور تمھیں سیوا دھرم کا اُپدیش کر رہا تھا۔"

الغرض یہ بات تو ماہرین علم النفس ہی بتا سکتے ہیں کہ (Psychology) کی یہ کونسی حالت تھی۔ مختصر یہ کہ سُمن بائی نے خود کو خدمت خلق اللہ پر وقف کر دیا اور ایک یتیم خانہ کی منتظمہ ہو گئی۔

اِس عہد جمہوریت کا عملی پیام منشی صاحب نے مندرجہ بالا ناول میں خوب سُلجھا کے پہونچایا ہے شاہی زمانے سے متعلق اِسی قسم کے پیام کی جھلک شرر مرحوم کے تاریخی ناول "مینا بازار" میں ملے گی، جس میں شاہجہاں بادشاہ نے مینا بازار میں جاکر حسن وعشق کا سودا خریدا تھا۔ اور اس سونے کی چڑیا کی گفتار سے اپنے دربار کو زینت بخشی تھی۔ یعنی یہ کہ جس طرح سُمن بائی شوہر سے جُدا ہونے پر مجبور ہوئی اور آخر میں خود کو یتیم خانے کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اسی طرح جمال آرا بیگم شوہر سے جُدا ہو کر یاد خدا کی طرف راغب ہوئی، مگر آخر میں خواتین محل کے اخلاق کو آراستہ کرنے کے لئے محل میں لائی گئی اور خود بادشاہ نے اس سے عقد کیا۔ خدمت و ایثار کے معیار کو مدنظر رکھا جائے تو دونوں ناولوں کے کرداروں میں قدرے اختلاف ہے مگر جس طرح سُمن بائی نے اپنے شوہر کی خطا معاف کی، اسی طرح جمال آرا بیگم اپنے شوہر کی جاں بخشی کا باعث ہوئی۔ اگر سُمن اپنے شوہر کی خطا معاف نہ کرتی اور شوہر اس کی خطا نہ معاف کرتا تو دونوں کے لئے دُنیا دوزخ ہو جاتی۔ یہی کیفیت جمال آرا اور یوسف بیگ کے انجام سے ہوتی۔

(۴) فرقہ وارانہ نوک جھونک

فرقوں کی مختلف قسمیں ہیں، جیسے مذہبی، معاشری اور سیاسی فرقے، ہندو مسلمان، شیعہ سُنی آریہ اور سناتن دھرمی وغیرہ مذہبی فرقے ہیں۔ اشتراکی اور اجتماعی طرز زندگی سے تعلق رکھنے والے فرقے معاشری فرقے ہیں، اور سوراجی، تنظیمی اور لبرل جماعتیں محض سیاسی فرقے ہیں۔ منشی پریم چند مرحوم پکّے ہندو اور سچے سناتن دھرمی تھے، مذہب اسلام کے حقیقی پہلو سے وہ بہت آگاہ تھے جس کا ثبوت انھوں نے اپنے

افسانے "عفو"[۵] میں دیا ہے، وہ مسلمانوں اور اسلام کی بڑی وقعت کرتے تھے، قرآن شریف کی بعض سورتیں انھیں زبانی یاد تھیں۔ ایک بار آگرہ کالج آگرہ میں انھوں نے چند احباب کی صحبت میں اس کا ثبوت دیا تھا۔

منشی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ صدیوں کی غلامی نے ہندوؤں کو مُردے سے بدتر کر دیا ہے، اور مسلمان اگرچہ مردہ نہیں ہوئے تاہم اندھوں کی طرح ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے تھے اور مسلمانوں کی آنکھیں روشن کرنے میں مشغول تھے۔ اِسی وجہ سے انھوں نے ہندو خواتین کو مردانہ کاموں کا محرک قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو بھی سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اِس کوشش سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو مگر اس کوشش کا ثبوت اُن کی تصانیف میں موجود ہے۔

ذاتی عقائد کے اعتبار سے وہ اپنی تصانیف میں کہیں سور داس ہیں، کہیں تلسی داس کہیں انھوں نے جنم اشٹمی رچائی ہے کہیں رام نومی مگر در اصل وہ رام کے نام پر قربان معلوم ہوتے ان میں مذہبی رواداری بہت زیادہ تھی، ان کی تصانیف تعصب کی آلایش سے قطعی پاک وصاف ہیں، کم سے کم جتنی تصانیف راقم الحروف کی نظر سے گذری ہیں ان میں تعصب وغیرہ کا کہیں شائبہ تک نہیں۔ بلکہ بعض جگہ منشی صاحب نے خود ہندوؤں کو سرزنش کی ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں کرداروں کی زبان سے ان کے مذہبی خیالات بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔ اپنے ناول میدا[ن] میں امرکانت کی زبان سے وہ کہتے ہیں :۔

"ہندو مذہب کی بنیاد حسنِ خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہے۔"

اِسی کردار یعنی امرکانت کی زبان سے اسلام کی رواداری کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے

"حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول مان لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں ...... اسلام مجھے بدھ، کرشن اور رام کا احترام کرنے سے نہیں روکتا۔"

حضرت مسیح کے مذہب پر تو ان کی ناول "چوگانِ ہستی" جو رنگ بھوم" کا ترجمہ ہے ایک اچھی خاصی تفسیر ہے۔ مگر عیسائی مذہب کی ذمہ دارانہ تخئیل سے اُن کو موافقت نہ تھی۔ چنانچہ چوگان ہستی میں وہ صوفیہ کی زبان سے یہ شک ظاہر کرتے ہیں کہ :۔

---

[۵] فردوس خیال

"اگر خداوند یسوع نے ہمارے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے کر دیا ہے تو پھر سارے عیسائی ایک ہی حالت میں کیوں نہیں؟"[۵۱]

اِن باتوں سے عاجز ہو کر منشی صاحب کہتے ہیں کہ "مذہب روح کے لئے ایک بندش ہے" در اس اعتبار سے وہ غالب کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں کہ

"ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں"

دراصل منشی صاحب ہر مذہب کے پیرو تھے اور خود اُن کا کوئی مذہب نہ تھا۔

معاشری اعتبار سے منشی صاحب اجتماعی معاشرت سے موافقت رکھتے تھے، اس کا ثبوت اُن کا ناول "گوشۂ عافیت" ہے۔ اِس ناول کے ایک کردار سید ایجاد حسین کا اتحادی یتیم خانہ اسکی تمثیل ہے مگر اصلاحی پہلو یہاں بھی نمایاں ہے، کیونکہ اس اتحادی یتیم خانے کو دولت کمانے کا آلہ کار ثابت کر کے اِس قسم کی قوم فروشیوں کا شکوہ کیا گیا ہے، اور یہاں سے منشی صاحب کی فرقہ وارانہ چشمکیں شروع ہوتی ہیں۔

فرقہ وارانہ نوک جھونک میں بعض بعض جگہ منشی صاحب نے میٹھی چٹکیاں بھی لی ہیں، چنانچہ جب سید صاحب موصوف (گوشۂ عافیت کے کردار) سناتن دھرم سبھا میں اپنے اتحادی یتیم خانے کے لئے امداد کی اپیل کرنے آئے تو نہایت زور دار الفاظ میں تقریر کی۔ علامہ اقبال کی اتحادی نظمیں یتیم بچوں سے پڑھوائیں، اور مجمع کو اس قدر گرویدہ کر لیا کہ چندے کی بوچھار ہونے لگی۔ سبھا میں کچھ پنڈت لوگ بھی اسی غرض کے لئے آئے تھے۔ پنڈت لوگ ایجاد حسین کا رنگ جمتے دیکھکر چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے اور جھٹ اپنی لٹکتی ہوئی چوٹیوں میں بل دیکر گانٹھ لگائی، اور خود منشی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"ان سے بھلا یہ کب ہو سکتا تھا کہ کوئی مسلمان بازی لے جائے، ایک سنیاسی نے اپنا لکچر شروع کر دیا"[۵۲]

لیکن ایجاد حسین کے مقابلے میں سب لسانی پھیکی پڑ گئی۔ سید صاحب نے "تخم ریزی" کر کے اچھی خاصی فصل کاٹ لی۔ آخر میں سید صاحب نے پرائیویٹ طور پر اپنے صاحبزادے سے ہنود کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے، کیا ہی مزے کی چٹکی ہے ؎

"اِن گوکھوں کی خوب تعریف کیجئے، ہجو ملیح کی حد ہو تو مضائقہ نہیں، پھر ان سے جتنا چاہیئے وصول کر لیجئے۔"

---

۵۱ چوگان ہستی حصہ اول ۔ ۵۲ گوشۂ عافیت حصہ دوم

سیاسی اعتبار سے منشی صاحب انتہا پسند کانگریسی تھے جس کے متعلق پہلے ہی اشارہ کردیا گیا ہے۔ اپنے ناولوں "میدانِ عمل" اور "گوشۂ عافیت" میں منشی صاحب نے اس کا ثبوت دیا ہے۔ اصلاحی مدمیں اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے یہاں مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ لیکن نوک جھونک اس میں بھی ہے، مثلاً یہ کہ انھوں نے ہندو کردار زیادہ تر کانگریس کی طرف رکھے ہیں حالانکہ قومی لڑائی میں ہندوستان کے مسلمان پیچھے نہیں ہیں۔ دوسری مزے کی چٹکی یہ ہے کہ منشی صاحب نے مسلمانوں کو سرکار کا نمک خوار ثابت کیا ہے۔ گوشۂ عافیت کے ڈاکٹر عرفان علی تو خیر قوم پرست ہیں، مگر میدانِ عمل کے میاں سلیم اور اسی طرح دوسرے کردار قوم پرستی کا دعویٰ کرنے کے باوجود حکومت پرست ظاہر کئے گئے ہیں گو بعد میں کہے سُننے سے راہِ راست اختیار کرلیتے ہیں، لیکن منشی صاحب نے دونوں فرقوں میں محبت و مودّت برقرار رکھنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ملاحظہ ہو افسانہ "ڈگری کے روپیے"

قوم پرستی کا دعویٰ کرنے کے باوجود غدّاری کرنے والوں سے منشی صاحب بہت ناراض تھے "گوشۂ عافیت" جلد دوم میں ایک جگہ سُکھو سادھو کے ہاتھ سے گاؤں کے عیب دار ضلعدار فیضو کے سر پر وہ چھینٹا جمایا کہ میاں جی کو تارے دکھائی دینے لگے، اور پھر وہیں ایک کرامت بھی دکھادی، ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے چمکتے ہوئے روپئے بن گئے۔ جس کو دیکھکر فیضو میاں کا غصّہ ہرن ہوگیا اور عذر تقصیر کرنے لگے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی صاحب اعجاز اور کرامت کے قائل تھے۔

غرض اس قسم کی فرقہ وارانہ نوک جھونک، میٹھی چٹکیاں، اور "مذھر بگوٹے" ان کی اُردو ہندی تصانیف میں بہت ہیں جو بادی النظر میں چاہے جیسے معلوم ہوں لیکن درحقیقت اُن کا مطلب محض دل لگی اور مذاق تھا۔ اپنے افسانہ "مایۂ تفریح" میں ایک مہاشے کا سراپا پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مہاشے چکر دھر سر گھٹاتے تھے، مگر لمبی چوٹی رکھ چھوڑی تھی جو چٹیل میدان کے کسی جھنکاڑ درخت کی طرح نمایاں تھی، اُن کا دعویٰ تھا کہ چوٹی کے راستے جسم کی غیر ضروری اور مضر حرارت خارج ہوتی رہتی ہے اور مقناطیسی اثرات جسم کے اندر نفوذ کرتے ہیں"

اِسی طرح بازارِ حُسن میں مولوی ابوالوفا کی داڑھی معشوق کی دیا سلائی کے نذر کی گئی ہے اصل عبارت بخوفِ طوالت نظرانداز کی جاتی ہے۔

لہ فردوسِ خیال ٹہ خواب وخیال بیلہ خواب وخیال ٹہ پریم پچیسی

ایک اور افسانہ "شطرنج کی بازی"[1] میں اُن مسجدوں پر جو ویران پڑی رہتی ہیں اور جن میں جواری اور شرابی لوگ جاکر شیطان پرستی کرتے ہیں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے :-

"شام ہوئی تو مسجد کے کھنڈروں میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کی، ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نمازِ مغرب ادا کرنے لگیں، مگر (شطرنج کے) دونو کھلاڑی (مسجد ہی میں) بازی پر ڈٹے رہے گویا خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں"

اس عبارت سے منشی صاحب کا مطلب یہی ہے کہ نماز کے وقت کھلاڑیوں کو ایک مسلمان فرد ہونے کی حیثیت سے کھیل چھوڑکر فوراً نماز کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیئے تھا، مگر اُنھوں نے نماز کا کچھ خیال نہ کیا اور شطرنج بازی کے اکھاڑے میں لڑمرے۔ کیا اس قسم کے کھیلوں کے وقت عام طور پر ایسا ہی نہیں ہوتا ؟

منشی صاحب کی زندہ دلی کی مثال افسانہ "وکرماد تیہ"[2] میں بھی موجود ہے، لکھتے ہیں :-

"مسرت کے جوش میں کبھی کبھی لوگ تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں بھی کر بیٹھتے ہیں۔ ایک پنڈت جی مرزائی پہنے، سر پر گول ٹوپی رکھے (جشنِ فتح کا) تماشا دیکھنے میں مصروف تھے، کسی شریر آدمی نے اُن کی توند پر ایک چمگادڑ چمٹا دی۔ پنڈت جی بے تحاشا توند مٹکاتے ہوئے بھاگے۔ بڑا قہقہہ پڑا"

اِس مثال کے بعد مولوی صاحب کی خبر لی گئی ہے جو تین ٹانگ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے "اڑا اڑا دھم" ہوگئے۔

مندرجہ بالا مثالوں کو ظرافت کہا جائے یا لغزش تصوّر کیا جائے اپنی اپنی جگہ پر دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ اِس قسم کی باتوں کے علاوہ منشی صاحب کا قلم ہر جگہ محتاط رہا ہے۔ اور اس قسم کی لطیفہ سنجی ادبی خوبیوں میں داخل ہے۔ کبیر کے کلام میں اس قسم کی چٹکیاں بہت ہیں۔ لمبی داڑھی پر اُن کی پھبتی "داڑھی بڑھائے جوگیلا بھئیو بکرا" تو بہت مشہور ہے۔ اسی طرح ہنود میں قربانی کی رسم پر وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

ستّ مان کے بکرا لائے کان پکڑ سر کاٹا
پوجا تھی سو مالن لے گئی مورت[3] کو کر جاٹا
دُنیا بھام بھُو مر بھُوئی

---

[1] خواب و خیال [2] پریم بتیسی [3] قربانی کا مخصوص پتھر

(۵) فنّی پہلو

فنّی اعتبار سے منشی پریم چند کی تصانیف بہت کامیاب ہیں۔ ہندی اُردو دونوں زبانوں پر اُنھیں قدرت تھی۔ مسلمان ہندو دونوں فرقے اُن کے جانے بوجھے تھے۔ مسلم گھرانوں کی بود و باش کا تجربہ اُنھیں ایسا ہی تھا جیسا ہنود گھرانوں کا۔ مسیحی طبقے سے بھی وہ نابلد نہ تھے۔ "چوگانِ ہستی" کی کامیابی اسی بات کی دلیل ہے۔ وہ کسانوں سے لیکر بڑے بڑے راجاؤں مہاراجاؤں کی معاشرت اور اُن کی رگ رگ پہچانتے تھے۔ اُن کو اس متوسط طبقے کی اصلاح کا بڑا خیال تھا جو غریب کلرک کہلاتے ہیں۔ جو پندرہ بیس روپیہ کی تنخواہوں پر زندگی گذارتے ہیں۔ سرکاری حکام سے اُن کی ہمیشہ یہی تلقین رہی کہ رعایا پروری ہی گورنمنٹ کی مضبوطی اور اس کے اقتدار کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا مشن تھا کہ بڑے عہدہ دار اپنے ماتحتوں اور غریب کلرکوں کی خانگی زندگی سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ اور اُن کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک سے پیش آئیں۔ (افسانہ "مستعار گھڑی") یہ بھی اُن کا پیام تھا کہ اگر بڑے بڑے راجہ مہاراجہ یا خود سرکاری افسران اپنے ماتحتوں پر کسی قسم کا عتاب کریں تو اس عتاب کا شکار (معتوب کے) غریب بال بچوں کو نہ بنائیں۔ اور اُن کے لئے کوئی سبیل ایسی پیدا کریں کہ اُن کی زندگی دوبھر نہ ہو جائے۔ (افسانہ "خاکِ پروانہ"[۱]) یہ تمام باتیں ایک کامیاب ادیب کے فرائض میں داخل ہیں۔

محض آرٹ کے اعتبار سے ملک کی مختلف ادبی انجمنوں نے منشی صاحب کو "تضادِ ملیح" کا ماہر اور "اجتماعِ ضدّین" یعنی PARADOX کا اُستاد تصور کیا ہے۔ اُردو ادیب اُنھیں کامیاب افسانہ نگار اور ہندی ادیب افسانہ نگاری کا بادشاہ تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ فن کے اعتبار سے منشی صاحب کے بعض ناول پھیکے بھی ہیں لیکن اکثریت کامیاب ناولوں ہی کی ہے۔

وہ ڈراما کی طرف بھی رجوع ہوئے تھے۔ ڈراما اور ناول میں راقم کے نزدیک محض طرزِ ادا کا فرق ہے، ورنہ دونوں کے فرائض ایک ہی ہیں۔ ڈرامہ کا لطف تماشے میں ہے ناول کا مطالعہ میں پنڈت کیفی کا ڈرامہ "راج دُلاری" اِس امتیاز کی دلچسپ مثال ہے۔ اس ڈرامہ کا ماخذ یہ ہے کہ نئی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے نہ تو بیر رکھنا چاہیئے نہ اُس کی بالکل اندھی تقلید کرنا چاہیئے۔ معاشرتی پہلو کو دیکھتے ہوئے منشی صاحب کا پیام بھی یہی تھا۔ جس کی تمثیل منشی صاحب کا مقالہ "نوک جھونک"[۲] ہے۔ اِس

---

[۱] خاک پروانہ [۲] خواب و خیال

افسانہ نما مقالے میں قدیم وجدید خیالات کے روشن وتاریک پہلو دھوپ چھاؤں کی طرح ظاہر کئے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ انسان فطرتاً تقلید پسند ہے۔ غرض اس مقالے میں ہر اُصول کی عملی شان دکھائی گئی ہے جس کا خلاصہ "خیراً اموراوسطہا" والی حدیث ہے۔

بہرحال ڈرامہ کی خوبی کا اندازہ محض مطالعہ سے نہیں کیا جاسکتا، اس کو تو اسٹیج پر ایکٹ ہوتے ہوئے دیکھنے میں ہی لطف آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تسلسل واقعات سے متعلق عبارت ڈرامہ میں حذف ہوجاتی ہے، اگرچہ مفہوم نہاں رہتا ہے۔ مثلاً ڈرامہ "راج دلاری" میں ایک جگہ راج دلاری کی حالت اس طرح ظاہر کی گئی ہے:-

"راج پپیہے کی آواز پر چونک پڑی اور گانے لگی:-

نا پیا آئے نہ پاتی آئی من کینو کیسو کٹھور...

پیت نے کیا اندیت نکالی منھ نہ کیا گھر اور

سکھی رہی تڑپ تڑپ بھئی بھور

مگر ناول میں سلسلۂ عبارت کے لئے راج کی حالت پر بھی روشنی ڈالی جائیگی اور لکھا جا

"راج پپیہے کی آواز پر چونک پڑی، اس کے دل میں پریم کی لہریں اُٹھکر کھیلنے لگیں، جذبات اُمنڈ آئے اور وہ بھی گانے لگی الخ"

غرض فن کے اعتبار سے منشی پریم چند کی تصانیف نہ تو بالکل خشک ناول کی طرح ہیں نہ اکھڑ ڈرامے۔ اِس معاملہ میں منشی صاحب نے میانہ روی سے کام لیا ہے اور یہی فرق اُن کی تصانیف کو رتن ناتھ کے فسانۂ آزاد اور مولانا شرر کے ناولوں سے الگ کردیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شرر مرحوم نے سب سے پہلے ناولوں کو حقیقی ناول کی صورت میں پیش کیا، اور وہ اپنے فن میں اُستاد تھے۔ اُن کا آرٹ، اُن کا رومان، عہدِ ماضی کی نیچرل فوٹو گرافی، معاشرت کی تنقید کے ساتھ واقعات کی نقاشی، ظرافت میں عبرت اور عبرت میں ظرافت کو مخلوط کرکے ایک نئی تخئیل قائم کرنا، انقلاب سے اصلاح اور اصلاح سے انقلاب کے پہلو نمایاں کرنا وغیرہ خواص کو مولانا شرر کو اُردو زبان کا ایک کامیاب ناولسٹ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ غالباً اس اعتبار سے منشی صاحب کا مقابلہ مولانا مرحوم سے بے محل ہوگا۔ تاہم دونوں میں جو دلچسپ امتیاز ہے اُسے نمایاں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ منشی صاحب نے تخئیل کو زیادہ اہمیت دی ہے، اور مولانا شرر نے تاویل کو۔ ایک کی نظر جذبات پر ہے دوسرے کی فطرت پر۔ ایک روح کی گہرائیوں تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے، دوسرا روحانی فضاؤں تک پرواز کرنے کی۔

اِس اعتبار سے منشی صاحب کا ناول "پردۂ مجاز" اور مولانا مرحوم کی تصنیف "فردوس بریں" قابلِ مطالعہ ہیں۔ انتہا یہ کہ منشی صاحب نیچر کی تصویر کشی میں بھی تخیل کا رنگ بھرتے ہیں، وہ چینی آرٹ کے شائق ہیں، مولانا موصوف فرنچ آرٹ کے۔ مولانا شرر اپنے وقت کے الکزنڈر ڈیوما تھے منشی صاحب میں "میری کوریلی" کا رنگ غالب ہے۔ مثال کے طور پر مولانا شرر کے اُس تاریخی منظر کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو مرحوم نے "عہدِ قدیم" کی پہلی جلد میں اسکندرِ اعظم کی وفات پر پیش کیا ہے، واقعہ کا منظر شہر بابل میں ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اسکندرِ اعظم کی فاتح فوج سردار کے مرجانے سے ہراساں تھی، کس طرح شہر کے دروازے بند کر لئے گئے تھے اور خوف و ہراس کا دیوتا بادلوں کے تخت پر اپنی مہیب شکل میں براجمان تھا۔ کس طرح انتظامِ سلطنت کے متعلق جرنیلوں میں سرگوشیاں اور چہ می گوئیاں شروع ہوگئی تھیں، کس طرح مقتول دارا کی ماں ملکہ "سی سی گم بیس" نے بیٹے سے زیادہ سکندر کی وفات کا سوگ کیا تھا، کس طرح وہ محل کے ایک گوشے میں دَم بخود بیٹھ گئی تھی اور ایسی بیٹھی کہ پھر کبھی نہ اُٹھ سکی۔ ان سب واقعات کا مطالعہ کرنے سے اُس عہدِ قدیم کا پورا فوٹو نظر کے سامنے آجاتا ہے اور اندازِ بیان میں جو رومان پنہاں ہے اس کا اندازہ اور اُس کی تعریف تو حساس دل ہی کر سکتے ہیں۔ منشی صاحب نے مناظرِ فطرت کی تصویر کشی کرتے وقت بجائے رومان کے ان میں تخیل کو حل کر دیا ہے، وہ نیچر میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے ناول "میدانِ عمل" میں منشی پریم چند نے پانی برسنے کے بعد دھوپ نکلنے کا منظر اس طرح پیش کیا ہے:۔

"آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سنی ہے اور گویا مراقبے سے نکل کر اُسے دعائیں دے رہے ہیں، زمین گویا آنچل پھیلائے اُنکی دعاؤں کو بٹور رہی ہے۔"

ایک کوہستانی علاقے کی تصویر اس طرح پیش کی ہے:۔

"شمالی کوہستانوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے، سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی کھیلتی ناچتی گاتی چلی جا رہی ہے، گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے سیاہ متین خیال میں محو کھڑا ہے۔"

اِس منظر کا مخالف رخ بھی ایک جگہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول "بازارِ حسن" میں جب داروغہ کرشن چندر[1] خودکشی کے لئے گنگا کے کنارے آتے ہیں تو گنگا کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے، پچھلی رات کا وقت ہے:۔

---

[1] چوتھا حصہ

"گنگا کسی مریض کی طرح کہرے کی چادر اوڑھے کراہ رہی تھی، آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا، یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی اُداسی چھائی ہوئی تھی جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے۔"

گنگا ندی سے متعلق مندرجہ بالا مثالیں تو خیر صریحاً متضاد ہیں، لیکن منشی صاحب کا تضادِ ملیح بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ تضادِ ملیح سے وہ اجتماعِ اضداد مُراد ہے جس میں طنز یہ چشمک شامل ہو مثلاً حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام کا عام رنگ منشی پریم چند نثر میں اس اندازِ بیان کے ماہر ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اُن کے ناول "بازارِ حسن" میں اس قسم کی مثالیں بہت ہیں سدن سنگھ کی برات کے موقع پر لوگ ناچ رنگ کی بھی توقع رکھتے تھے، مگر وہاں رقص و سرود کا انتظام نہ تھا۔ اس لئے تماش بینوں نے شکایت کرنا شروع کی اور جھگڑنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک جٹا دھاری سادھو نمودار ہوئے (یعنی گجانند) اور تضادِ ملیح کے ساتھ اس طرح لوگوں کو تنبیہ کی:۔

ہائے افسوس یہاں کوئی ناچ نہیں، کوئی رنڈی نہیں، سب بابا لوگ اُداس بیٹھے ہیں، شیام کلیان کی دُھن کیسی منوہر ہے پر کوئی نہیں سنتا، کسی کے کان نہیں، سب ناچ دیکھنا چاہتے ہیں، یا تو انھیں ناچ دکھاؤ یا اپنے سر مُنڈاؤ۔ چلو میں ناچ دکھاؤں۔ دیکھو سامنے درخت کی پتیوں پر نرمل چاند کی کرنیں کیسی ناچ رہی ہیں، دیکھو تالاب میں کمل کے پھول پر پانی کی کرنیں کیسی ناچ رہی ہیں۔ جنگل میں جاکر دیکھو مور پر پھیلائے کیسا ناچ رہا ہے۔ کیا یہ دیوتاؤں کا ناچ پسند نہیں ہے؟ اچھا چلو، بھوتوں کا ناچ دکھاؤں، تمھارا پڑوسی غریب کسان زمیندار کے جوتے کھاکر کیسے ناچ رہا ہے، تمھارے بھائیوں کے گھر یتیم بچے بھوک سے باؤلے ہوکر کیسے ناچ رہے ہیں، اپنے گھر میں دیکھو، تمہاری بیوہ بھاوج کی آنکھوں میں درد اور غم کے آنسو کیسے ناچ رہے ہیں۔ یہ ناچ بھی پسند نہیں تو اپنے مَن میں دیکھو، کپٹ اور چھل کیسا ناچ رہا ہے، مکر اور موہ کے ساتھ تھرک رہا ہے، سارا سنسار رنگ بھوم ہے اس میں سب اپنا اپنا ناچ ناچ رہے ہیں...... تمھیں ناچ کا نام لیتے ہوئے لاج نہیں آتی۔"[1]

اِس عبارت میں ہندی الفاظ زیادہ ہیں صرف اِس وجہ سے کہ یہ الفاظ سادھو کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں۔

منشی صاحب کی طرزِ تحریر میں درد، سوز، دلکشی، اور ظرافت سب کچھ ہے، وہ ایک حسّاس قلب رکھتے تھے، اسی وجہ سے وہ اَدَبی گلدستوں میں دل کے ٹکڑے بھی شامل کر دیتے ہیں۔ بعض افسانہ نگار

۱۔ بازارِ حسن۔

حزن و طرب کے تاریک و روشن پہلوؤں میں سے کسی ایک کے ہو رہتے ہیں۔ منشی صاحب اِس قسم کی یکرنگی کے قائل نہیں، اُن کے نزدیک ہر خوشی کے ساتھ ایک مرغوب غم کا ہونا ضروری ہے۔ اِس مرغوب غم کو عُرفِ عام میں جذبات کہتے ہیں۔ اِس اعتبار سے منشی صاحب ڈاکٹر ٹیگور کے مقلد معلوم ہوتے ہیں، اور جہاں کہیں کوئی ایک پہلو زیادہ غالب ہو جاتا ہے وہ جیوٹ اور ہمت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ علامہ اقبال کی ہمنوائی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُنھیں نہ ماضی سے بَیر ہے اور نہ تقلیدِ مغرب کا شکوہ اُنھیں پسند ہے۔ وہ ہر قسم کی سختی کو شرافت اور ایثار سے برداشت کرنے اور ذاتی اغراض سے رشتہ توڑ کر سماج کی بہبود کو زندگی کا لازمہ سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اُن کے درد بھرے دل کی مثال ناول "میدانِ عمل" کا وہ منظر ہے جب امرکانت غریب سکینہ کے یہاں رومال کی قیمت دینے گیا، یہ غریب خاتون چراغ گُل کئے ہوئے رات کے وقت کپڑے دھو رہی تھی کیونکہ اور کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا کہ اُس کو پہن لیتی۔ امرکانت نے جب چراغ نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو سکینہ کو اپنی غریبی پر رو دینے کے سوا کچھ نہ بن پڑا۔

منشی صاحب کی طرزِ تحریر میں جو دلکشی ہے اُس کا حصہ اُردو زبان میں بہ نسبت ہندی کے کم ہے، تاہم اتنا بھی کم نہیں کہ اُردو ادیبوں میں وہ ممتاز نہ بن سکیں۔ مرحوم علامہ راشد الخیری کی سی غمگین عبارت کا دریا اُن کی تصانیف میں موجزن نہیں ہے۔ اِن دونوں زبردست ادیبوں میں یہی فرق ہے کہ راشد الخیری مرحوم دل کو پکڑتے ہیں تو بغیر دُکھائے اور رُلائے نہیں چھوڑتے، پریم چند کو جب کہیں ایسا موقع آجاتا ہے تو دل کی رگوں پر اس طرح اُنگلیاں رکھتے ہیں گویا ستار کے تار ہیں علامہ مرحوم کی تلقینِ عمل کا اثر فوری ہوتا ہے منشی صاحب کا دیرپا ہے۔ اپنے ناول "پردۂ مجاز" میں ایک کردار "منشی بجر دھر" کے متعلق اُن کا اندازِ تحریر کتنا دلچسپ ہے:-

"پھاگن کا مہینہ آیا، ڈھول مجیرے کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں، درختوں پر کوئل کوکی، گھروں میں مستورات کو گنے لگیں۔ منشی بجر دھر کی مجلس بھی آراستہ ہوئی ..... پھاگن آتے ہی مردنگ پر تھاپ پڑنے لگی، ذی حوصلہ آدمی تھے، فکر کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ اِس معاملہ میں وہ بڑے بڑے فلاسفروں سے بھی دو قدم آگے تھے، گذشتہ را صلوٰۃ کے قائل تھے، مگر آئندہ را احتیاط کے قائل نہ تھے ....."

ایک دن منشی بجر دھر کے پاس جھنگو گویا آیا تو منشی جی نے مگن ہو کر کہا کہ آج تم ہمارا گانا سنو اور میرا بائی کا یہ پد گانے لگے :-

رام کی میں دیوانی میرو درو نہ جانے کوئے
گھائل کی گت گھائل جانے جو کوئی گھائل ہوئے
شیش ناگ پہ سیج پیا کی کیہی بدھ ملنا ہوئے
درد کی ماری بن بن ڈولوں بید ملا نہیں کوئے رام کی میں دیوانی.....

باوجود مصائب روزگار کا شکار ہونے کے منشی صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے، اُن کے چہرے پر ہلکی سی مُسکان یعنی تبسم کی لطیف لہریں ہمیشہ کھیلا کرتی تھیں۔ اُن کے خمیر میں شوخی کی بھی آمیزش تھی جو بے تکلف دوستوں سے مذاق کی حد تک پہونچ جاتی تھی۔ ان کی تصانیف ایک غریب فاقہ مست اور غنی دل فقیر کے جذبات کا نمونہ ہیں۔ وہ نظیر اکبرآبادی کی طرح زندگی کے ہر پہلو پر تھوڑا بہت عبور ضرور رکھتے تھے۔

منشی صاحب کی بذلہ سنجی اور ظرافت تمام و کمال اصلاح پر مبنی ہے۔ بخلاف حضرت اکبرالہ آبادی اُس میں شکوہ کم اور ترغیب زیادہ ہے۔ انگریزی ناولسٹ ہارڈی کی دیہاتی خوش گپیاں اُسکی ناول "ہرے جنگل کے پیڑ تلے"¹ میں بعض جگہ ضرورت سے زیادہ سُبک ہو گئی ہیں اور اصلاحی پہلو کا تو نام ہی نہیں ہے، اور وہ محض مایۂ تفریح ہیں۔ منشی صاحب نے "بازارِ حسن" میں ایک جگہ خوب ہنسایا ہے شمن بائی نے جب اپنے پیشے کو ترک کرنے اور توبہ کر لینے کی ٹھان لی تو بٹھل داس سے کہا کہ میں ذرا چلتے چلاتے اپنے عاشقوں کی مزاج پرسی تو کر لوں، چنانچہ ایک ایک کر کے سب آنے لگے اور یکے بعد دیگرے اُس نے سب کے چونہ لگایا، پہلی مرتبہ سُہانے رسیا میاں ابوالوفا تشریف لائے اور بائی جی کے ہاتھ سے سگرٹ پینے کی خواہش کی، شمن نے دیا سلائی کھینچ کر بجائے سگرٹ کے داڑھی میں لگا دی اور وہ دھوکے کی ٹٹی آتشِ معصیت کے نذر ہو گئی۔ "میاں جی" نے ترش رو ہو کر اظہارِ بیزاری کیا اور بڑبڑانے لگے۔ اس کا جواب شمن بائی نے خوب دیا، یعنی یہ کہ :-

"آپ میرے دین کو ایمان کو دل کو روز جلاتے ہیں، کیا ان کی قیمت آپ کی داڑھی سے بھی کم ہے"

دوسرے نمبر پر لالہ چمن لال کی باری تھی، بھینسہ قد لالہ جی کے لئے تین ٹانگوں کی کرسی بچھائی گئی لالہ جی ہانپتے ہوئے کوٹھے پر چڑھے، کرسی پر بیٹھتے ہی توند کے بل گرے، بہت بگڑے، چوٹ آ گئی، کہنے لگے "ہائے رام کمر ٹوٹ گئی"۔ "ارے جرا (ذرا) میرے سہیس (سائیس) کو بُلا دو گھر جاؤنگا، اب یہاں آنے پر لانت (لعنت) ہے"۔ پل بھر میں سارا عشق بھول گئے۔ اسی طرح بگلا بھگت پنڈت دینا ناتھ کو

---

¹ "Under the Greenwood Tree"

تارکول میں شرابور کیا گیا۔

افسانہ نگار اور ناولسٹ بعض اوقات اپنے کرداروں کے نام بڑے دلچسپ رکھا کرتے مولانا نذیر احمد مرحوم کو اسم با مسمیٰ کردار ثابت کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ "ابن الوقت" "نصوح" "کلیم" "فہمیدہ بیگم" "حضرت بی بی" وغیرہ ایسے نام ہیں۔ جو اطوار و خصائل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ منشی صاحب کے بعض افسانے بھی اس قسم کی جدّت لئے ہوئے ہیں۔ ایک افسانہ "فتح"[1] کے عنوان سے اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"شہزادہ مسرور کی شادی ملکہ مخمور سے ہوئی اور دونوں آرام سے زندگی بسر کرنے لگے ....

لیکن بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اُن کی زندگی میں تغیّر نمودار ہوا، اراکین دربار میں بوالہوس خاں نام کا ایک فتنہ انگیز شخص تھا......"

منشی صاحب کے وہ صنائع بدائع جو جا بجا اُنھوں نے اپنی تصانیف میں استعمال کئے ہیں ایک طویل تبصرہ چاہتے ہیں جو یہاں ناممکن ہے، اس لئے صرف چند ضروری اوصاف پر اشارہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً تمثیلی قصّے یعنی ایسی حکایتیں جو لقمان حکیم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور جن کے کردار چڑیا چڑے، طوطی اور باز وغیرہ ہیں۔ اُن کا افسانہ "فکر دنیا" ایک کتّے کی کتھا ہے۔ اس کا سراپا اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"شیر کا سینہ، چیتے کی آنکھیں، گینڈے کا سا گٹھا ہوا جسم"

اس کتّے کی بہادری کا امتحان قصاب کی دوکان پر ہوا جبکہ ایک حسین کُتیا کے عشق میں مبتلا ہوکر یہ حضرت جنگل چھوڑ آبادی میں آئے تھے، قصاب کی دوکان پر بازاری غول اس پر جھپٹا تو

"اس کا منہ خود بخود سکڑ گیا، دانت باہر نکل آئے، اور دُم نیچے دَبک گئی، وہ ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوکر مدافعت کرنے لگا۔ جب ایک بار زور سے ڈپٹ کر حملہ کرتا تو ساری جمعیت دو قدم پیچھے ہٹ جاتی"

اس کُتّے کی حالت دیکھکر پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا باب ۴۵ بعنوان "قید خانے کے جانور" یاد آیا۔ اس میں چھپکلی، گلہری، بندر، چمگادڑ، سانپ، بچھو اور چیونٹیوں وغیرہ کا نہایت دلچسپ تذکرہ ہے۔ طوطے کی داستان اس طرح لکھی گئی ہے:۔

"توتوں کا ایک دوسرے سے اختلاط و محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا، کبھی کبھی دو نر توتوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ ان موقعوں پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا

---

[1] پریم بتیسی جلد دوم

دیکھتی رہتی اور جس کی فتح ہوتی اُسے اپنا مور دِ عنایت بناتی۔"

منشی صاحب کے صنائع بدائع کا مطالعہ کرنے پر اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ یہ جواہر ریزے دساوری نہیں بلکہ سودیشی اور ملکی پیداوار ہیں۔ اپنے افسانے نغمۂ روح میں منشی صاحب لکھتے ہیں:-

"اس نغمے میں کویل کی سی مستی، پپیہے کا سا درد، شیاما کا سا گداز، آبشاروں کا زیر اور طوفان کا بم ہے۔"

افسانہ "ستیہ گرہ" میں پنڈت گدادھر نے ہڑتالیوں کے خلاف بھوک ہڑتال کی تھی، جب ایک دن گذر گیا تو ایک تجربہ کار آدمی نے کہا کہ پنڈت کسی کے منانے میں نہ آئیں گے، وہ ایک دونے میں مزیدار مٹھائی کے رس گلّے کیوڑے سے خوب تر بتر کر کے لے گئے۔ پنڈت سے کہا مہراج برت توڑئے اور جھٹ دونا کھول دیا۔ دونا کھلتے ہی پنڈت جی کی رال میں مٹھاس سرایت کر گئی اور وہ "آنکھوں سے مٹھائی کھانے لگے"۔ غرض روزے کو توڑ دیا اور پورا دونا صاف کر گئے۔

جس طرح غالب نے فارسی الفاظ وضع کر کے اُردو زبان کی فرہنگ کو وسعت دی ہے، منشی صاحب نے اس زبان کو ہندی الفاظ سے مالا مال کر دیا۔ ایسے الفاظ کی چند مثالیں یہ ہیں مثلاً عورتوں میں آپس کی "تُم تُم"۔ خوشامدیوں کی "ٹھکر سہاتی" بات چیت، "دھرمی اُوجھے" کم ظرفوں کی لالچی ذہنیت وغیرہ۔ بد سے بدتر حالت کو "کڑھائی سے نکل کر چولھے میں" جانا لکھا ہے اور عارضی خفگی پر رو دینے کو لکھتے ہیں کہ "غصہ کیا کنوار کی برکھا تھی، دو چار بوندیں گریں، پھر آسمان صاف"۔ اسی طرح "بازارِ حسن" میں سمن بائی اپنے گھر کی بدنامی اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے کہتی ہے کہ "اس رام لیلا کی کیکئی میں ہی ہوں۔ خود بھی ڈوبی اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبی"۔

ہم نے منشی صاحب کے کرداروں (کیرکٹروں) کا مقابلہ و موازنہ پہلے ہی جا بجا کر دیا ہے، اس لئے اُن سے متعلق کسی مخصوص عنوان کی ضرورت نہیں، البتہ یہاں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منشی صاحب کے کرداروں میں عورتیں پیش پیش ہیں، مردانے کردار ان کے مقابلے میں اہمیت نہیں رکھتے۔ "گوشۂ عافیت" میں گیان سنگھ البتہ فتنہ پردازی اور معصیت میں شیکسپیر کے ڈرامہ اتھیلو[۱] کے آئیگو (Iago) سے کم نہیں، مگر گیان سنگھ کی آرزو حصولِ دولت ہے اور آئیگو محض شرارت و بغض باطنی کی وجہ سے ڈسڈیمونا[۲] کے خون کا باعث ہوتا ہے۔ سمن بائی، گائتری اور دیو پریا کا مقابلہ

۱۔ ... Othello ۲ ... Desdemonia

ہال کین کی میری، میری کوریلی کی سبل سے (جو حسن کے چولے بدلا کرتی تھی) کیا جا سکتا ہے۔ حال کے مطبوعہ ناول "میدانِ عمل" میں البتہ کئی مردانے کردار نمایاں ہیں۔ امر کانت، سلیم اور سکینہ تینوں ہیرو بننے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ میاں سلیم شاعر بھی ہیں، اور بابو امر کانت صحیح ادبی ذوق کے دلدادہ ہیں۔ بعض ناولوں میں منشی صاحب نے عورتوں کو ہمت، جیوٹ اور شجاعت کا سبق دیا ہے۔ ناول "بیوہ" میں پورنا نے اپنی عصمت بچاتے وقت کملا پرشاد کا دانت توڑ دیا اور ناک زخمی کر دی۔

"میدانِ عمل" کی سلونی تو اچھی خاصی دیونی ہے، دو گوروں اور ایک میم کو اس نے چھری سے مار ڈالا، ایک بار میاں سلیم کو بھی جیتر غٹو کیا تھا مگر بچ گئے۔ اس قسم کی بہادری کی تلقین کرنے میں منشی صاحب کا اندازِ بیان مہارت کے مرتبے سے متجاوز ہو گیا ہے۔ ناول "چوگانِ ہستی" میں اندھے سورداس کا کیرکٹر بہت دلچسپ ہے، خصوصاً اس وقت جبکہ بجرنگی کا لڑکا گھسیٹو اس کے ساتھ شرارت کرتا ہے۔ سورداس بھگت بڑا گرگیانی تھا، نرا مورکھ نہ تھا۔ مسٹر جان سیوک سے مذہبی تکرار میں بڑی وضعداری برت گیا، اور زمین کا بیوہار کرنے میں وہ منطق بگھاری کہ بڑے بڑے ہوشیار اس کو مان گئے۔

سلیم کے علاوہ منشی صاحب کے مسلمان کیرکٹر عموماً کمزور ہیں۔ "گوشۂ عافیت" میں ڈاکٹر عرفان علی کو چھوڑ کے سب نتھو خیرے بھرے ہوئے ہیں۔ "بازارِ حسن" میں کئی میونسپل کمشنر مسلمان ہیں، جو "قانون سود" اور "استیصال شاہدانِ بازاری" وغیرہ مسئلوں کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں۔ مگر رنگیلے رسیا ابوالوفا کے علاوہ سب یونہی ہیں۔ "چوگانِ ہستی" میں عیسائیوں کا عمل دخل ہے، اِکّے دُکّے مسلمان بھی ہیں۔

منشی صاحب کے افسانے اور مضامین خدا کے فضل سے سبھی کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں، ان میں سے "خاک پروانہ" میں ستیا گرہ، جیک (فکر دنیا) اور مستعار گھڑی بہت دلچسپ افسانے ہیں۔ "خواب و خیال" میں "نوک جھونک" اور "مایۂ تفریح" نہایت عمدہ ہیں۔ "فردوسِ خیال" میں "نیک بختی کے تازیانے" "عفو" اور "ڈگری کے روپئے" نہایت کامیاب افسانے ہیں۔ "پریم پچیسی" میں "کرامات کا تیغہ" "آہِ بیکس" اور "گناہ کا اگن کنڈ" قابل مطالعہ ہیں اور "پریم بتیسی" میں "ونیک کا دیوالہ" "حجِ اکبر" اور "سوتیلی ماں" خوب ہیں۔

رہے ناول اُن کے متعلق اوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، یہاں پر مجملاً صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ اُن کے بہترین ناول "پردۂ مجاز" اور "چوگانِ ہستی" ہیں۔ "پردۂ مجاز" تو بمنزلۂ صحفِ الہامی

کے ہے۔ شیدایانِ علم کو اس کے مطالعہ سے غذائے روح اور مقویاتِ قلب کے ذخیرے نہایت آسانی سے مل جائیں گے۔ "بازارِ حسن" اور "میدانِ عمل" کا مطالعہ سبق آموز ہونے کے علاوہ نہایت ہی دلچسپ ثابت ہوگا۔ ممکن ہے ان سے بھی زیادہ دلچسپ ناول ہوں جو راقم کی نظر سے نہ گذرے ہوں، بہرحال اب تو پریم چند اِس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں کیا اب بھی اُن کی قدر نہ ہوگی اور اُن کی تصانیف پردۂ خفا میں پڑی رہیں گی؟ اُن کے وہ افسانے جو "آدھوری" اور "سرسوتی" وغیرہ میں میں شائع ہوئے ہیں اُن کے مجموعے شائع ہو جانا چاہیئے اور اُن کے ترجمے اُردو زبان کے لئے بھی مفید ہونگے۔ ان کے اکثر مضامین "زمانہ" اور بعض دیگر رسائل میں دیکھے گئے ہیں۔ ان سب کو یکجا کر کے ایک بڑی کتاب کی صورت میں شائع کرنا چاہیئے۔

پریم چند کا آرٹ

ہندوستانی ادب پر پریم چند کے بڑے احسانات ہیں، اُنھوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جاکر دیکھا۔ اُنھوں نے بے زبانوں کو زبان دی اور اُن کی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔

پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک کھونٹی تھی حقیقت کو لٹکانے کے لئے، سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ اُن کی زندگی کا مشن ہوگیا تھا۔

پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے۔ وقتی مسائل کی اہمیت کو اُنھوں نے اِس شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اس پر قربان کردیا۔ افسانہ نگاری میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں حالی کا۔ دونوں پیش رَو تھے، دونوں پیغمبر تھے، دونوں بیداری کے نقیب تھے۔ شخصی حیثیت سے بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سادگی کے رسیا اور اخلاص کے پجاری اُنھوں نے زندگی کی کامرانی کا پیغام سُنایا، اُسی میں عمر گذاری اور سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجے کو پہنچے۔

(رسالہ "اُردو"۔ اکتوبر ۳۶ء)

میدانِ عمل

منشی پریم چند کے آخری اُردو ناول پر ایک نظر

(از مسٹر مالک رام ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

"میدانِ عمل"۔ جو منشی پریم چند کی وفات سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا اُن کے دوسرے ناولوں کی طرح ان کی تمام خصوصیات کا حامل ہے مختصراً قصہ یہ ہے:۔

لالہ سمرکانت دہلی کے نہایت مالدار لیکن حد درجہ کنجوس سیٹھ ہیں۔ انہوں نے بھی دوسرے بیسیوں ساہوکاروں کی طرح اپنی بے اندازہ دولت دھوکے دھڑی سے جمع کی ہے۔ اُن کی دو شادیاں ہوئیں۔ لیکن اب کوئی بیوی زندہ نہیں۔ پہلی بیوی سے اُن کا اکلوتا لڑکا امرکانت ہے اور دوسری سے ایک لڑکی نینا۔ امرکانت کو اپنی تعلیم کے زمانہ میں بھی خرچ کے متعلق مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ سیٹھ جی کے خیال میں اسکی تعلیم کا سب خرچ لغو اور فضول ہے۔ دوران تعلیم ہی میں امرکانت کی شادی لکھنؤ کی ایک مالدار بیوہ کی خوبصورت۔ فیشن کی دلدادہ۔ خود پرست اور نخوت پسند اکلوتی صاحبزادی سکھدا سے ہو جاتی ہے۔ امرکانت پہلے ہی اپنے پرایوں کی گھڑکیوں سے بیزار ہے۔ اس غریب کو بیوی بھی ملی تو ایسی جو محبت سے زیادہ حکومت کرنا جانتی ہے۔ دونوں کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین ہے۔ وہ پورب کی کہے تو یہ پچھم کی۔ یہ سادگی پسند ہے تو اسے چوبیس گھنٹہ سولہ سنگار سے فرصت نہیں۔ آخر جب امرکانت کی تعلیم کا زمانہ ختم ہوا۔ تو سیٹھ جی نے چاہا کہ وہ گھر کا کاروبار سنبھالے اور انہیں گرہستی کے جھنجھٹ سے آزاد کر دے۔ امرکانت کو والد کے جعل فریب کے طریقوں سے نفرت تھی۔ وہ غریبوں کی زار حالت دیکھ دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ بھلا وہ ان کے نقشِ قدم پر کیسے چل سکتا تھا آخر وہ سب کچھ تج کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے اور ہردوار کے قریب ایک گاؤں میں جا کر ڈیرا جماتا ہے۔ وہاں اُس نے غریب چماروں کے بچوں کو تعلیم دینا شروع کیا۔ اچھوتوں کے لئے مندروں کے دروازے کھولنے کے لئے ایک کامیاب ستیہ آگرہ ہوتا ہے۔ جس میں اس کی لاجونتی بیوی سکھدا نمایاں حصہ لیتی ہے۔ آخر مزدور پیشہ لوگوں کے لئے گھر بنانے کو جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ امرکانت کی بیوی اور بعض دوسرے مقامی رہنماؤں کی خواہش ہے کہ ایک

خاص قطعۂ زمین اس کام کے لئے دے دیا جائے۔ لیکن میونسپل بورڈ اس مطالبہ کو منظور نہیں کرتا۔ انجام کار بورڈ کے اس ناہمدردانہ رویہ کے خلاف احتجاجی ہڑتال کا فیصلہ ہوتا ہے جس میں امرکانت کی بیوی۔ باپ۔ ساس۔ اور استاد (ڈاکٹر شانتی کمار) گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کی بہن نیناؔ بھی شہید ہو جاتی ہے۔ یہ قربانیاں رنگ لاتی ہیں۔ بورڈ تمام مطالبات تسلیم کر لیتا ہے اور وہ قطعۂ زمین مزدوروں کے مکانات کے لئے مل جاتا ہے۔"

جہاں امرکانت ہے وہاں کا نقشہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کاشتکاروں پر لگان کی وصولی کے لئے جو سختیاں ہوتی ہیں۔ اُن سے متاثر ہو کر مالگذاری میں تخفیف کی تحریک شروع کی جاتی ہے۔ امرکانت اس تحریک کا روح رواں ہے۔ حکومت سختی کرتی ہے۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ہے۔ بے دخلی۔ قرقیوں اور گولیوں تک کی نوبت آتی ہے۔ امرکانت اور کئی دیگر اصحاب جیلخانوں میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ آخر بعض لوگوں کے درمیان پڑنے سے حکومت ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دیتی ہے۔ دونوں تحریکوں کے قیدیوں کی رہائی لکھنؤ جیل سے ایک دن ہی عمل میں آتی ہے۔ اور اس طرح سب بچھڑے ہوئے خوشی خوشی ملتے ہیں۔

منشی پریم چند کے پہلے ناولوں کا خاص مقصد ہماری سماجی امراض کی تشخیص اور اُن کا علاج تجویز کرنا تھا۔ چونکہ اُنھیں خود بھی زمانہ کے سرد و گرم اور نشیب و فراز کا کافی تجربہ تھا۔ اس لئے ان کی تشخیص اور نسخہ دونوں کی صحت میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن میدانِ عمل میں معاشرتی سے زیادہ سیاسی پہلو نمایاں ہے۔ آخری دنوں میں ان کے مختصر افسانوں میں بھی یہی رنگ غالب ہو گیا تھا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ہر ایک قومی مصنف اپنے گرد و پیش کے حالات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس کی تحریر قوم کے احساسات اور مساعی کا آئینہ ہوتی ہے۔ پھر منشی پریم چند تو یوں بھی قدرت کی طرف سے غیر معمولی طور پر اثر پذیر طبیعت لے کر آئے تھے۔ بھلا وہ کیسے اس اثر سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

اگر ایک فقرہ میں اس ناول کا مقصد بیان کیا جائے تو یہ ناول ایک گرد و پیش کے حالات سے متاثر اور حساس دل و دماغ والے نوجوانوں کے کردار کی ارتقائی منازل کا بیان ہے لیکن درحقیقت اس ناول میں ہماری پچھلے دس پندرہ برس کی تمام تحریکوں کا نفسیاتی مطالعہ ہے

کہیں اچھوتوں کے لئے مندروں کے دروازے کھل رہے ہیں۔ تو کہیں سیوا آشرم بن رہے ہیں کہیں لگان کی تخفیف کی تحریک ہے تو کہیں گرام سدھار کی کوشش ہے۔ کہیں مزدوروں کی تنظیم ہے تو کہیں اُن کی اقتصادی بہتری کے وسائل کا بیان ہے۔ غرض مصنف نے اِن پانچسو صفحہ کی کتاب میں استادانہ چابکدستی کے ساتھ ہماری تمام بیماریوں کا نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے۔

لیکن محض واقعات کے بیان کر دینے میں کوئی کمال نہیں تھا۔ یہ ایک معمولی درجہ کا مصنّف بھی کر سکتا ہے۔ کرداروں کے ہر ایک عمل کی تہ میں جو جذبہ کام کر رہا ہے۔ منشی پریم چند نے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے جب وہ اپنے مطالعہ کے نتائج کو سادہ سادہ لفظوں اور دل نشین انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"سیٹھ سمرکانت کے دن رات جائز اور ناجائز۔ جائز کم اور ناجائز زیادہ۔ طریقوں سے روپیہ جمع کرنے میں گزرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ امرکانت بھی میرے قدموں پر چلے۔ ایک دن اُنکی غیر حاضری میں امرکانت دوکان پر بیٹھا ہے۔ ایک شخص چوری کا مال فروخت کرنے آتا ہے۔ امرکانت دو سو کی چیز تیس روپیہ میں لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ جب سمرکانت واپس آتے ہیں اور انھیں صاحبزادہ کی کارگزاری کا حال معلوم ہوتا ہے۔ تو وہ سخت ناراض ہوتے ہیں۔ جب امرکانت کہتا ہے "میں تو چوری کے مال کو مُفت بھی نہ لیتا۔ ایسے روزگار پر میں لعنت بھیجتا ہوں" تو سمرکانت آپے سے باہر ہو کر بولے:۔

"چُپ بھی رہو۔ شرماتے نہیں۔ اوپر سے باتیں بناتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپیہ مُفت میں بیٹھے بٹھائے ملتے تھے۔ وہ تم نے اپنے اصول پروری کے زعم میں کھو دیئے۔ اس پر بھی اکڑتے ہو۔ جانتے بھی ہو دولت کیا چیز ہے؟ سال میں ایک بار بھی گنگا اشنان کرتے ہو؟ ایک بار بھی دیوتاؤں کو جل چڑھاتے ہو؟ کبھی رام کا نام بھی لیا ہے زندگی میں؟ کبھی ایکادشی یا کوئی دوسرا برت رکھا ہے؟ کبھی کتھا پران پڑھتے یا سنتے ہو؟ تم کیا جانو دہرم کیا چیز ہے۔ دہرم دوسری شئے ہے اور روزگار دوسری شئے ہے۔ چھی۔ صاف ڈیڑھ سو پانی میں ڈال دیئے۔"

یہی سیٹھ امرکانت ایک دوسرے موقعہ پر بالمیکی رامائن کی کتھا کے لئے نوسو روپیہ چندہ دے دیتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی عملی زندگی میں تمام وہ باتیں ہیں۔ جو ناپسندیدہ ہیں۔ چوری کا مال خریدنا شرح سود کا بہت زیادہ ہونا۔ غریبوں کا خون چوسنا اور دوسری جعل فریب کی باتیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مذہب کی رسوم کے بہت زیادہ پابند ہیں۔ صبح نہائے بغیر ان کے لئے پانی کا ایک گھونٹ

پینا حرام ہے۔ شام کو مندر کی آرتی اور تلسی دل چڑھانا۔ ان میں کبھی ناغہ نہیں ہونے پاتا۔"

کس قدر سچی تصویر ہے ہمارے ان گنجے سر اور بڑی بڑی توند والے سیٹھ ساہوکاروں کی۔ وہ مذہب اور عقائد جن کا ہمارے اعمال اور دوسروں کے ساتھ تعلقات پر کچھ اثر نہیں پڑتا اُن سے کیا فائدہ۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مذہب کا مقصد اخلاق کو بلند کرنا ہے۔ مگر اس میں ہمیں یقین نہیں رہا۔ یہ محض چند نمائشی رسُوم و رواج تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم عملی زندگی میں مذہب کی حقیقی روح سے جس قدر دور ہوتے جاتے ہیں۔ اسی قدر ہماری اس نمائش میں غلو کا پہلو زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

مندر کے ستیہ آگرہ کے دوران میں جب لاٹھی چلی تو ڈاکٹر شانتی کمار کو سخت چوٹیں آئیں اور وہ ہسپتال پہونچا دیئے گئے۔ اُن کی غیر حاضری میں تحریک کی باگ ڈور سکھدا کے ہاتھ آئی جس دن گولی چلی۔ اس دن وہ سینہ سپر ہجوم کے آگے آگے تھی۔ آخر جب مندر کے دروازے کھول دیئے گئے۔ تو سارے شہر میں سکھدا کی بے جگری اور تہور کا غلغلہ تھا۔ وہ مرجع خلائق بن گئی۔ خصوصاً نچلے طبقہ کے لوگ تو اس کی پوجا کرنے لگے اور ساری تحریک کی کامیابی کا سہرا سکھدا کے سر باندھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہنوز ہسپتال میں بیمار پڑے تھے۔ دیکھیئے اس موقعہ پر منشی صاحب نے کیا پتہ کی بات لکھی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب اب اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ پر اب بھی اتنے کمزور تھے۔ کہ لاٹھی کے سہارے بغیر ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ چوٹیں انہوں نے کھائیں۔ چھ مہینے سے اسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔ اور نام ہوا سکھدا کا۔ یہ صدمہ انھیں اور گھلائے ڈالتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے مخلص دوستوں سے بھی کبھی اپنا دردِ دل نہیں کہا۔ مگر یہ کانٹا کھٹکتا ضرور تھا۔ اگر سکھدا عورت نہ ہوتی اور وہ بھی ایک عزیز شاگرد اور دوست کی بیوی تو شاید وہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے۔"

جب سکھدا اسپتال میں ان کی عیادت کو گئی۔ تو کہنے لگے۔

"زندگی کے چھ مہینے گویا کم ہو گئے۔ بلکہ آدھی عمر کہیئے۔ میں اب اچھا ہو کر بھی آدھا ہی رہوں گا۔ کتنی شرم آتی ہے۔ کہ دیویاں باہر نکل کر کام کریں۔ اور میں کمرے میں بند پڑا رہوں۔"

سکھدا نے جیسے اُن کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:۔

"آپ نے اس شہر میں جتنی بیداری پھیلائی۔ اس حساب سے تو آپ کی عمر چوگنی ہو گئی۔ مجھے تو بیٹھے بٹھائے جس مل گیا۔"

"یہ سن کر شانتی کمار کے زرد چہرے پر روحانی مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ سکھدا کی زبان سے یہ سند پا کر گویا انہیں کونین کی دولت مل گئی۔"

کس قدر نفسیاتی مطالعہ ہے۔ یہ ڈاکٹر شانتی کمار وہ ہیں۔ جنہوں نے خدمتِ قوم کے لئے اپنی سینکڑوں روپیہ ماہوار کی ملازمت پر لات مار دی۔ جو ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آئے مگر اہلِ ملک کے افلاس کو دیکھکر انہوں نے سادہ زندگی کو اپنا شعار بنا لیا۔ موٹا جھوٹا کھاتے اور موٹا جھوٹا پہنتے۔ اچھوتوں کے مندر میں داخلہ کے حق کو تسلیم کرانے کی خاطر اُنہوں نے لاٹھیاں کھائیں ان بے غرض خدمات کے باوجود وہ اس خواہش سے بلند نہ ہو سکے۔ کہ لوگ میری تعریف کریں اور وہ کُڑھ رہے ہیں۔ کہ ہائے دوسروں کی تعریف ہو رہی ہے۔ اور میرا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات ہم اپنے آپ کو دھوکا دے لیتے ہیں۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ہم واقعی بے غرض خدمت کر رہے ہیں۔ اس کام سے ہمیں کوئی ذاتی منفعت مقصود نہیں۔ فرض کو فرض کی خاطر نبھا رہے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں اس پندار کے بُت کو ٹھیس لگی۔ ہمیں اپنی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ کہ ابھی تک ہم دُنیا کی نیکنامی اور بدنامی سے بلند نہیں ہوئے۔

انھیں ڈاکٹر شانتی کمار کے ایک دوست مسٹر غزنوی ہیں۔ ایک ضلع کے افسر اعلیٰ ہیں۔ ولایت میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ واپس آ کر دونوں نے اپنی اپنی علیحدہ راہ ڈھونڈی۔ وہ قوم کے پیچھے سب کچھ تیاگ کے فقیر ہو گئے۔ یہ آئی۔ سی۔ ایس ہو گئے اور ایک ضلع کے حاکم بن بیٹھے۔ ایک مدت کے بعد کسی نے مسٹر غزنوی سے ان کا ذکر کیا۔ تو کہنے لگے

"ذرا ان کا پتہ تو بتانا۔ میں یہاں آنے کی دعوت دوں گا"

سلیم نے سر ہلایا۔ "انھیں کہاں فرصت۔ میں نے بلایا تھا۔ نہیں آئے"

غزنوی نے مُسکرا کر کہا "تم نے رسم کے طور پر بلایا ہوگا۔ کسی انسٹی ٹیوشن کی طرف سے بلاؤ۔ اور کچھ چندہ کرا دینے کا وعدہ کرو۔ دیکھو سر کے بل دوڑے آتے ہیں یا نہیں۔ ان قومی خادموں کی جان چندہ ہے۔ ایمان چندہ ہے۔ اور شاید خدا بھی چندہ ہے۔ جسے دیکھو چندہ کی ہائے ہائے۔ میں نے کئی بار ان خادموں کو خوب چرکا دیا ہے۔ اُس وقت اُن کی صورت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ہیں کہ گالیاں دے رہے ہیں۔ پینترے بدل رہے ہیں۔ زبان سے توپ کے گولے چھوڑ رہے ہیں۔ اور آپ اُن کی بوکھلاہٹ کا مزا اُٹھا رہے ہو ہیں۔ میں نے تو ایک بار ایک لیڈر کو پاگل خانہ میں بند کرا دیا تھا

کہتے ہیں اپنے کو قوم کا خادم اور سمجھتے ہیں آقا۔ ؟

اس تقریر کا لطف کچھ وہی اُٹھا سکتا ہے۔ جسے کسی ایسے لیڈر سے واسطہ پڑا ہو یہ بالکل
ح ہے کہ وہ خادم سے زیادہ اپنے آپ کو قوم کا مخدوم سمجھتے ہیں۔ ذرا کوئی بات ان کے مزاج
رائے کے خلاف ہوئی اور وہ آپے سے باہر ہوگئے۔ بس منہ پر کف ہے اور آستینیں چڑھی ہوئی
یں۔ آنکھیں لال ہیں اور نتھنے پھولے ہوئے۔ اور ان سب کو مغلظات سنا رہے ہیں۔ جنھوں نے
ن "دیوتا" سے اختلافِ رائے کی جرأت کی تھی۔

امر کانت نے جس گاؤں میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ وہاں ایک زمانہ کی ستائی ہوئی اور
ٹھوکریں کھائی ہوئی حسین بیوہ مُنّی رہتی تھی۔ اُن کی پہلے بھی معمولی سی جان پہچان تھی۔ لیکن چونکہ امر کانت
ہاں اسی گھر کا مہمان تھا جس میں مُنّی رہتی تھی۔ اس لئے اب انھیں ایک دوسرے سے زیادہ ملنے جلنے
ور ربط ضبط کا موقع ملا۔ تو دونوں کی دلچسپی گہرا رنگ اختیار کرنے لگی۔ لیکن امر کانت کی طبیعت
ں حد درجہ کی شرم و حیا تھی۔ اس دلبستگی کے باوجود اس سے کبھی خواب میں بھی یہ اُمید نہ ہوسکتی تھی
، وہ کوئی نازیبا جرأت کریگا۔ ایک شام مُنّی کوئیں سے پانی لینے جا رہی تھی کہ راہ میں امر کانت
ا جھونپڑی میں ٹھہر گئی اور باتیں ہونے لگیں۔ دیکھئے اس مقام پر مصنف نے ایک عورت کے جذبات
ا کیسا صحیح نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے۔

"منی نے کلسا زمین پر رکھ دیا اور بولی۔ "میں تم سے باتوں میں نہ جیتوں گی لالہ! لیکن تم نہ تھے تو میں بڑے چین سے رہتی تھی۔ گھر کا دھندا کرتی تھی۔ روکھا سوکھا کھاتی تھی اور سو رہتی تھی۔ تم نے میری وہ بے فکری چھین لی۔ اپنے من میں کہتے ہوگے بڑی چنچل عورت ہے۔ کہو جب مرد ہی عورت ہوجائے۔ تو عورت کو مرد بننا پڑیگا۔ جانتی ہوں۔ تم مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ مجھ سے گلا چھڑاتے ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں۔ کہ میں تمھیں پا نہیں سکتی۔ لیکن پھر بھی تمھارے پیچھے پیچھے پھرتی ہوں۔ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی سمجھو مجھے معلوم ہو کہ میں بھی عورت ہوں۔ میرے سر پر بھی کوئی ہے میری زندگی بھی کسی کے کام آسکتی ہے"

امر نے اب تک مُنّی کو اسی طرح دیکھا تھا۔ جیسے ہر ایک نوجوان کسی حسینہ کو دیکھتا ہے۔ محبت سے نہیں محض رنگین مزاجی سے۔ مگر اس التجا نے اس کی آتشِ شوق کو بیدار کردیا............ بولا "آؤ ہم تم کہیں چلے چلیں منی! وہاں میں یہ کہوں گا یہ میری ...."

منی نے اس کے مُنہہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی "بس اور کچھ نہ کہنا۔ مرد سب ایک سے ہوتے ہیں میں کیا کہتی تھی۔ اور تم کیا سمجھ گئے۔"

منی نے کلسا اُٹھایا۔ اور کنوئیں کی طرف چلی۔ امر منی کے اس التفات کے بعد یہ احتراز دیکھکر حیران رہ گیا۔ واقعی حسینہ کا دل پہیلی ہے۔

دفعتہً منی نے پکارا۔ "لالہ! تازہ پانی لائی ہوں۔ ایک لوٹا لاؤں"

امر کو پیاس لگی تھی۔ مگر کہا "ابھی تو پانی پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

اقتباس بجائے خود کافی لمبا ہوگیا۔ حالانکہ اس میں بھی کتر بیونت کرنا پڑی۔ لیکن کیسے نازک جذبات ہیں جو ان سطروں میں بیان کئے گئے ہیں۔ خصوصاً منی کے تشنۂ محبت دِل کی التجا جو دردناک الفاظ میں بیان کی ہے۔ وہ اپنی آپ مثال ہے۔

غرض میدانِ عمل میں جہاں ہماری پچھلے چند برس کی تحریکوں پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ وہاں اس کے کردار بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں۔ ان کے جذبات اور احساسات خواہشات اور امنگیں۔ رشک وحسد کے جذبات بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے واقعی اس دنیا کے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ آج تک ہوتے آئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے کوئی مافوق العادت یا غیر معمولی کردار نہیں پیش کیا گیا۔ جس سے ہم مرغوب ہوجائیں۔ یا جس کا کوئی فعل یا قول غیر فطری معلوم ہو۔ سب ہماری طرح اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔

یہ نہیں کہ اس ناول میں کوئی نقص نہیں۔ اس میں کئی جگہ مصنف سے لغزش ہوگئی ہے مثلاً

(۱) منی کا عدالت میں بیان اور رہائی کے بعد اس کی تقریر جس زبان میں ہے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کوئی نہایت تعلیم یافتہ اور قابل عورت ہے۔ حالانکہ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے کسی تقریر کی جس ایسی فصیح و بلیغ تقریر تو درکنار امید رکھنا ہی بے معنی ہے۔ لیکن یہی منی جب جیل میں سکھدا سے گفتگو کرتی ہے۔ تو ہزار کو ہجار اور سزا کو سجا کہتی ہے اور اس کی باتوں سے گنوار پن ٹپکتا ہے۔

(۲) جس دن مندر میں پہلے دن ہنگامہ ہوا سکھدا وہاں حسبِ معمول کتھا سننے نہیں گئی تھی۔ لیکن واپسی پر سکھدا اور نینا کو باتیں کرتے دکھایا گیا ہے۔

(۳) جس دن منی رام نے نینا کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اس کے پانچ دن بعد منی رام کے والد سیٹھ دھنی رام

جیل میں سب قیدیوں سے ملنے جاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں وہ کہتے ہیں۔ کہ منی رام کی وفات پر گورنر نے ماتم پرسی کا تار بھیجا تھا۔ ان پانچ دنوں میں کسی عدالت کی طرف سے تو منی رام کو پھانسی کی سزا ہو نہیں سکتی تھی۔ اور اگر اس نے خودکشی کی تھی۔ تو اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔

ایسے ہی چند ایک اور معمولی نقائص ہیں۔ ایک بڑا نقص جو منشی صاحب مرحوم کے قریباً تمام ناولوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ جہاں وہ عام لوگوں خصوصاً مزدوروں۔ کاشتکاروں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے مکالمہ میں واقعیت کا رنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہاں ان کا اعلیٰ طبقہ کی سوسائٹی کا مکالمہ کامیاب نہیں۔ اسی جگہ کتابی تحریر یا زیادہ سے زیادہ تقریر کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ لیکن بے عیب ذات خالق کی ہے۔ اسکے سوا کوئی چیز نقص سے خالی نہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کی تمام کتابوں میں جس سادہ زبان اور انشا میں عوام اور خواص کے نفسیاتی مطالعہ کے نتائج پیش کئے گئے ہیں وہ منشی پریم چند ہی کا حصہ ہیں۔ کم از کم ہماری زبان میں ان کی مثال نہیں۔ چونکہ مرحوم عربی۔ فارسی سے زیادہ مزاولت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ کوئی صاحب انکے بعض الفاظ کے استعمال پر معترض ہوں۔ لیکن معاشری خرابیوں کی اصلاح کے لئے جو کام ٹالسٹائی چیخوف اور گورکی نے روس میں کیا وہی یہاں ہمارے لئے منشی پریم چند نے کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی زندگی میں ہی قبول عام کی سند ملی اور وہ فارغ البال جئے اور مرے۔ منشی پریم چند کو بھی اب کچھ کچھ قبولِ عام حاصل ہو چلا تھا لیکن دوسری شق کے متعلق ان پر جو کچھ بیتی۔ اس کا بیان ہماری بے حسی اور ناقدری کا ایسا دردناک رونا ہے کہ اسے سن کر ہمیں شرم سے سر جھکا لینا پڑتا ہے۔ آئندہ لوگ منشی پریم چند کے فن اور کمال پر تنقیدی مقالے اور کتابیں لکھیں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ انھیں مرتے وقت اپنے پسماندگان کی طرف سے اطمینان کامل نہ تھا۔

اپنے دل کو سمجھانے کے لئے دلائل کی کمی نہیں ہوتی۔ دُنیا میں آسان ترین کام خود کو دھوکا دینا ہے

قوم پرستی کیلئے آہنی استقلال اور زبردست روحانی طاقت درکار ہے۔ تن پروری اور قوم پرستی میں بُعد المشرقین ہے

(پریم پچیسی) پریم چند

"گئودان"

منشی پریم چند کا آخری ناول

منشی پریم چند کو "شہنشاہ ناول نویساں" کا خطاب دیا گیا ہے، واقعی انھوں نے افسانوں اور ناولوں کی جلدوں پر جلدیں لکھ کر ہندوستانی ادب کو لٹریری دولت سے مالا مال کر دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ناولوں اور کہانیوں نے پریم چند کو دُنیا کے بڑے بڑے مشہور فسانہ نگاروں ٹالسٹائی، موپاسان، ٹیگور، اوہنری، اور کپلنگ کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے ناولوں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کے سب سے بڑے ناول نویس تھے گو ہماری رائے میں اُن کی طبع رسا کے جوہر بڑے ناولوں میں اس قدر نہیں کھلتے جتنے کہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں کھلتے ہیں۔ وہ کسی "رائے بہادر" یا نیم صاحب بہادر" مسٹر شرما بی۔ اے، ایم۔ اے، بی۔ ایل، ڈی لٹ" کی تصویر اس قدر خوبصورت خط و خال کے ساتھ نہیں کھینچتے جتنی کہ ایک غریب ہندوستانی دیہاتی کی کھینچتے ہیں۔ چنانچہ منشی پریم چند کے ناول "گئودان" کے پہلے ہی صفحہ پر جب ایک بڈھے جھریاں پڑے ہوئے دیہاتی "ہوری" اور اس کی زبان دراز مگر وفادار اور خدمتگذار دیہاتی بیوی مسماۃ "دھنیا" سے ملاقات ہوتی ہے تو ہماری طبیعت حد درجہ شگفتہ ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں سیکڑوں آدمیوں کی کردار بندی کی ہے لیکن ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس وفاشعار مگر لڑاکا، شریف النفس مگر کسی قدر خود غرض، جفاکش مگر فاقہ مست جوڑے سے زیادہ صحیح "ہندوستانی" کیریکٹر اور کہیں نہیں دیکھا۔

لیکن یہیں ایک بڑی گڑبڑ بھی پیدا ہو گئی ہے، یعنی جب عزت و آبرو، محنت و جفاکشی اور غم و الم کے ایک سیدھے سادے قصہ میں ہمارے دل میں ہوری اور دھنیا اور اُن کے پریشان کن بچوں سے محبت پیدا ہو جاتی ہے تو پریم چند زبردستی اور غیر فطری طور پر ایک دوسری دنیا کا قصہ بیان کرنے لگتے ہیں جس کو فی الحقیقت ایک دوسرے ناول میں قلمبند ہونا چاہئے تھا۔ دوسری دنیا سے ہمارا مطلب وہ طبقہ ہے جو دولت دنیا سے مالا مال ہے اور جس کے گھر کیا محلہ میں بھی فاقہ کی صورت نظر نہیں آتی، جس میں ضرورت

پریم چند نے شاید یہ ظاہر کرنے کے لئے اِس قصّہ کو اس ناول میں داخل کیا ہے کہ جس شخص کا قلم غریبوں کی دنیا پیدا کر سکتا ہے اُس کا قلم قارون کی ذریات بھی پیدا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ ہماری تو یہی رائے ہے کہ غریبوں کی دنیا ہوتی یا امیروں کی، مگر تنہا ہوتی تو یہ ناول نہایت شاندار ہوتا۔ لیکن دونوں دنیاؤں کو نامناسب طریقے سے خلط ملط کر دینے سے پریم چند کا یہ ناول "آدھا تیتر آدھا بٹیر" ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ "گئو دان" کا ہوری اور اُس کی تند خو بیوی دھنیا منشی پریم چند کی ادبی شہرت کو رہتی دنیا تک قائم رکھیں گی۔ یہ لازوال شہرت اُنھیں مسٹر کھنّہ یا مسٹر تنکھا یا پروفیسر مہتہ کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پروفیسر مہتہ صاحب تو عجیب چیز واقع ہوئے ہیں۔ ناول کے پلاٹ میں جیسا جیسا موقعہ آتا ہے ویسے ہی وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے جاتے ہیں، اور ایسی خصوصیات کا اظہار کرنے لگتے ہیں گویا ان خصوصیات کو وہ ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوئے تھے۔ "گئو دان" میں جب یہ پروفیسر صاحب سب سے پہلے نمودار ہوتے ہیں تو ایک عالم فاضل مگر بد دماغ پنڈت کی حیثیت سے تشریف لاتے ہیں، جن کے دلی جذبات محض اس وجہ سے مجروح ہو گئے ہیں کہ اُن کی تازہ فلسفیانہ تصنیف کی کسی نے قصیدہ خوانی نہیں کی۔ اس کے بعد جب وہ دیگر ابواب میں تشریف لاتے ہیں تو نہایت ہی مضبوط سیرت کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جنھیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ہوتی ہے۔ بلکہ جن کی ذہنیت "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند" کی مصداق ہے۔ پروفیسر صاحب خیر سے خدا کی ہستی پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ وہ (Agnostic) واقع ہوئے ہیں۔ (پریم چند کے اکثر علما اور پنڈت ایسے ہی ہیں) لیکن جب دوران قصہ میں ان کے قلب پر کسی بات کا گہرا اثر پڑتا ہے تو گفتگو میں ان کی زبان سے سیکڑوں مرتبہ "خدا نہ کرے" یا "خدانخواستہ" یا "خدا کرے" یا "انشاء اللہ" نکل جاتا ہے۔

"گئو دان" کے آخری حصّہ میں ایک اور نقص بھی پیدا ہو گیا ہے، یعنی اٹھائیسویں باب میں جب ہڑتالی کاریگروں کا ایک گروہ مسٹر کھنّہ کا کارخانہ شکر سازی پھونک دیتا ہے تو پریم چند مسٹر موصوف کو یک لخت ایک مفلس و قلّاش شخص کی صورت میں پیش کرتے ہیں، لیکن دولت کی یہ اچانک بربادی پروفیسر صاحب کی روح کے لئے اکسیر ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنی تمام بدعنوانیاں اور بے انصافیاں یاد کر کے پشیمان ہوتے ہیں، اور جوانمردانہ تسلیم و رضا کے ساتھ افلاس و ناداری کی مصیبت گوارا کر کے اچھے خاصے مہاتما بن جاتے ہیں۔ چند ہی صفحوں کے بعد مسٹر کھنّہ پھر وہی سرمایہ دار مسٹر کھنّہ کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بچی کھچی شکر مل کے منافع سے دولت کے انبار لگا رہے ہیں اور مزدوروں

کے پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنی توند پھلا رہے ہیں، مگر یہ معمولی فروگذاشت اچھے اچھوں سے سرزد ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ منشی صاحب اس واقعہ سے یہ دکھانا چاہتے ہوں کہ سرمایہ داری میں پلے ہوئے لوگوں کی قلب ماہیت میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

ماخوذ از ریویو موسیو پال ڈینٹ
رسالہ نو ریویو۔ دسمبر ۱۹۳۶ء
(بہ اضافہ و ترمیم)

منشی پریم چند کا قلمی چہرہ

(از صاحب "فلستان" لاہور)

منشی پریم چند کا رنگ گورا قد مناسب اور بدن اکہرا تھا۔ اُن کا دماغ نہایت دُور بیں اور موقع شناس تھا۔ اُن کی نظر دنیا کی اندرونی گہرائی تک جاتی تھی۔ مسکراہٹ فریفتہ اور متاثر کرنے والی تھی۔ مسکراتے ہونٹوں کو ڈھکنے والی گھنی مونچھیں، سنہری مسکراہٹ سے چمکنے والی آنکھیں، رنج دُکھ تکلیف اور ناموافق حالات ظاہر کرنے والے گالوں پہ باریک جھرّیاں اور فکر کا اظہار کرنے والی پیشانی پہ دو بل، یہی اُنکا بشرہ تھا۔ اُنھوں نے رونا نہ سیکھا تھا، غم میں انبساط پیدا کر دکھانا اُنھیں کا کام تھا۔ سب کو مسکراتے دیکھنا اُنکا نصب العین تھا۔ اُن کی جھرّیاں بھی مسکراتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ زندگی کی کشمکش میں دہکتی ہوئی بھٹی میں تپ تپا کر وہ سونے میں سہاگہ ہو گئے تھے۔ اُن پر مصیبتیں آئیں لیکن اُنھیں رُلا نہ سکیں۔ اُنھوں نے آلام و آفات کا استقبال کیا چمکتی ہوئی آنکھوں ہنستے ہوئے ہونٹوں اور مستحکم دل سے۔ وہ زندگی کی آگ میں جلے اور ناموافق حالات کی دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرے دھڑکتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے نہیں بلکہ آہنی عزم اور جوانمرد حوصلہ اور مستحکم دل کے ساتھ۔

وہ قابلِ مثال اہلِ کمال تھے۔ جبتک وہ اُردو میں لکھتے تھے، اُردو دنیا کے بادشاہ بنے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں ہندی میں داخل ہوئے تو ہندی دنیا کے تخت پر غیر معمولی شان و شوکت سے جلوہ افروز ہوئے۔ وہ عظیم الشان صاحب فن اور ادب میں طرزِ خاص کے اُستاد، موجد فن، مصوّرِ جذبات تھے۔ اُنھوں نے ادب کے لئے جو کچھ کیا وہ فراموش نہیں ہو سکتا۔

پریم چند نے جو کچھ لکھا اپنے ملک کے لئے، اپنی زبان کے لئے، غریبوں اور کمزوروں کے لئے۔ اُنکی روح بنارس کی تنگ گلیوں میں چکر نہیں کاٹتی تھی، وہ گاؤں کے کھُلے کھیتوں اور کھلواڑوں میں پھرتی تھی۔ وہ ہمارے ٹالسٹائے اور گورکی تھے وہ ہمارے شرت اور بنکم تھے۔ اُنھوں نے نوجوانان اہلِ فن کے سامنے ایک نمونہ پیش کیا ہے جس پر چلکر سینکڑوں نوجوان اپنا اور اپنی قوم کا بھلا کر سکتے ہیں۔

(فلستان۔ لاہور)

(ماخوذ از پریم چند نمبر)

یادگارِ پریم چند

حصّہ سوم

افسانہ گوئے بزمِ ادب

از ابو الفاضل حضرت راز چاند پوری

پریم چند وہ افسانہ گوئے بزمِ ادب ہزار حیف کہ دم بھر میں ہو گیا خاموش
خودی سے اُس کو غرض تھی نہ خود نمائی سے شرابِ حسنِ ادب سے وہ رہتا تھا مدہوش
محبِّ قوم و وطن تھا، پریم ساگر تھا بھرا تھا قلب میں اُس کے فلاحِ قوم کا جوش
زباں میں اُس کی سلاست تھی اور شیرینی بیاں میں اُس کے اثر تھا فغاں میں جوش و خروش
رموزِ فطرتِ انساں پہ تھی کچھ ایسی نظر کہ جیسے واقفِ اسرار ہو کوئی مے نوش
زبانِ عام میں اُس نے لکھے ہیں وہ قصّے کہ خاص لوگوں کو دیتے ہیں درسِ عقل و ہوش

سُنائے گا ہمیں دلکش کہانیاں اب کون؟
وہ خوش کلام تو محفل سے ہو گیا روپوش

یادِ کمال

از جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

اُٹھے جہاں سے منشی پریم چند ادیب
کہ اہلِ فن کے لئے جو تھے سودمند ادیب

دمِ نگارشِ مضموں تھی فکر پُر تاثیر
ہر ایک لفظ تھا کلکِ رقم کا با توقیر

زباں پہ اُن کو تو اُن پر زباں کو نازش تھی
ہر اک نفس میں وقارِ سخن کی خواہش تھی

پریم چند تھے مشہور ادب کی دنیا میں
دماغ پایا تھا پُرنور ادب کی دُنیا میں

پریم چند تھے ہندی میں زینتِ محفل
پریم چند تھے اُردو میں اکمل و کامل

رموزِ فلسفے کے تھے دماغ و دل میں نہاں
قلم سے صفحۂ قرطاس پر ہوئے جو عیاں

تمام عمر سنواری ادب کی زلفِ دراز
ہمیشہ فکر تھی ذوقِ سخن کی آئینہ ساز

تخیلات کے عالم میں فردِ کامل تھے
میانِ محفلِ عُشاق با اثر دل تھے

نفس نفس میں رہا نظم و نثر پر قابو
کہ جو لکھا وہ اثر میں تھا صورتِ جادو

پریم چند کو اب یاد کرتی ہے دُنیا
نظر میں پھرتی ہے ہر وقت صورتِ زیبا

زمانے سے وہ چھٹے اور زمانہ اُن سے چھٹا
اجل کے ہاتھوں خزانہ کمالِ فن کا لُٹا

نہاں ہے آنکھ سے وہ جیتی جاگتی تصویر
ہزار حیف کہ اُٹھا ادیب با توقیر

کہاں سے لائیگا قایم مقام اُن کا جہاں
جنھوں نے چھوڑا ہے کاغذ پہ اپنا نام و نشاں

سخن کی فکر تھی وقفِ طواف کعبہ و دَیر
دماغ و دل کو ہمیشہ تعصبات سے بَیر

کلام اُن کا چھپے اور جلد چھپ جائے
تمام ملک میں حسنِ قبول دِکھلائے

پسِ فنا ہے یہی یادگار اے محشر
کہ جس سے زندۂ جاوید ہو کمال و ہنر

اُردو ہندی کے سنگم پر
ایک حادثہ

از حضرت سیماب اکبرآبادی

یہ طوفاں اور یہ شورش، یہ فتنے اور ہنگامے
فغاں در سینہ، شعلہ درنفس، دوزخ بہ ہر گامے

مسافر ناگہاں گھبرا گیا، پہونچا سرِ ساحل
کہ جب منزل ہو گرد آلود، پاکوبی ہے لاحاصل

یہاں دیکھا کہ دو دریا ہیں، مواج و رواں دونوں
نشید افروز، افسانہ فروش و نغمہ خواں دونوں

تفاوت ہے بہت دونوں کے اندازِ روانی میں
مگر ہے دخل دونوں کو مزاجِ زندگانی میں

چلا وہ سر پھرا ملاح دونوں کے ملانے کو
شکستہ کشتی و دریا کی ہمت آزمانے کو

بھرا "ساگر" کہیں سے، اور کہیں سے اُس نے "پیمانہ"
بنایا اک نیا، موجوں کے سر پر اپنا میخانہ

مئے دو آتشہ دو رنگ کی اک جام میں ڈھالی
ترنگ ایک اُسکی "مستانہ" تھی اور اِک موج "متوالی"

پیامِ سرخوشی دیتا رہا یارانِ ساحل کو
سکھائی فطرتِ دریا سبکسارانِ ساحل کو

کسانوں اور مزدوروں کو دیکھا دُور سے اُس نے
ہلایا اپنا سر اِک نازشِ مغرور سے اُس نے

بھری اِن دونوں دریاؤں سے اپنی پریم کی چھاگل
اُسے اس طرح چھلکایا کہ رنگیں ہو گئے جل تھل

وہ اُسکی بانسری، وہ بھیگے بھیگے رس بھرے گانے
یکایک رُخ کیا اُسکی طرف رفتارِ دریا نے

جو دریا اپنی رَو میں جا رہے تھے موجزن دونوں
بالآخر اُسکی کشتی پر ہوئے سایہ فگن دونوں

ہوا طوفاں بپا "بحرین" کے جوشِ تصادم سے
شکستہ کشتیٔ ملاح ٹکرائی تلاطم سے

بپھر کر موجِ طوفاں نے لیا آغوش میں اُس کو
رہا کچھ ہوش کشتی کا نہ فرطِ جوش میں اُس کو

صدا آئی کہیں یوں تُند موجوں کو ملاتے ہیں
کہ ایسی شورشوں میں ناخدا بھی ڈوب جاتے ہیں

مگر اے ناخدائے رفتہ، اے ناقوسِ "سنگم" کے!
نہ ہونگے آب خوردہ نقش تیری سعیِ پیہم کے

ابھی تا دیر بحر و بر میں گونجے گی نوا تیری
کہ تیری روح "سنگم" پر ہے ساحل پر چِتا تیری

چتا کی آگ سے گنگا کا پانی شعلہ افشاں ہے
اور اس کے عکس سے ہر موجِ جمنا میں چراغاں ہے

شوالہ گر ہے تو مستقبلِ اُمیدِ عالم کا
طواف اہلِ وطن کرتے رہینگے تیرے "سنگم" کا

منشی پریم چند کی یاد میں

(از حضرت سروش)

مردِ حقیقت آشنا! منشی پریم چند
تیرا وجود باعثِ صد نازِ ہند تھا

تو ہستیِ بہارِ گلستانِ ہند تھا
تیری حیات مہدِ کمالاتِ لا فنا

تو ہستیِ بہارِ گلستانِ علم و فن
ہندی ادب کے عرش کا تو مہرِ پُر ضیا

تیرا دماغ مخزنِ اسرارِ زندگی
تیرا خیال پیکرِ برقِ شرار زا

بے لوث نیکیوں سے مرکب ترا خمیر
مذہب ترا وداد فدا کاری و وفا

تو بندۂ پرستشِ ہر ذرۂ وطن
تو قومِ ناتواں کا شفیق و گرہ کُشا

تیری ضمیر آئینۂ حُسنِ کُن فکاں
تیری شبیہ معجزۂ قدرتِ خدا

شیوہ ترا تدبر و تحقیق و جستجو
مقصود تیرا پیرویِ راہِ ارتقا

قانون سے اجل کے نہ تو بچ سکا مگر
دے کر ثبوتِ سخنِ حافظ دکھا گیا

"ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

پریم چند اور اُن کا مرتبہ

(از جناب گنگا دھر ناتھ صاحب فرحت کانپوری بی اے، ایل ایل بی)

جب ہوا روزِ ازل تخلیقِ انساں کا سوال ‏ ‏ خالقِ ایزد نے حاضر کر دیا حُسن و جمال
لیکن اتنے ہی سے تھی تکمیلِ بشریت محال ‏ ‏ حُسنِ ظاہر کے لئے لازم ہوا حُسنِ کمال
اس زمانہ میں ہوا پیدا اسی سے پریم چند
تا کہ باتوں باتوں میں دے اِک جہاں کو وعظ و پند

اُس کی ذاتِ خاص تھی گہوارۂ عالی صفات ‏ ‏ اُسکی ہستی تھی جہاں کے واسطے جزوِ حیات
کچھ عجب ڈھب سے ادا ہوتے تھے سارے واقعات ‏ ‏ اور زباں ایسی کہ گویا موجۂ آبِ حیات
الغرض یکتا تھا وہ اس کا کوئی ہمسر نہ تھا
کوئی معراجِ کمالِ علم میں برتر نہ تھا

اس کے ہر ہر لفظ میں تھا ایک جادو سا نہاں ‏ ‏ اس کی ہر ہر بات میں تھیں فلسفے کی نغوخیاں
اس کی ہر ترکیب سے ظاہر تھا اندازِ بیاں ‏ ‏ اسکی ہر ترتیب میں پنہاں تھا ربطِ دو جہاں
پیارے پیارے چُست فقرے، بھولی بھالی گفتگو
باغِ افسانہ نگاری میں بہارِ رنگ و بو

ایسی خودداری کہ عزت کو ہو جس پر رشک و ناز ‏ ‏ بے نیازی ایسی، دولت کو ہو جس پر رشک و ناز
سادگی ایسی کہ عصمت کو ہو جس پر رشک و ناز ‏ ‏ زندگی ایسی کہ جنت کو ہو جس پر رشک و ناز
گُل کی بُلبل کے لئے تاکید خاموشی کی ہے
کیفیت باغِ جہاں میں خود فراموشی کی ہے

اہلِ عالم کو ہے اذنِ شورِ دریا چُپ رہو ‏ ‏ چُپ ہو ہاں چپ رہو، اے اہلِ دنیا چُپ رہو
ہے یہ اِک وارفتۂ فن کا جنازا چپ رہو ‏ ‏ احترامِ علم و فن کا ہے تقاضا چُپ رہو
اُٹھ گیا ہندوستاں کا مایۂ عزّ و شرف
چُپ رہو گم ہو گیا اِک گوہرِ عالی صدف

آہ! منشی پریم چند

از منشی جگناتھ آزاد بی اے

قوم کا سرمایہ ہیں اُس کے سخنور اور ادیب
موت ہے ان کی وطن کو آہ! کتنی ناگوار

گلشنِ قوم و وطن تازہ انہی کے دم سے ہے
ہے انہی کے فیض سے گلزارِ ملت پُر بہار

دامِ ملکوں کے انہی کے نام سے ہیں سر بلند
اور انہی کے دم سے ہیں قومیں جہاں میں باوقار

قوم کی عزت جو قائم ہے تو بس اُن کے طفیل
کیونکہ ہیں یہ زندگیٔ قوم کے آئینہ دار

یہ نہ ہوں جس ملک میں اُس ملک میں کچھ بھی نہیں
گرچہ ہوں موجود اُس میں سیم و زر کے کوہسار

مٹتے جلتے ہیں مرے ہندوستاں! تیرے ادیب
جا رہے ہیں تیرے شاعر اور افسانہ نگار

یاس کے طوفان میں تیری امیدیں غرق ہیں
ہو رہا ہے ہند! تیری آرزوؤں کا فشار

تیرے وہ فرزند جن پر اک جہاں نازاں تھا کل
آج ڈھونڈے سے کہیں ملتی ہے انکی یادگار؟

آہ! تجھ میں قدر کچھ ان باکمالوں کی نہیں
جن پہ اے میرے وطن! نازاں ہیں مغرب کے دیار

پھر ہو مصروفِ فغاں اے مادرِ ہندوستاں
کیونکہ وہ فرزند تیرا تھا جو فخرِ روزگار

تیرے دامانِ محبت سے دیارِ غیب کو
لے گیا اس کو اُٹھا کر آہ! دستِ روزگار

وہ کہ جس پر ہندو و مسلم کو یکساں ناز تھا
یعنی افسانہ نگاری کے جہاں کا تاجدار

چل بسا افسوس! وہ بھی. تھا جو اپنی طرز میں
کشورِ ہندوستاں کا واحد افسانہ نگار

جس کے افسانے تھے ہر ہندوستانی کو پسند
تھا ہمارے ملک میں بس ایک منشی پریم چند!

مرنے والے! اگرچہ افسانے ہیں سرمایہ ترا
ان فسانوں میں حقیقت کا جہاں موجود ہے

زندگی کے پُر خطر رستے کے ہر ہر پیچ کا
داستانوں میں تری اک اک نشاں موجود ہے

رنگِ تہذیبِ کہن، صدق و صفا، حُبِّ وطن
ان میں بیداریٔ ہندوستاں موجود ہے

بہر آزادیٔ ملک و قوم سینے میں ترے
صاف ظاہر ہے کہ اک سوزِ نہاں موجود ہے

ہیں کہیں عشرت گہِ ہستی کے قصے دلفریب
اور کہیں درد و الم کی داستاں موجود ہے

اک جگہ موجود ہے اشکوں کا دریائے رواں
اک جگہ جامِ شرابِ ارغواں موجود ہے

ہیں فسانوں میں کہیں چٹیل بیاباں اور پہاڑ
اور کسی جا اک مہکتا بوستاں موجود ہے

ہیں کہیں موجود نفرت اور غرض کے خارزار
اور محبت کا کہیں اک گلستاں موجود ہے

قہقہے ہیں عیش و عشرت کے کسی جا بے پناہ
اور کہیں غمناک فریاد و فغاں موجود ہے

ہے نمایاں اک جگہ مکر و فریبِ زندگی
اک جگہ عبرت کی سچی داستاں موجود ہے

محفلِ عشرت میں ہے اک جا ہجومِ رنگ و بو
اک جگہ دل دوز آہوں کا دھواں موجود ہے

تیرے افسانوں میں اے فخرِ وطن صاحبِ قلم
زندگی کی اک مکمل داستاں موجود ہے

فنِ افسانہ نگاری ہے جہاں میں سر بلند
دہر میں جب تک ترا دلکش بیاں موجود ہے

زینتِ بزمِ ادب ہی تیرا ساغر پریم چند!
جب تلک یہ گردشِ دورِ جہاں موجود ہے

نام تیرا مٹ نہیں سکتا جہاں سے، جب تلک
یہ زمیں موجود ہے یہ آسماں موجود ہے

تیرے افسانوں میں روحِ پاک تیری زندہ ہے
تیرے ہر اک لفظ میں تنویرِ جاں موجود ہے

صفحۂ ہستی پہ ہے مرقوم افسانہ ترا
تو ہے شمعِ جاوداں، ہر دل ہے پروانہ ترا!

بساطِ ماتم

منشی پریم چند زمانے سے اٹھ گئے
پہلی سی دلنشین کہاں انجمن ہے آج

منقارِ عندلیب کو نغموں سے ہے گریز
پھولوں کی پنکھڑیوں میں کہاں بانکپن ہے آج

ہر محفلِ وفا میں ہے جانِ وفا کا سوگ
خالی لطافتوں سے چمن کا چمن ہے آج

گل ہو رہا ہے اہلِ ادب کا چراغِ دل
تنویرِ انجمن سے تہی انجمن ہے آج

اک صاحبِ کمال نگاہوں سے چھپ گیا
بیتاب و بے قرار نگاہِ وطن ہے آج

محفل میں اب وہ اہلِ زبان و قلم نہیں
غم میں سیاہ پوش عروسِ سخن ہے آج

مرگِ ادیب روحِ تمدن کی موت ہے
ماتم گسار اخترِ شیریں سخن ہے آج

عبدالسلام اختر ہوشیارپوری

نوحۂ وفات پریم چند

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے ایل ایل۔ بی)

کیا بتاؤں کون اے اہلِ وطن جاتا رہا — اِک ادیبِ عصر و نقادِ سخن جاتا رہا
روشنی افروزِ بزمِ علم و فن جاتا رہا — بلبلِ گلزار و صدرِ انجمن جاتا رہا
اضطرابِ قلب کو زحمت کشِ تسکیں نہ کر
ہم نشیں بہرِ خدا اب صبر کی تلقیں نہ کر

تو کہاں ہے اے بہارِ جلوہ سامانِ ادب — تیرے دم سے رو کشِ جنّت تھا بُستانِ ادب
ہوگئی برباد اب وہ شوکت و شانِ ادب — رو رہے ہیں آج تجھکو تشنہ کامانِ ادب
دہر میں پیدا ہوا تو خوش بیانی کے لئے
کشورِ علم و ہنر کی حکمرانی کے لئے

تیرے افسانے کتابِ دہر کی تفسیر ہیں — فطرتِ انساں کی جیتی جاگتی تصویر ہیں
اللہ اللہ چارہ فرمائے دلِ دلگیر ہیں — زندگی کے خواب کی تسکیں فزا تعبیر ہیں
نقطہ نقطہ ان کا اِک آئینۂ جذبات ہے
شاہدِ علم و ادب کے واسطے سوغات ہے

نثر تیری درحقیقت نظم سے ہے خوب تر — قوم کو ہے ناز تیری شوخیِ تحریر پر
یہ سلاست یہ روانی یہ صفائی یہ اثر — تیرے ہر جملے پہ قرباں ہوگئی رُوحِ شرر
عالمِ رویا میں دیکھا دیدۂ خونبار نے
تیری پیشانی کو چُوما حالیؔ و سرشارؔ نے

حبّذا اے یوسفِ مصرِ معانی حبّذا — کشورِ ہندی کو بھی تو نے مسخر کر لیا
پیشتر اقلیمِ اُردو کا تھا تُو فرمانروا — قوتِ بازو سے اب شاہِ دو عالم ہوگیا
ہے پرے تیری فضیلت سرحدِ ادراک سے
گوئے سبقت لے گیا تو منشیِ افلاک سے

تیرے دامن میں محبت کے دُرِ شہوار تھے
مدح خواں تیرے عزیز و مخلص و اغیار تھے

انقلاباتِ جہاں گو درپئے آزار تھے
تجھکو پیکانِ الم لیکن گلِ گلزار تھے

اک سبق ہے زندگی تیری بشر کے واسطے
قابلِ تقلید ہے اہلِ نظر کے واسطے

دُرجِ عرفاں کا تجھے اِک گوہرِ یکتا کہوں
یا چمن زارِ حقیقت کا گلِ رعنا کہوں

لب کو تیرے کاشفِ اسرارِ سربستہ کہوں
اور تجھکو اِک سفیرِ عالمِ بالا کہوں

گوشِ دل سے ہاں سُنے کوئی ترے پیغام کو
ظرفِ عالی چاہیئے اس بادۂ گلفام کو

موت کے قزّاق نے لُوٹا نظر کا کارواں
ساکنِ شہرِ خموشاں ہے سرودِ نکتہ داں

جانبِ ملکِ عدم راہی ہوئے برق وروَاں
چل بسا افسوس تو بھی اے شۂ ملکِ بیاں

فخرِ قوم و نازشِ ہندوستاں جاتے رہے
کیسے کیسے آہ یکتائے زماں جاتے رہے

دشمنِ اہلِ وطن گردونِ گرداں ہو گیا
خاک کے پردے میں گنجِ قوم پنہاں ہو گیا

حیف خاکی گوہرِ مکنوں سے داماں ہو گیا
عمر بھر کے واسطے رونے کا ساماں ہو گیا

بس نہیں چلتا ہے یارب کچھ قضا کے سامنے
ہے سرِ تسلیم خم تیری رضا کے سامنے

آہ! پریم چند

آہ جب تک تو جیا زندہ رہا با صد وقار
اور بنکر ہمدم و ہمدرد و یار و غمگسار

یاد آتی ہے دلوں کو تیری صورت بار بار
موت وہ تیری کہ جس پر زندگی خود تھی نثار

ہو بشر تجھ سا جہاں میں ہے یہ ایک امرِ محال
دہر میں جب تک رہا بنکر رہا اپنی مثال

سید شمس [illegible] حقی

آہ! منشی پریم چند

از مہاشہ جیمنی سرشار خیرپور سادات ضلع مظفر گڑھ

تیری قضا نے کر دیا سینہ فگار پریم چند!
فطرت شناس پریم چند! فطرت نگار پریم چند!

ایسا کہاں سے لائیں ہم؟ تجھ سا جسے بتائیں ہم
علم و کمال و فضل کا آئینہ دار پریم چند!

اُردو کا تو ادیب تھا، ہندی کا تو حبیب تھا
دونوں کے سر پہ رکھ گیا تاجِ وقار پریم چند!

آئے نظر بہار کیا؟ پھولوں پہ ہو نکھار کیا؟
باغِ ادب میں تجھ سے تھی شانِ بہار پریم چند!

دل کو ہے آرزو تری، آنکھوں کو جستجو تری
کیوں تو چمک کے چھپ گیا مثلِ شرار پریم چند

شاداں ترے کمال پہ نازاں تھے تیری ذات پر
اب ہیں بہاتے اشکِ خوں ہندی تری وفات پر

بزمِ سخن کی جان تھیں جادو بیانیاں تری
علم و ادب کی کان تھیں یکسر کہانیاں تری

سامانِ فلاحِ قوم کا، ناول ہوں یا کہانیاں
باعث رفاہِ ملک کا، گوہر فشانیاں تری

نغمے نہ تھے، ترا کمال رونقِ صد فریب تھا
بیکس وطن کے حال پہ تھیں نوحہ خوانیاں تری

حیرت میں باکمال سب تیرا کمال وہ کمال!
دھنتے ہیں سر کو نکتہ داں، وہ نکتہ دانیاں تری

ہم ہو گئے تباہ اجل! ہو نگی نہ ختم آہ! اجل!
فتنہ طرازیاں تری؟ ریشہ دوانیاں تری

قرباں ہوں جن پہ جان و دل، قلب و جگر نثار ہوں
کتنا ستم ہے اے اجل! یوں وہ ترے شکار ہوں

خراجِ عقیدت

(از بابو جگیشور دیال صاحب رائزادہ سکسینہ صوفیؔ ایم-اے-ایل ایل بی- بلند شہر)

وہ پریم چند منشی بے مثل و بے بدل
تھی جس کے دم سے بزمِ ادب میں چہل پہل
افسانے جس کے شمعِ ہدایت تھے برمحل
ناوقت آہ ہوگیا وہ لقمۂ اجل

اِس سوزِ جاں گسل سے ہر اک دل کباب ہے
فرطِ تپش ہے آتشِ غم بے حساب ہے
علمی شغف سے اُسکے نہیں کون باخبر؟
ہر قلب پر فسانے ہوئے نقشِ کالحجر

اے بحرِ علم تیری روانی سے سرسبز
دامانِ وجیبِ اُردو و ہندی ہیں پُرگہر
طرزِ بیاں ہر ایک کا تو نے دکھا دیا
دھبّہ ہر اک کا اپنے قلم سے مٹا دیا

بزمِ ادب کو خواب میں بھی یہ نہ تھا خیال
اُنیس سو چھتیس کا نحس ہوگا اسکو سال
اول وفاتِ برق کا اسکو ہوا ملال
پھر چلدیا جہاں سے یہ منشیِ باکمال

نقشِ قرار سیلِ فنا سے مٹا ہے آج
ایوانِ نثر و نظم میں ماتم بپا ہے آج
تجھکو پریم چند یہ شاید نہیں خبر
کتنا وفات کا تیری دُنیا پہ ہے اثر

صوفیؔ جہاں میں ڈھونڈھتی ہے اُسکو ہر نظر
اے ماہتابِ عشق بتا تو چھپا کدھر

کیا شوق سامعیں کا فراموش ہوگیا
افسانہ کہتے کہتے جو خود ہائے سوگیا

بادشاہ اور ادیب

ازحضرت احسان بن دانش

ادب کے گلستاں پہ یہ سال توبہ — بنا ہر طرف سینہ کوبی کی ڈالی
گئے راشد الخیری و برق و بیدم — الم جن کا ہے روح کی پائمالی
خلیقی و ہادی نے بھی منہ کو پھیرا — ہوئی حشر سے حشر تک بزم خالی
شمیم اور ابنِ علی، عرش و ناصر — گئے دیکے سب داغ شیریں مقالی
اُٹھا بزم سے اصغر نغز فرما — تصوّف کا حامی تغزّل کا والی
بساطِ جہاں میں خیال اب کہاں ہے — دلوں میں ہے اک یاد نازک خیالی
بس اک پریم چند ایسا انساں رہا تھا — کہ تھی جس سے اُردو کے رُخ پر بحالی
مگر آگیا یہ بھی دامِ اجل میں — فغان است بر عالم خستہ حالی
غرض ان ستاروں کی ضو پوشیوں سے — سحر کی ضیا پاشیاں بھی ہیں کالی

اِسی سال کھا کر فریبِ مقدر — جدا سلطنت سے ہوا شاہِ عالی
مگر تخت پر شاہ کے شاہ بیٹھا
ادیبوں کے منبر ہیں خالی کے خالی

مہاراج بہادر برق دہلوی۔ حضرت بیدم وارثی۔ مولینا خلیقی دہلوی۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی
آغا حشر کاشمیری۔ شیو نرائن شمیم۔ سید ابن علی مدیر نیر اعظم مرادآباد۔ حضرت عرش گیاوی۔
سید ناصر نذیر دہلوی۔ حضرت اصغر گونڈوی۔

قطعۂ تاریخ وفات منشی پریم چند صاحب مرحوم

(از منشی اقبال ورما سحر ہنگامی)

ٹھا پریم چند سا افسانہ گو دریغ !
ڈوبا سپہرِ ناموری کا مہِ تمام

رریر اُسے تھی وہ قدرت کہ خامۂ آپ
جھک جھک کے انکسار سے کرتا رہا سلام

ا طبع کا لگاؤ جو ہر خاص و عام سے
ہر طبعزاد رنگ تھا مقبول خاص و عام

س کا کلام مہر و وفا کا کلام تھا
اُس کا پیام اُنس و محبّت کا تھا پیام

ذبات، قدرتاً جو نہاں تھے، عیاں ہوے
جذبات کا ہوا وہ کھلا صاف احترام

ی اُس کی فہم میں وہ رسائی کہ بالیقیں
انساں کے دل میں بیٹھ کے کرتی تھی اپنا کام

ا کیا وہیں سکوں میں بدلتا تھا اضطراب
چلتا تھا جب بناؤ سے کلکِ سُبک خرام

ا فطرتاً اگرچہ وہ افسانہ گو، مگر
بے شبہ شاعرانہ تھا اُس کا سب اہتمام

س درجہ پُر فضا تھا سماں واقعات کا
تصویر تھی کہ جس کو وہ تھا کھینچتا مُدام

نس منس کے ہر نگاہ میں کھبتی تھی اس کی صبح
ہر دل کو مسکرا کے لبھاتی تھی اُس کی شام

جائے تا جہاں میں نئی زندگی کا دور
اُمرت سے بھر کے اُس نے دیئے لاکھ لاکھ جام

نا عظیم تھا غرض اس کا جو تھا اثر
کتنا بلند تھا غرض اُس کا تھا جو مقام

س نام سے ہو اس کی مکمل برابری
ہندوستان میں تو نظر آتا نہیں وہ نام

کی وفات ہے ادب و قوم کا وہ زخم
جس کا کسی طرح نہیں ممکن اب التیام

خاموش ہے فسانہ نگاری کہ آج سحرؔ
رخصت ہوا فسانہ نگاری کا ہمکلام

۱۹۳۶ء

تواریخ انتقال ناگہانی

۱۹ ۶ ۳۶

منشی دھنپت رائے "پریم چند" ادیب کامل و نقادِ ہندی و اردو

۱۹ ۶ ۳۶

(نتیجۂ فکر پروفیسر حامد حسن قادری، ایم۔ اے)

۱

اِس دَور میں ہوئی ہے ادیبوں کو کم نصیب
رکھتے تھے جو قلم میں روانی پریم چند
بے مثل تھا فسانہ نگاری کا طرزِ خاص
رکھتے نہ تھے زمانے میں ثانی پریم چند
نقاد بھی، مدیر بھی، ناول نگار بھی،
تھے شاہِ کشورِ ہمہ دانی پریم چند
تکمیل اَور ہندی و اُردو کی تھی ضرور
تھی موت ابھی سے تمکو نہ آنی پریم چند
"ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"
گو زندگی سبھی کی ہے فانی پریم چند
رکھتے تھے تم بھی عشق ادب، عشق ملک و قوم
کی نذرِ عشق تم نے جوانی پریم چند
زندہ ہو تم بھی، زندہ ہیں جبتک زبان و ملک
یہ زیست وہ ہے جو نہیں آنی پریم چند
باقی رہیگی اُردو و ہندی کے ساتھ ساتھ
چھوڑی ہے تم نے ایسی نشانی پریم چند
شہپارۂ ادب بھی ہے، درسِ عمل بھی ہے
ہر ناول اور ہر ایک کہانی پریم چند

حامد پریم چند کی تاریخِ انتقال
ہے "فخرِ عصر و بحرِ معانی پریم چند"

۱۹ ۶ ۳۶

۲

بزمِ جہاں سے اُٹھ گیا ایک ادیبِ بیمثال
نالہ کشِ الم نہ ہو کیوں دلِ دردمند آج
اے دلِ حامدِ حزیں سالِ وفات کر رقم
کوہِ گرانِ غم ہے آہ مرگِ پریم چند آج

۱۹ ۶ ۳۶ء

ٴ اس آن میں ختم ہونیوالی۔

پریم چند کی تصانیف

منشی پریم چند کی اُردو ہندی تصانیف کی ایک مفصل فہرست درج ذیل ہے۔ اس فہرست کو حتی الوسع مکمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاہم ممکن ہے کہ بعض باتیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔ ہم کو افسوس ہے کہ مرحوم کے وارثان سے بھی ان کی تصانیف کی کوئی مستند فہرست دستیاب نہ ہو سکی۔ اسلئے یہ بھی ممکن ہو کہ بعض چیزیں بالکل ہی نظرانداز ہو گئی ہوں۔

اُردو تصانیف

مختصر افسانے

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۱	سوزِ وطن۔	پانچ مختصر افسانوں کا مجموعہ جو ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔
۲	خاکِ پروانہ۔	سات افسانوں کا مجموعہ
۳	پریم پچیسی (۲ جلد)۔	پچیس کہانیوں کا مجموعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔
۴	پریم بتیسی (۲ جلد)۔	بتیس ۳۲ قصوں کا مجموعہ جس کا پہلا ایڈیشن زمانہ پریس کانپور سے اور دوسرا ایڈیشن دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔
	پریم چالیسا (۲ جلد)	چالیس کہانیوں کا مجموعہ جو لاہور سے شائع ہوا۔
۶	فردوسِ خیال۔	گیارہ افسانوں کا مجموعہ جو ۱۹۲۹ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا
۷	زادِ راہ۔	بارہ افسانوں کا مجموعہ جو ۱۹۳۶ء میں حالی پبلشنگ ہوس کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا۔
۸	دودھ کی قیمت۔	نو افسانوں کا مجموعہ ہے جسے ۳۶ء میں عصمت بکڈپو دہلی نے شائع کیا۔
۹	واردات۔	تیرہ ۱۳ افسانوں کا مجموعہ جامعہ ملیہ دہلی سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

(اُردو ناول)

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۱	کشنا۔	۱۹۱۰ء میں ہندوستانی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا اور بابو بہادر پرشاد ورما بک سیلر امین آباد لکھنؤ نے شائع کیا۔
۲	ہم خرما و ہم ثواب۔	(ایضاً)
۳	جلوۂ ایثار	۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا دوسرا ایڈیشن ۲۸ء میں نکلا۔
۴	روٹھی رانی	راجپوتانہ کے ایک تاریخی قصہ کا اُردو ترجمہ جو ۱۹۰۷ء میں نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔
۵	بازارِ حسن (۲ جلد)	اس ناول کا فلم بھی بن چکا ہے یہ ناول سیوا سدن کا اُردو ترجمہ ہے۔
۶	گوشۂ عافیت (۲ جلد)۔	دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا۔
۷	چوگانِ ہستی (۲ جلد)	۲۷ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوئی۔
۸	پردۂ مجاز (۲ جلد)	لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا
۹	نرملا۔	یہ ناول ۱۹۲۹ء میں لاہور سے شائع ہوا
۱۰	غبن۔	یہ ناول لاہور سے شائع ہوا۔
۱۱	بیوہ۔	یہ ناول سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا
۱۲	روحانی شادی (ڈرامہ)	عصمت بکڈپو دہلی نے شائع کیا۔

(متفرق)

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۱	باکمالوں کے درشن۔	زمانہ میں شائع شدہ سوانحی مضامین کا مجموعہ جسے لالہ رام نرائن لال بک سیلر الہ آباد نے شائع کیا۔

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۲	رام چرچا (رامائن کی کتھا)	لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا

ہندی افسانوں کے مجموعے

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۱	پریم دواوشی	بارہ افسانوں کا مجموعہ سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔
۲	پریم پرتما	یہ مجموعہ سنہ ۲۶ء میں سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا
۳	پریم تیرتھ	سنہ ۲۶ء میں " " "
۴	پریرنا प्रेररणा	سنہ ۳۲ء میں " " "
۵	پانچ پھول	سنہ ۳۵ء میں " " "
۶	مان سرور (دو جلد)	سنہ ۳۶ء میں پچاس کہانیوں کا مجموعہ سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔
۷	کفن اور دوسرے افسانے	سنہ ۳۶ء میں سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا
۸	سپت سروج	" " " " "
۹	پریم پچیسی	" " " " "
۱۰	پریم پورنما प्रेम पूर्णिमा	" " " " "
۱۱	نودھی	" " " " "
۱۲	پریم پرسون	" " " " "
۱۳	اگنی سمادھ	" " " " "
۱۴	سمر یاترا	" " " " "

(ہندی ناول)

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۱	سیوا سدن	بازار حسن کا ہندی ترجمہ
۲	پریم آشرم	" "
۳	بردان	" "
۴	نرملا	بیوہ کا ہندی ترجمہ جو پہلے प्रेमा نام سے شائع ہوا تھا۔
۵	رنگ بھومی (دو جلد)	
۶	غبن۔	
۷	کرم بھومی	میدان عمل کا ہندی ترجمہ ہے۔

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۸	نرملا	
۹	گئودان	سرسوتی پریس بنارس سے سنہ ۳۶ء میں شائع ہوا
۱۰	کایا کلپ	
۱۱	منگل سوتر	(نامکمل ناول جو سرسوتی پریس سے شائع ہوا)

(ہندی ڈرامے)

نمبر	نام کتاب	معہ کیفیت
۱	کربلا	زمانہ میں شائع شدہ ڈرامے کا ہندی ترجمہ سرسوتی پریس نے شائع کیا۔
۲	سنگرام۔	
۳	پریم کی ویدی	

(بچوں کیلئے ہندی کتابیں)

۱۔ کتے کی کہانی۔
۲۔ جنگل کی کہانیاں
۳۔ رام چرچا (رامائن کی کتھا)
۴۔ من مودک
۵۔ شیخ سعدی
۶۔ درگا داس

یہ سب کتابیں سرسوتی پریس بنارس نے شائع کیں۔

(ہندی ترجمے و تالیفات)

۱۔ آزاد کتھا۔ فسانۂ آزاد (مصنفہ پنڈت رتن ناتھ سرشار) کا خلاصہ سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوئی۔

۲۔ چاندی کی ڈبیہ
۳۔ ہڑتال
۴۔ نیائے

گالزوردی کے انگریزی ڈراموں کے ترجمے جو ہندستانی اکیڈیمی کی فرمایش سے کئے گئے تھے اور جنھیں اکیڈیمی نے شائع کئے

۵۔ اہنکار — اناطول فرانس کے ایک ڈرامہ کا ہندی ترجمہ

۶۔ سکھ داس
۷۔ ٹالسٹائے کی کہانیاں
۸۔ پتا کے پتر پتری کے نام
۹۔ سرشٹی کا آرمبھ (تخلیق کائنات)

مطبوعہ سرسوتی پریس بنارس۔

گلپ سموچیہ
گلپ رتن

مطبوعہ سرسوتی پریس بنارس

بعض ہندی ناول ہندی پستک ایجنسی، و گنگا پستک مالا لکھنؤ سے، اور بعض سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوئے ہیں۔

تمام شد

ایک اور قدم آگے

ہم بڑی خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہماری کمپنی نے ایک نیا ڈپارٹمنٹ کھول دیا ہے جسکا نام ہے

حادثات موٹر کا ڈیپارٹمنٹ

ہماری کمپنی کے زندگی کے بیمہ کی شاخ کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ واقعی قابل رشک خوشی ہے۔

تین سال کی قلیل مدت میں ہمارا کاروبار نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگیا ہے۔ ہماری ایجنسیوں کا جال ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ہماری کمپنی کے زندگی کا بیمہ فنڈ بہت زبردست و کثیر ہے۔ کمپنی کا خرچ بہت ہی کم ہے۔ ان حوصلہ افزا نتائج کو دیکھتے ہوئے اب ہماری ہمت کا رُخ بھی سرگرمیوں کی طرف ہو رہا ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے سرپرست ہماری خدمات سے فائدہ اُٹھا کر امداد باہمی کے اصول کی توسیع میں ہماری اعانت کریں گے۔

ہماری ہر دلعزیزی کا ثبوت

ہمارے احباب کے لئے یہ خبر باعث دلچسپی ہوگی کہ اب "دی گڈ لک انشورنس کمپنی لیمیٹڈ لاہور" اور "ہندوستان سیکوریٹی کمپنی لیمیٹڈ الہ آباد" ہماری کمپنی میں ملحق ہوجائیں گی۔ یہ ہمارے روزافزوں استحکام اور ہر دلعزیزی کا مزید ثبوت ہے۔

المشتہر

دی فری انڈیا جنرل انشورنس کمپنی لیمیٹڈ سول لائن کانپور

The Free India General Insurance Co. Ltd.,
CAWNPORE.

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی اُردو میں

نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زوربیان، نفیس کاغذ اچھی کتابت خوشنما طباعت، تقریباً گیارہ سو صفحے اور بہت سی تصویریں۔

میری کہانی

ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت مکمل مجلد چار روپے (للعہ) اس ضخیم کتاب کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں شایع کیا گیا ہے۔

نئی کتابیں

پستالوزی از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن) جس طرح یورپ کے عہد جدید میں کوپرنکس نے ہیئت اور کولمبس نے جغرافیہ کا نقشہ بدل دیا اسیطرح پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اسکے فلسفہ تمدن اسکے تعلیمی نظریے اور تعلیمی کارنامے سلیس زبان اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمایئے قیمت مجلد عہ

تاریخ فلسفۂ اسلام مشہور جرمن فلسفی ٹی۔ جے۔ دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اُردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اسلامی فلسفہ کی نشو ونما، یونانی عربی علوم، فلسفہ، فطرت، یونانی و اسلامی حکما مشرق میں فلسفہ کا انحطاط، عرب اور سوفسطی پر کارآمد مباحث (طبع ثانی) قیمت مجلد ع؍

نوٹ:- مکتبۂ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں، آپکو جس خاص مضمون سے دلچسپی ہو مطلع فرمایئے فہرست حاضر کردیجائیگی۔ نیز کتاب نما بطور نمونہ مفت بھیجا جائیگا۔ یہ رسالہ ادب اردو کے شایقین کیلئے بہت ضروری چیز ہے آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں۔ کتاب نما پڑھکر ادب اردو کی رفتار ترقی سے واقف رہیئے قیمت سالانہ صرف ۸؍

مکتبۂ جامعہ دہلی

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نراین نگم بی اے — پرنٹر شرمت ... بیرمال پریس کانپور